زلف و زنجیر

تاراجِ کارواں

کربلا کی دوپہر کے بعد کی رقت انگیز داستان سننے سے پہلے ایک لرزہ خیز اور دردناک منظر نگاہوں کے سامنے لائیے۔

صبح سے دوپہر تک خاندان نبوت کے تمام چشم و چراغ جملہ اعوان وانصار ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ سب نے دم رخصت دل کی زخمی سطح پر ایک نئے داغ کا اضافہ کیا۔ ہر تڑپتی ہوئی لاش کی آخری ہچکیوں پر امام مقام میدان میں پہنچے، گود میں اٹھایا، خیمے تک لائے، زانو پہ سر رکھا اور جاں نثار نے دم توڑ دیا۔

نظر کے سامنے جن لاشوں کا انبار ہے ان میں جگر کے ٹکڑے بھی ہیں اور آنکھ کے تارے بھی۔ بھائی اور بہن کے لاڈلے بھی اور باپ کی نشانیاں بھی۔ ان بے گور و کفن جنازوں پر کون ماتم کرے، کون آنسو بہائے اور کن جلتی ہوئی آنکھوں پر تسکین کا مرہم رکھے۔

تنہا ایک حسین، اور دونوں جہاں کی امیدوں کا ہجوم ایک عجب درد انگیز بے بسی کا عالم ہے۔ قدم قدم پر نئی قیامت کھڑی ہوتی ہے۔ نفس نفس میں الم و اندوہ کے نئے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔

دوسری طرف حرم نبوت کی خواتین ہیں۔ رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں، سوگوار مائیں اور آشفتہ حال بہنیں ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی گود خالی ہو چکی ہیں۔ جن کے سینے سے اولاد کی جدائی کا زخم رس رہا ہے۔ جن کی گود سے شیر خواہ بچہ بھی چھین لیا گیا ہے اور جن کے بھائیوں بھتیجوں اور بھانجوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔

روتے روتے آنکھوں کا چشمہ سوکھ گیا ہے۔ تن نیم جاں میں تڑپنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ عورت ذات کے دل کا آبگینہ یونہی نازک ہوتا ہے ذرا سی ٹھیس جو برداشت نہیں کر سکتا۔ آہ! اس پر آج پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔

سب کے سب جام شہادت نوش کر چکے۔ اب تنہا ایک ابن حیدر کی ذات باقی رہ گئی ہے جو لٹے ہوئے قافلے کی آخری امید گاہ ہیں۔ آہ! اب وہ بھی رخت سفر باندھ رہے ہیں۔

خیمے میں ایک کہرام برپا ہے۔ کبھی بہن کو تسکین دیتے ہیں، کبھی شہر بانو کو تلقین فرما رہے ہیں۔ کبھی لخت جگر عابد بیمار کو گلے سے لگاتے ہیں اور کبھی کمسن بہنوں اور لاڈلی شہزادیوں کو یاس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ امید و بیم کی کشمکش ہے۔ فرض کا تصادم ہے۔ خون کا رشتہ دامن کھینچتا ہے، ایمان مقتل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے بعد اہل خیمہ کا کیا حال ہوگا۔ پردیس میں حرم کے یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ دشمن کیا سلوک کریں گے۔

دوسری طرف شوق شہادت دامن گیر ہے۔ ملت کی تطہیر اور حمایت حق کا فرض نیزوں پر چڑھ کے آواز دے رہا ہے۔

بالآخر اہل بیت کے ناخدا کعبہ کے پاسبان نانا جان کی شریعت کے محافظ حضرت امام بھی اب سر پر کفن باندھ کر رن میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اہل حرم کو تڑپتا بلکتا اور سسکتا چھوڑ کر حضرت امام خیمہ سے باہر نکلے اور لشکر اعدا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اب ذرہ سا ٹھہر جایئے اور آنکھیں بند کر کے منظر کا جائزہ لیجئے۔ ساری داستان میں یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ بلکہ پتھروں کا جگر بھی پانی ہو کر بہنے لگتا ہے۔

تین دن کا ایک بھوکا پیاسا مسافر تن تنہا بائیس ہزار تلواروں کے نرغے میں ہے۔ دشمنوں کی خونریز یلغار چاروں طرف سے بڑھتی چلتی آ رہی ہے۔

دروازے پر اہل بیت کی مستورات اشکبار آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی ہیں۔ منٹ منٹ پر درد و غم کے اتھاہ ساگر میں دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ کبھی منہ سے چیخ نکلتی ہے کبھی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔

ہائے رے تسلیم و رضا کی وادیٔ بے اماں۔ پھولوں کی پنکھڑی پہ قدم رکھنے والی شہزادیاں آج انگاروں پر لوٹ رہی ہیں جن کے اشارہ ابرو سے ڈوبا ہوا سورج پلٹ آتا ہے آج انہیں کے ارمانوں کا سفینہ نظر کے سامنے ڈوب رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی۔

دیکھنے والی آنکھیں اپنے امیر کشور کو، اپنے مرکز امید کو، اپنے پیارے حسین رضی اللہ عنہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں کہ ایک نشانے پر ہزاروں تیر چلے، تلواریں بے نیام ہوئیں، فضا میں نیزوں کی انی چمکی اور دیکھتے ہی دیکھتے فاطمہ رضی اللہ عنہا کا چاند گہن میں آ گیا۔

زخموں سے چور خون میں شرابور، سیدہ کا راج دلارا جیسے ہی فرش پر گرا کائنات کا سینہ دہل گیا۔ کعبے کی دیواریں ہل گئیں، چشم فلک نے خون برسایا۔ خورشید نے شرم سے منہ ڈھانپ لیا اور گیتی کی ساری فضا ماتم و اندوہ سے بھر گئی۔

ادھر ارواح طیبات اور ملائکہ رحمت کے جلوں میں جب شہید اعظم کی مقدس روح عالم بالا میں پہنچی ہر طرف ابن حیدر کی امامت و یکتائی کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ ادھر خیمے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ صبر و شکیب کا خرمن جل رہا تھا۔ یتیموں، بیواؤں اور سوگواروں کی آہ و فغاں سے دھرتی کا کلیجہ پھٹ گیا، امیدوں

کی دنیا لٹ گئی .... آہ! بیچ منجدھار میں کشتی کا ناخدا بھی چل بسا۔

اب بنو ہاشم کے یتیم کہاں جائیں؟ کس کا منہ تکیں؟ کاشانہ نبوت کی وہ شہزادیاں جن کی عفت سرا میں روح الامین بھی بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں۔ نسیم صبا بھی جن کے آنچلوں کے قریب پہنچ کر ادب کے سانچے میں ڈھل جائے۔ آج کربلا کے میدان میں کون ان کا محرم ہے جس سے اپنے دکھ درد کی بات کہیں۔

ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ ہمارے یہاں ایک میت ہو جاتی ہے تو گھر والوں کا کیا حال ہوتا ہے؟ غم گساروں کی بھیڑ اور چارہ گروں کی تلقین صبر کے باوجود آنسو نہیں تھمتے۔ اضطراب کی آگ نہیں بجھتی اور نالہ و فریاد کا شور کم نہیں ہوتا۔ پھر کربلا کے میدان میں حرم کی ان سوگوار عورتوں پر کیا گزری ہوگی جن کے سامنے بیٹوں، شوہروں اور عزیزوں کی لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ جو غم گساروں اور شریک حال ہمدردوں کے جھرمٹ میں نہیں خونخوار دشمنوں اور سفاک درندوں کے نرغے میں تھیں۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا سر قلم کرنے کے بعد کوفیوں نے بدن کے پیراہن اتار لئے۔ جسم اطہر پر نیزے کے 32 زخم اور تلوار کے 34 گھاؤ تھے۔ ابن سعد کے حکم پر یزیدی فوج کے دس نابکاروں نے سیدہ کے لخت جگر کی نعش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہ اور شہربانو خیمے سے یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر بلبلا اٹھیں اور چیخ مار کر زمین پر گر پڑیں۔ اس کے بعد شمر اور ابن سعد دندناتے ہوئے خیمے کی طرف بڑھتے۔ بدبخت شمر نے اندر گھس کر پردگیاں حرم کی چادریں چھین لیں، سامان لوٹ لیا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہ بنت علی رضی اللہ عنہ نے غیرت و اضطراب کی آگ میں سلگتے ہوئے کہا:

"شمر! تیری آنکھیں پھوٹ جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو بے پردہ کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے چہروں کے محافظ شہید ہو گئے۔ اب دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ یہ مانا کہ ہماری بے بسی نے تجھے دلیر بنا دیا ہے۔ لیکن کیا کلمہ پڑھانے کا احسان بھی بھول گیا؟ سنگدل ظالم! ناموس محمد کی بے حرمتی کر کے قہر خداوندی کو حرکت میں نہ لا۔ تجھے اتنا لحاظ بھی نہیں ہے کہ ہم اسی رسول کی نواسیاں ہیں جس نے حاتم طائی کی لڑکی کو اپنی چادر اڑھائی تھی۔"

حضرت زینب رضی اللہ عنہ کی گرجتی ہوئی آواز سن کر عابد لڑکھڑاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور شمر پر تلوار اٹھانا چاہتے تھے کہ ضعف و نقاہت سے زمین پر گر پڑے۔

شمر نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ امام حسین علیہ السلام کی آخری نشانی ہے، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بھی قتل کر ڈالو کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام و نشان دنیا سے بالکل مٹ جائے لیکن ابن سعد نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا اور یہ معاملہ یزید کے حکم پر منحصر رکھا۔

شام ہو چکی تھی، یزیدی فوج کے سردار جشن فتح میں مشغول ہو گئے۔ ایک پہر رات گئے تک سرور و نشاط کی مجلس گرم رہی۔

ادھر خیمے والوں کی یہ شام غریباں قیامت سے کم نہیں تھی۔ حرم کے پاسبانوں کے گھر میں چراغ بھی نہیں جل سکا تھا۔ ساری فضا سوگ میں ڈوب گئی تھی۔ مقتل میں امام کا کچلا ہوا لاشہ بے گور و کفن پڑا تھا۔ خیمے کے قریب گلشن زہرا کے پامال پھولوں پر دردناک حسرت برس رہی تھی۔ رات کی بھیانک اور وحشت خیز تاریکی میں اہل خیمہ چونک پڑتے تھے۔

زندگی کی یہ پہلی سوگوار اور اداس رات حضرت زینب اور شہربانو سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ رات بھر خیمے سے سسکیوں کی آواز آتی رہی۔ آہوں کا دھواں اٹھتا رہا اور روحوں کے قافلے اترتے رہے۔ آج پہلی رات تھی کہ خدا کا گھر بسانے کے لئے اہل حرم نے سب کچھ لٹا دیا تھا۔

پردیس، چٹیل میدان، مقتل کی زمین، خاک و خون میں لپٹے ہوئے چہرے 'میت کا گھر' بالیں کے قریب ہی بیمار کے کراہنے کی آواز، بھوک و پیاس کی ناتوانی، خونخوار درندوں کا نرغہ، مستقبل کا اندیشہ، ہجر و فراق کی آگ، آہ! کلیجہ شق کر دینے والے سارے اسباب مقتل کی پہلی رات میں جمع ہو گئے تھے۔

بڑی مشکل سے صبح ہوئی، اجالا پھیلا اور دن چڑھنے پر ابن سعد اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ اونٹنی لے کر آیا۔ اس کی ننگی پیٹھ پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت شہربانو رضی اللہ عنہا اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سوار کرائے گئے۔ پھول کی طرح نرم و نازک ہاتھوں کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ عابد بیمار اپنی والدہ اور پھوپھی کے ساتھ اس طرح باندھ دیئے گئے کہ جنبش بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے اونٹوں پر باقی خواتین اور بچیاں اسی طرح رسیوں سے بندھی ہوئی سوار کرائی گئیں۔ اہل بیت کا یہ لٹا پٹا قافلہ جس وقت کربلا کے میدان سے رخصت ہوا، اس وقت کا قیامت خیز منظر ضبط تحریر سے باہر ہے۔

واقعہ کربلا کے ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ خولی جگر گوشہ بتول کا سر مبارک نیزے پر لٹکائے ہوئے اسیران حرم کے اونٹ کے آگے آگے تھا۔ پیچھے 72 شہداء کے کٹے ہوئے سر دوسرے اشقیاء لئے ہوئے تھے۔

خاندان رسالت کا یہ تاراج قافلہ جب مقتل کے قریب سے گزرنے لگا تو حضرت امام کی بے گور و کفن نعش اور دیگر شہدائے حرم کے جنازوں پر نظر پڑتے

ہی خواتین اہل بیت بیتاب ہوگئیں۔ دل کی چوٹ ضبط نہ ہوسکی۔ آہ فریاد کی صدا سے کربلا کی زمین ہل گئی۔ عابد بیمار شدت اضطراب میں غش پہ غش کھا رہے تھے اور حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہ انہیں کسی طرح سنبھالا دے رہی تھیں۔ قیامت کا یہ دلگداز منظر دیکھ کر پتھروں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

فاطمہ رضی اللہ عنہ کی لاڈلی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حال سب سے زیادہ رقت انگیز تھا۔ صدمہ جانکاہ کی بے خودی میں انہوں نے مدینے کی طرف رخ کر لیا اور دل ہلا دینے والی آواز میں اپنے نانا جان کو مخاطب کیا:

"یا محمداہ! آپ پر آسمان کے فرشتوں کا سلام ہے۔ دیکھئے آپ کا لاڈلا حسین ریگستان میں پڑا ہے۔ خاک و خون میں آلودہ ہے۔ تمام بدن ٹکڑے ہے۔ نعش کو گور و کفن بھی میسر نہیں ہے۔ نانا جان! آپ کی تمام اولاد قتل کر دی گئی، ہوا ان پر خاک اڑا رہی ہے۔ آپ کی بیٹیاں قید ہیں، ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، مشکیں کسی ہوئی ہیں، پردیس میں کوئی ان کا یار و شناسا نہیں۔ نانا جان! اپنے یتیموں کی فریاد کو پہنچئے۔"

ابن جریر کا بیان ہے کہ دوست دشمن کوئی ایسا نہ تھا جو حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس بیان پر آبدیدہ نہ ہو گیا ہو۔

اسیران حرم کا قافلہ اشکبار آنکھوں اور جگر گداز سسکیوں کے ساتھ کربلا سے رخصت ہو کر کوفے کی طرف روانہ ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں یزیدی فوج کے سرداروں نے پڑاؤ کیا۔ اسیران اہل بیت اپنی سواریوں سے نیچے اتار لئے گئے۔

چاندنی رات تھی، رسیوں میں جکڑے ہوئے حرم کے یہ قیدی رات بھر سسکتے رہے۔ پیشانی میں مچلتے ہوئے سجدوں کے لئے بھی ظالموں نے رسیوں کی بندھن ڈھیلی نہیں کی۔ پچھلے پہر حضرت زینب رضی اللہ عنہا مناجات میں مشغول تھیں کہ ابن سعد قریب آیا اور اس نے طنز کرتے ہوئے دریافت کیا قیدیوں کا کیا حال ہے؟ کئی بار پوچھنے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہ نے منہ ڈھانپ کر جواب دیا خدا کا شکر ہے۔ نبی کا چمن تاراج ہو گیا، ان کی اولاد قید کر لی گئی، رسیوں سے تمام جسم نیلے پڑ گئے ہیں، ایک بیمار جو نیم جاں ہو چکا ہے اس پر بھی تجھ کو ترس نہیں آتا۔ اور انہیں تو ہماری بے کسی کا تماشا دکھانے اب تو ہمیں ابن زیاد اور یزید کی قربان گاہ میں لے جا رہا ہے۔

اتنا کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حضرت زین العابدین نے پھوپھی کو تسلی دیتے ہوئے کہا خون کے قاتلوں سے جور و ستم کا شکوہ ہی کیا ہے پھوپھی جان!

"بس ایک آرزو ہے کہ بابا جان کا سر میری گود میں کوئی لا کر ڈال دے اور میں اسے اپنے سینے سے لگا لوں۔"

ابن سعد نے کہا .... گود میں نہیں تیرے قدموں کی ٹھوکر پہ ڈال سکتا ہوں اگر راضی ہو تو اقرار کر۔

ظالم نے زخموں پر نمک چھڑکا، پھر حرم کے قیدی تلملا اٹھے۔ اضطراب میں بجھی ہوئی ایک آواز کان میں آئی۔

"بدبخت! نوجوانان جنت کے سردار سے گستاخی کرتا ہے۔ کیا تجھے خبر نہیں ہے کہ یہ کٹا ہوا سر اب بھی دو جہاں کا مالک ہے۔ ذرا غور سے دیکھ! بوسہ گاہ رسول پر انوار و تجلیات کی کیسی بارش ہو رہی ہے؟ صرف جسم سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے، عرش کا رابطہ اب بھی قائم ہے۔"

اس آواز پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اسی عالم اندوہ میں اسیران اہل بیت کا یہ تاراج قافلہ کوفہ پہنچا۔ مارے شرم و ہیبت کے ابن سعد نے شہر کے باہر جنگل میں قیام کیا۔

رات کے سناٹے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا مناجات و دعا میں مشغول تھیں۔ ایک ہلکی آواز کان میں آئی۔

"بی بی میں حاضر ہو سکتی ہوں؟"

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑھیا سر پر چادر ڈالے منہ چھپائے سامنے کھڑی ہے۔ اجازت ملتے ہی قدموں پر گر پڑی اور دست بستہ عرض کیا۔

میں ایک غریب محتاج عورت ہوں۔ بھوکے پیاسے آل رسول کے لئے تھوڑا کھانا اور پانی لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ بی بی میں غیر نہیں ہوں، ایک مدت تک شہزادی رسول سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کنیزی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ سیدہ کی گود میں ایک ننھی منی بچی تھی جس کا نام زینب تھا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے الٹتے ہوئے جذبات پر قابو پا کر جواب دیا۔ تو نے اس جنگل اور پردیس میں ہم مظلوموں کی مہمان نوازی کی۔ ہماری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا تجھے دارین میں خوشی عطا فرمائے۔

بڑھیا کو جب معلوم ہوا کہ یہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں تو چیخ مار کر گلے سے لپٹ گئی اور اپنی جان بنت رسول کے قدموں پر نثار کر دی۔

عشق و اخلاص کی تاریخ میں ایک نئے شہید کا اور اضافہ ہوا۔

دوسرے دن ظہر کے وقت اہل بیت کا لٹا ہوا کارواں کوفے کی آبادی میں داخل ہوا، بازاروں میں دونوں طرف سنگدل تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ خاندان نبوت کی بیبیاں شرم و غیرت سے گڑی جا رہی تھیں۔ سجدے میں سر جھکا لیا تھا کہ معصوم چہروں پر غیر محرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ وفور غم سے آنکھیں اشکبار تھیں۔ دل رو رہے تھے۔ اس احساس سے زخموں کی ٹیس اور بڑھ گئی تھی کہ کربلا کے میدان میں قیامت ٹوٹی تھی ٹوٹ گئی اب محمد عربی ﷺ کے ناموس کو گلی گلی پھرایا جا رہا ہے۔

کلمہ پڑھنے والی میت کی غیرت دفن ہوگئی تھی۔ خوشی کے جشن میں سارا کوفہ ننگا ناچ رہا تھا۔ ابن زیاد کے بے غیرت سپاہی فتح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے۔

جب اہل بیت کی سواری قلعہ کے قریب پہنچی تو ابن زیاد کی بیٹی فاطمہ اپنے منہ پر نقاب ڈالے ہوئے باہر نکلی، اور خاموش دور کھڑی حسرت کی نظر سے یہ منظر دیکھ رہی ہے۔

ابن زیاد اور شمر کے حکم سے سیدانیاں اتاری گئیں۔ عابد بیمار اپنی والدہ اور پھوپھی کے ساتھ باندھے ہوئے تھے۔ ادھر بخار کی شدت سے ضعف و ناتوانی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اونٹ سے اترتے وقت غش آ گیا اور بے حال ہو کر زمین پر گر پڑے، سر زخمی ہو گیا۔ خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا بیتاب ہو گئیں۔ دل بھر آیا۔ ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ کہنے لگیں۔

"آل فاطمہ میں ایک ہی عابد بیمار کا خون محفوظ رہ گیا تھا چلو اچھا ہوا کوفے کی زمین پر یہ قرض بھی ادا ہو گیا۔"

ابن زیاد کا دربار نہایت تزک و احتشام سے آراستہ کیا گیا تھا۔ فتح کے نشے میں سرشار، تخت پر بیٹھا ہوا ابن زیاد اپنی فوج کے سرداروں کی زبانی کربلا واقعات سن رہا تھا۔

سامنے ایک طشت میں امام عالی مقام کا سر مبارک رکھا ہوا تھا۔ ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ وہ بار بار حضرت امام کے لبہائے مبارک کے ساتھ گستاخی کرتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اسی منہ سے خلافت کا دعویدار تھا۔ دیکھ لیا قدرت کا فیصلہ! سر بلند ہوا، باطل کو ذلت نصیب ہوئی۔

صحابیء رسول حضرت زیب ابن ارقم رضی اللہ عنہ اس وقت دربار میں موجود تھے ان سے یہ گستاخی دیکھی نہ گئی۔ جوش عقیدت میں چیخ پڑے۔

"ظالم! یہ کیا کرتا ہے؟ چھڑی ہٹا لے! نسبت رسول کا احترام کر! میں بارہا سرکار ﷺ کو اس چہرے کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔"

ابن زیاد نے غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا "تو اگر صحابیء رسول نہ ہوتا تو میں تیرا سر قلم کروا دیتا۔"

حضرت ابن رقم نے حالت غیظ میں جواب دیا اتنا ہی تجھے رسول اللہ ﷺ کی نسبت کا خیال ہوتا تو ان کے جگر گوشوں کو تو کبھی قتل نہ کراتا۔ تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آئی کہ جس رسول کا تو کلمہ پڑھتا ہے انہی کی اولاد کو تہ تیغ کرایا ہے اور اب ان کی عفت مآب بیٹیوں کو قیدی بنا کر گلی گلی پھرا رہا ہے۔

ابن زیاد یہ زلزلہ خیز جواب سن کر تلملا گیا۔ لیکن مصلحتاً خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔

اسیران حرم کے ساتھ ایک بوسیدہ چادر میں لپٹی ہوئی حضرت زینب رضی اللہ عنہ ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ان کنیزوں نے انہیں اپنے جھرمٹ میں لے لیا تھا۔ ابن زیاد کی نظر پڑی تو دریافت کیا یہ کون عورت ہے؟ کئی بار پوچھنے پر ایک کنیز نے جواب دیا۔

"زینب بنت علی"

ابن زیاد نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔

اس اذیت ناک جملے پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے تئیں سنبھال نہ سکیں، بے اختیار رو پڑیں۔ "واللہ تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا، میرے خاندان کا نشان مٹایا، میری شاخیں کاٹ دیں۔ میری جڑ اکھاڑ دی۔ اگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

اس کے بعد ابن زیاد کی نظر عابد بیمار پر پڑی وہ انہیں بھی قتل کرنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بے قرار ہو کر چیخ اٹھیں "میں تجھ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ اگر تو اس بچے کو قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر ڈال۔"

ابن زیاد پر دیر تک سکتے کا عالم طاری رہا۔ اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا خون کا رشتہ بھی کیسی عجیب چیز ہے واللہ مجھے یقین ہے کہ یہ سچے دل سے لڑکے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے۔ اچھا اسے چھوڑ دو یہ بھی خاندان کی عورتوں کے ساتھ جائے۔ (ابن جریر و کامل)

اس واقعہ کے بعد ابن زیاد نے جامع مسجد میں شہر والوں کو جمع کیا اور خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

اس خدا کی حمد و ستائش جس نے امیر المومنین یزید بن معاویہ کو غالب کیا اور کذاب ابن کذاب حسین بن علی کو ہلاک کر ڈالا۔

اس اجتماع میں مشہور محب اہل بیت حضرت ابن عفیف بھی موجود تھے ان سے خطبے کے یہ الفاظ سن کر رہا نہ گیا۔ فرط غضب میں کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ابن زیاد کو للکارتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم تو ہی کذاب ابن کذاب ہے۔ حسین سچا، اس کا باپ سچا، اس کے نانا سچے!"

ابن زیاد اس جواب سے تلملا اٹھا اور جلاد کو حکم دیا کہ شاہراہ عام پر لے جا کر اس بڈھے کا سر قلم کر دو۔

ابن عفیف شوق شہادت میں مچلتے ہوئے اٹھے اور مقتل میں پہنچ کر چمکتی ہوئی تلوار کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ خون بہا، لاش تڑپی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ کوثر کے ساحل پر جاں نثاروں کی تعداد میں ایک عدد کا اور اضافہ ہوا۔

دوسرے دن ابن زیاد نے اہل بیت کا تاراج کارواں ابن سعد کی سرکردگی میں دمشق کی طرف روانہ کیا۔ حضرت امام کا سر مبارک نیزے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ پیچھے اہل بیت کے اونٹ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امام عالی مقام اب بھی اپنے حرم کے قافلے کی نگرانی فرما رہے ہیں۔

اثنائے سفر میں سر مبارک سے عجیب عجیب خوارق و کرامات کا ظہور ہوا۔ رات کے سناٹے میں ماتم و فغاں کی رقت انگیز صدائیں فضا میں گونجتی تھیں۔ کبھی کبھی سر مبارک کے اردگرد نور کی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔

جس آبادی سے یہ قافلہ گزرتا تھا ایک کہرام برپا ہو جاتا تھا۔ دمشق کا شہر نظر آتے ہی یزیدی فوج کے سردار خوشی سے ناچنے لگے۔ فتح کی خوشخبری سنانے کے لئے ہر قاتل اپنی جگہ بے قرار تھا۔

سب سے پہلے زحر بن قیس نے یزید کو فتح کی خبر سنائی۔

حسین ابن علی رضی اللہ عنہ اپنے اٹھارہ اہل بیت اور ساٹھ اعوان و انصار کے ساتھ ہم تک پہنچے۔ ہم نے چند گھنٹے میں ان کا قلع قمع کر دیا۔ اس وقت کربلا کے ریگستان میں ان کے لاشے برہنہ پڑے ہوئے ہیں، ان کے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ ان کے رخسار گرد و غبار سے میلے ہو رہے ہیں۔ ان کے جسم دھوپ کی تمازت اور ہوا کی شدت سے خشک ہو گئے ہیں۔

پہلے تو فتح کی خوشخبری سن کر یزید جھوم اٹھا لیکن اس زلزلہ خیز اور ہلاکت آفریں اقدام کا ہولناک انجام جب نظر کے سامنے آیا تو کانپ گیا۔ بار بار چھاتی پیٹتا تھا کہ ہائے اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے مجھے ننگ اسلام بنا دیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں میرے لئے نفرت و دشمنی کی آگ ہمیشہ سلگتی رہے گی۔ قاتل کی پشیمانی مقتول کی اہمیت تو بڑھا سکتی ہے پر قتل کا الزام نہیں اٹھا سکتی۔ اس مقام پر بہت سے لوگوں نے دھوکا دیا ہے۔ انہیں نفسیاتی طور پر صورت حال کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس کے بعد یزید نے شام کے سرداروں کو اپنی مجلس میں بلایا۔ اہل بیت کو بھی جمع کیا اور امام زین العابدین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اے علی! تمہارے ہی باپ نے میرا رستہ کاٹا۔ میری حکومت چھیننا چاہی اس پر خدا نے جو کچھ کیا وہ تم دیکھ رہے ہو۔ اس جواب میں امام زین العابدین نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مفہوم یہ کہ تمہاری کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو پہلے سے نہ لکھی ہو۔

دیر تک خاموشی رہی، پھر یزید نے شامی سرداروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

اہل بیت کے ان اسیروں کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟

بعضوں نے نہایت سخت کلامی کے ساتھ بدسلوکی کا مشورہ دیا مگر نعمان ابن بشیر نے کہا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو رسول اللہ ﷺ انہیں اس حال میں دیکھ کر کرتے۔

یزید نے حکم دیا کہ اسیروں کی رسیاں کھول دی جائیں اور سیدانیوں کو شاہی محل میں پہنچا دیا جائے۔

یہ سن کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا رو پڑیں اور انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا:

"تو اپنی حکومت میں رسول زادیوں کو گلی گلی پھرا چکا اب ہماری بے بسی کا تماشہ اپنی عورتوں کو نہ دکھا۔ ہم خاک نشینیوں کو کوئی ٹوٹی پھوٹی جگہ دے دے جہاں سر چھپا لیں۔"

بالآخر یزید نے ان کے قیام کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام کیا۔

امام کا سر مبارک یزید کے سامنے رکھا ہوا تھا اور بدبخت اپنے ہاتھ کی چھڑی کے ساتھ پیشانی مبارک کی گستاخی کر رہا تھا۔ صحابی رسول حضرت اسلمی نے ڈانٹتے ہوئے کہا: ظالم! یہ بوسہ گاہ رسول ہے اس کا احترام کر۔"

یزید یہ سن کر تلملا گیا۔ صحابی رسول کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی خواہش پر سر مبارک انکے حوالے کر دیا گیا۔ وہ سامنے رکھ کر روتی رہتی تھیں۔ کبھی حضرت شہربانو اور ام رباب سینے سے لگائے بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں کھو جاتیں، ایک رات کا ذکر ہے نصف شب گزر چکی تھی۔ سارے دمشق پر نیند کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اہل بیت کے مصائب پر ستاروں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اچانک سادات کی قیام گاہ سے کسی عورت کا نالہ بلند ہوا۔ محل کی دیواریں ہل گئیں۔ دل کی آگ سے فضا میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔ یزید دہشت سے کانپنے لگا۔ جا کر دیکھا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھائی کا سر گود میں لئے ہوئے بلبلا رہی ہیں۔ درد و کرب کی ایک قیامت جاگ اٹھی ہے۔ اس درد انگیز نالے سے اس کے دل میں جو دہشت سمائی تو عمر کی آخری سانس تک نہیں نکلی۔

اسے اندیشہ ہو گیا کہ کلیجہ توڑ دینے والی یہ فریاد دمشق کے در و دیوار سے ٹکرا گئی تو شاہی محل کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی کیوں کہ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت امام زین العابدین نے اہل بیت کے فضائل و مناقب اور یزید کے مظالم پر مشتمل جو تاریخی خطبہ دیا تھا اس نے لوگوں کے دل دہلا دیئے تھے اور ماحول میں اس کی اثر انگیزی اب تک باقی تھی۔

اگر تقریر کا سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا اور یزید نے گھبرا کر اذان نہ دلوا دی ہوتی تو اسی دن یزید کے شاہی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور اس کے

خلاف عام بغاوت پھیل جاتی۔

اس لئے دوسرے ہی دن نعمان ابن بشیر کی سرگردگی میں مع تیس سواروں کے اہل بیت کا یہ تاراج کارواں اس نے مدینے کی طرف روانہ کر دیا۔ ہزار کوشش کی کہ کربلا کی یہ دہکتی ہوئی چنگاری کسی طرح ٹھنڈی ہو جائے لیکن جو آگ بحر و بر میں لگ چکی تھی اس کا سرد ہونا ممکن نہیں تھا۔ صبح کی نماز کے بعد اہل بیت کا دلگداز قافلہ مدینے کے لئے روانہ ہو گیا۔

حضرت نعمان ابن بشیر بہت رقیق القلب، پاکباز اور محبّ اہل بیت تھے۔ دمشق کی آبادی سے جونہی قافلہ باہر نکلا حضرت نعمان امام زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا۔ یہ نیاز مند حکم کا غلام ہے جہاں جی چاہے تشریف لے جائیے۔ میری تکلیف کا خیال نہ کیجئے۔ جہاں حکم دیجئے گا پڑاؤ کروں گا، جب فرمائیے گا کوچ کر دوں گا۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت زین العابدین وہیں سے کربلا واپس ہوئے اور شہدائے اہل بیت کو دفن کیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کربلا کے آس پاس کی آبادیوں کو جب خبر ہوئی تو وہ ماتم کناں آئے اور شہیدوں کی تجہیز و تکفین کا فرض انجام دیا۔ آخر الذکر روایت زیادہ قابل اعتماد ہے۔

حضرت امام عرش مقام کا سر مبارک اب نیزے پر نہیں تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا شہر بانو اور عابد بیمار کی گود میں تھا۔ پہاڑوں، صحراؤں اور ریگستان کو عبور کرتا ہوا قافلہ مدینے کی طرف بڑھتا رہا۔ منزلیں بدلتی رہیں اور سینے کے جذبات مچلتے رہے۔ یہاں تک کہ کئی دنوں کے بعد اب حجاز کی سرحد شروع ہو گئی۔ اچانک سویا ہوا درد جاگ اٹھا۔ رحمت و نور کی شہزادیاں اپنے چمن کا موسم بہار یاد کر کے مچل گئیں۔ کربلا جاتے ہوئے انہی راہوں سے کبھی گزرے تھے۔ کشور امامت کی یہ رانیاں اس وقت اپنے تاجداروں اور ناز برداروں کے ظل عاطفت میں تھیں۔ زندگی شام و سحر کی مسکراہٹوں سے معمور تھی۔ کلیوں سے لے کے غنچوں تک سارا چمن ہرا بھرا تھا۔ ذرا چہرہ اداس ہوا، چارہ گروں کا ہجوم لگ گیا۔ پلکوں پہ ننھا سا قطرہ چمکا اور پیار کے ساگر میں طوفان امنڈنے لگا۔ سوتے میں ذرا سا چونک گئے اور آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ اب اسی راہ سے لوٹ رہے ہیں تو قدموں کے نیچے کانٹوں کی برچھیاں کھڑی ہیں۔ تڑپ تڑپ کر قیامت بھی سر پہ اٹھالیں تو کوئی تسکین دینے والا نہیں۔ خیمہ اجڑا پڑا ہے۔ قافلہ ویران ہو چکا ہے۔ شہزادوں اور رانیوں کی جگہ اب آشفتہ حال یتیموں اور بیواؤں کی ایک جماعت ہے جس کے سر پہ اب صرف آسمان کا سایہ رہ گیا ہے۔ لبوں کی جنبش اور ابرو کے اشاروں سے اسیروں کی زنجیر توڑنے والے آج خود اسیر کرب و بلا ہیں۔

مدینے کی مسافت گھٹتے گھٹتے اب چند منزل رہ گئی ہے۔ ابھی سے پہاڑوں کا جگر کانپ رہا ہے۔ زمین کی چھاتی دہل رہی ہے۔ قیامت کو پسینہ آ رہا ہے کہ کربلا کے فریادی مالک کونین کے پاس جا رہے ہیں۔ قافلے میں حسین نہیں ہے، اس کا کٹا ہوا سر چل رہا ہے۔ استغاثے کے ثبوت کے لئے کہیں سے گواہ لانا نہیں ہے۔ بغیر دھڑ کا حسین جب اپنے نانا کی تربت پر حاضر کیا جائے گا تو خاکدان گیتی کا انجام دیکھنے کے لئے کس کے ہوش سلامت رہ جائیں گے۔

پردیس میں کربلا کے مسافروں کی آج آخری رات تھی۔ نہایت بے قراری میں کٹی۔ انگاروں پر کروٹ بدلتے رہے۔ صبح سویرے ہی کوچ کے لئے تیار ہو گئے۔

نعمان ابن بشیر آگے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے اہل بیت کی سواریاں تھیں۔ سب سے آخر میں تیس محافظ سپاہیوں کا مسلح دستہ تھا۔

دوپہر کے بعد مدینے کی سرحد شروع ہو گئی۔ اب فریادیوں کا حال بدلنے لگا۔ سینے کی آگ تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے مدینہ قریب آتا جا رہا تھا جذبات کے سمندر میں طوفان کا تلاطم بڑھتا جاتا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اب پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کھجوروں کی قطار اور سبزہ زاروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جونہی مدینے کی آبادی چمکی صبر و شکیب کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ کلیجہ توڑ کر آہوں کا دھواں نکلا اور ساری فضا پہ چھا گیا۔ ارمانوں کا گہوارہ دیکھ کر دل کی چوٹ ابھر آئی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا اور حضرت عابد رضی اللہ عنہ بیمار ابلتے ہوئے جذبات کی تاب نہ لا سکے۔ اہل حرم کے دردناک نالوں سے زمین کانپنے لگی، پتھروں کا کلیجہ پھٹ گیا۔

ایک سانڈنی سوار نے بجلی کی طرح سارے مدینے میں خبر اڑا دی کہ کربلا سے نبی زادوں کا لٹا ہوا قافلہ آ رہا ہے۔ شہزادۂ رسول کا کٹا ہوا سر بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ہر طرف کہرام مچ گیا۔ قیامت سے پہلے قیامت آ گئی۔ وفور غم اور جذبہ بے خودی میں اہل مدینہ باہر نکل آئے۔ جیسے ہی آمنا سامنا ہوا اور نگاہیں چار ہوئیں دونوں طرف شورش غم کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ آہ و فغاں کے شور سے مدینے کا آسمان دہل گیا۔ حضرت امام کا کٹا ہوا سر دیکھ کر لوگ بے قابو ہو گئے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ حضرت زینب فریاد کرتی ہوئی مدینہ میں داخل ہوئیں۔

نانا جان! اٹھئے! آپ کا سارا کنبہ لٹ گیا، آپ کے لاڈلے شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کی امت نے ہمارا سہاگن چھین لیا۔ بے آب و دانہ آپ کے بچوں کو تڑپا تڑپا کے مارا۔ آپ کا لاڈلا حسین آپ کے نام کی دہائی دیتا ہوا دنیا سے چل بسا۔ کربلا کے میدان میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ہماری نگاہوں کے سامنے ذبح کئے گئے۔ آپ کے پیار کا سینچا ہوا چمن تاراج ہو گیا نانا جان!

نانا جان یہ حسین کا کٹا ہوا سر لیجئے۔ آپ کے انتظار میں اس کی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی ہیں۔ ذرا مرقد سے نکل کر اپنی آشفتہ نصیب بیٹیوں کا دردناک

حال دیکھئے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی اس کی پکار سے سننے والوں کے کلیجے پھٹ گئے۔ام المومنین حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی رقت انگیز کیفیت تاب سے باہر تھی۔

حضرت عقیل کے گھر کے بچے یہ مرثیہ پڑے رہے تھے "قیامت کے دن وہ امت کیا جواب دے گی۔جب اس کا رسول پوچھے گا کہ تم نے ہمارے بعد ہماری اولاد کے ساتھ یہی سلوک کیا کہ ان میں بعض خاک وخون میں لپٹے ہوئے ہیں۔تلواروں، تیروں اور نیزوں سے ان کے جسم گھائل ہیں۔ان کی لاشیں بے آب وگیاہ وادی میں پڑی ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض قیدی ہیں، رسیوں کے بندھن سے ہاتھ نیلے پڑ گئے ہیں۔"

حضرت صغریٰ پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔بار بار اپنی والدہ اور پھوپھی سے لپٹ لپٹ کر پوچھتی تھیں، ہمارے بابا جان کہاں ہیں؟ ہمارے ننھے علی اصغر کو کہاں چھوڑ آئے۔بابا جان وعدہ کر کے ہو گئے تھے کہ جلد ہی واپس لوٹیں گے جس طرح ہو انہیں منا کے لائیے۔

اپنے امام کا کٹا ہوا سر لئے اہل بیت کا یہ تاراج کارواں جس دم روضہ رسول پر حاضر ہوا، ہوائیں رک گئیں، گردش وقت ٹھہر گئی۔ بہتے ہوئے دھارے تھم گئے۔آسمانوں میں ہل چل مچ گئی۔پوری کائنات دم بخود تھی کہ کہیں آج قیامت نہ آجائے۔

اس وقت کا دل گداز اور روح فرسا منظر تحریر سے باہر ہے۔قلم کو یارا نہیں کہ دردوالم کی وہ تصویر کھینچ سکے جس کی یاد اہل مدینہ کو صدیوں تک تڑپاتی رہی۔ اہل حرم کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ حجرۂ عائشہ میں کیا ہوا۔کربلا کے فریادی اپنے نانا جان کی تربت سے کس طرح واپس لوٹے۔پروردۂ ناز کا سر مرقد انور کے باہر تھا۔رحمت کی جلوہ گاہ خاص میں جب جنت کے پھول ہی ٹھہرے تو نرگس کی چشم محرم سے اہل چمن کا کیا پردہ تھا۔ برزخ کی دیوار تو غیروں پہ حائل ہوتی ہے۔اپنی ہی گود کے پردوں سے کیا حجاب! حضرت زینب، حضرت شہر بانو، حضرت ام رباب، عابد بیمار اور ام کلثوم وسکینہ یہ سب کے سب محرم اسرار ہی تھے۔

اندرون خانہ کیا واقعہ پیش آیا کون جانے؟ اشکبار آنکھوں پہ رحمت کی آستین کس طرح رکھی گئی۔کربلا کے پس منظر میں مشیت الٰہی کا سربستہ راز کن لفظوں میں سمجھایا گیا؟ پس دیوار کھڑے رہنے والوں کو علم غیب کی ان سرگذشتوں کا حال کیا معلوم؟

مرقد رسول سے سیدہ کی خواب گاہ بھی دو ہی قدم کے فاصلے پر تھی۔کون جانتا ہے لاڈلے کو سینے سے لگانے اور اپنے یتیموں کے آنسو آنچل میں جذب کرنے کے لئے مامتا کے اضطراب میں وہ بھی کسی مخفی گزرگاہ سے اپنے بابا جان کی حریم پاک تک آگئی ہوں۔

تاریخ صرف اتنا بتاتی ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بلک بلک کر کربلا کی داستان زلزلہ خیز سنائی۔شہر بانو نے کہا خاندان رسالت کی بیوہ اپنا سہاگ لٹا کر در دولت پر حاضر ہے۔عابد بیمار نے عرض کیا:

"یتیمی کا داغ لئے حسین کی آخری نشانی ایک بیمار نیم جاں شفقت وکرم اور صبر وضبط کی بھیک مانگتا ہے۔"

آہ! رفقاں کا ابلتا ہوا ساگر تھم جانے کے بعد شہزادہ کونین حضرت امام عالی مقام کا سر مبارک کا در مشفقہ حضرت سیدہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ دریا کا بچھڑا ہوا قطرہ پھر دریا میں جا ملا۔پھر اٹھتی ہوئی موجوں نے اسے آغوش میں لے لیا۔

دو شہزادے

افسردہ چہرہ، بکھرے ہوئے بال اور بوسیدہ پیراہن میں نور کی دو مورتیں ایک مسلمان رئیس کے دروازے پر کھڑی تھیں۔
گردشِ ایام کے ہاتھوں ستائے ہوئے یہ دو کمسن بچے تھے۔ غیرت حیا، سے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اظہار مدعا کے لئے زبان نہیں کھل رہی تھی۔
بڑی مشکل سے بڑے بھائی نے یہ الفاظ ادا کئے۔

''کربلا کے مقتل سے خاندانِ رسالت کا جو لٹا ہوا قافلہ مدینے کو واپس ہوا تھا ہم دونوں بھی اسی قافلے کی نسل سے ہیں۔ وقت کی بات ہے بچپن ہی میں ہم دونوں یتیم ہو گئے۔ قسمت نے دردر کی ٹھوکر کھلائی۔ کئی دن ہوئے کہ ایک قافلے کے ساتھ بھٹک کر ہم اس شہر میں آ گئے۔ نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ ہے، نہ رات بسر کرنے کا ٹھکانہ۔ تین دن کے فاقوں نے جگر کا خون تک جلا ڈالا ہے۔ خاندانی غیرت کسی کے آگے زبان نہیں کھولنے دیتی اب تکلیف ضبط سے باہر ہو گئی ہے۔

جس ہاشمی رسول کا خون ہماری رگوں میں موجزن ہے ان کے تعلق سے ہمارے حال زار پر تمہیں رحم آ جائے تو ہمیں کچھ سہارا دے دو۔
آج تمہارے لئے سوائے پرخلوص دعاؤں کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے لیکن قیامت کے دن ہم نانا جان سے تمہاری غمگسار ہمدردیوں کا پورا پورا صلہ دلوائیں گے۔

رئیس نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بس تمہارا مدعا میں نے سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم سید زادے ہو۔ لاؤ کوئی سند پیش کرو۔ آلِ رسول کا لبادہ اوڑھ کر بھیک مانگنے کا یہ ڈھونگ بہت فرسودہ ہو چکا ہے۔ تم کوئی دوسرا گھر دیکھو! یہاں تمہیں کوئی سہارا نہیں مل سکتا۔''
رئیس کے جواب سے یتیموں کا چہرہ اتر گیا، آنکھیں پرنم ہو گئیں، یونہی غریب الوطنی یتیمی، بے کسی اور کئی دن کی فاقہ کشی نے انہیں نڈھال کر دیا تھا اب لفظوں کی چوٹ سے دل کا نرم و نازک آبگینہ بھی ٹوٹ گیا۔

یاس کے عالم میں دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی آنکھ کا آنسو اپنی آستین میں جذب کرتے ہوئے کہا۔
''پیارے مت روؤ! گھائل ہو کر مسکرانا اور فاقہ کر کے شکر ادا کرنا ہمارے گھر کی پرانی ریت ہے۔''

دھوپ کا موسم تھا۔ قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ آدمی سے لے کر چرند پرند تک بھی اپنی اپنی پناہ گاہوں میں جا چھپے تھے لیکن چمنستان فاطمی کے یہ دو کملائے ہوئے پھول کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ ان کے لئے کہیں کوئی آسائش کی جگہ نہیں تھی۔ دھوپ کی شدت سے جب بے تاب ہو گئے تو سامنے ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔

یہ ایک مجوسی کا گھر تھا، عمارت کے رخ سے شان ریاست ٹپک رہی تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا۔
''بھائی جان! جس کی دیوار کے سائے میں ہم لوگ بیٹھے ہیں معلوم نہیں یہ کس کا گھر ہے۔ اس نے بھی کہیں آ کے اٹھا دیا تو اب پاؤں میں چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ زمین کی تپش سے تلوؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں، کھڑا ہونا مشکل ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا ہے یہاں سے کیسے اٹھیں گے۔''
بڑے بھائی نے جواب دیا ''ہم اس کی دیوار کا کیا نقصان کر رہے ہیں۔ صرف سائے میں بیٹھے ہیں، ویسے ہر شخص کا دل پتھر نہیں ہوتا پیارے! ہو سکتا ہے اسے ہماری حالتِ زار پر ترس آ جائے اور وہ ہمیں اپنے سائے سے نہ اٹھائے اور اگر اٹھا بھی دیا تو دلوں کی آبادی تنگ نہیں ہے۔ انگاروں پر چلنے والے تپتی ہوئی زمین سے نہیں ڈرتے۔ فکر مت کرو میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لاد لوں گا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چھوٹے بھائی نے نہایت معصومانہ انداز میں ایک سوال پوچھا۔ بھائی جان آپ کو یاد ہوگا، اس دن جب کہ ہم لوگ جنگل میں راستہ بھول گئے تھے۔ ہر طرف آندھیوں کا طوفان اُٹھا ہوا تھا اور آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہم لوگوں نے پہاڑ کی کھوہ میں پناہ لی تھی۔ شام تک طوفان نہیں تھما، رات ہو گئی اور ہم لوگوں کو کھوہ میں ساری رات بسر کرنا پڑی۔ آدھی رات کو جب ایک شیر چنگھاڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا تو گھوڑے پر سوار ایک نقاب پوش بزرگ بجلی کی طرح نمودار ہوئے اور چند ہی لمحوں کے بعد غائب ہو گئے۔ وہ کون تھے؟ آج تک یہ راز آپ نے نہیں بتایا۔

بڑے بھائی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ شیر کی خوفناک آواز سن کر تمہارے منہ سے چیخ نکلی تھی اور تم نے دہشت زدہ ہو کر کسی کو پکارا تھا؟ یاد کرو بس وہ وہی تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکنوں سے بہت قریب رہتے ہیں، ہماری ذرا سی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی۔ انہی کا خون ہماری رگوں میں بہتا ہے۔
ابا جان کہا کرتے تھے کہ پہلی بار جب وہ پیکرِ خاکی میں یہاں آئے تھے تو ان کے چہرے سے نور کی اتنی تیز کرن پھوٹتی تھی کہ نگاہ اٹھانا مشکل تھا۔ اب تو خاکی پیراہن بھی نہیں ہے کہ حجاب کے اوٹ سے کوئی انہیں دیکھ لے اس لئے اب چہرے پر خود ہی نقاب ڈال کر آتے ہیں تا کہ کائنات ہستی کا نظام زندگی درہم برہم نہ ہو جائے۔ ابا جان بھی کہا کرتے تھے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ انہیں نقاب ہی میں دیکھا ہے۔ بشریت کی یہ ساری بخشیں نقاب ہی

سے متعلق ہیں۔ حقیقت کا چہرہ الفاظ و بیان کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہا ہے۔
چشمۂ کوثر کی معصوم لہروں کی طرح سلسلہ بیان جاری تھا اور ''گھر کا بھیدی'' گھر کا راز واشگاف کر رہا تھا کہ اتنے میں پس دیوار آواز سن کر مجوسی گھر سے باہر نکلا۔ اس کی نیند میں خلل پڑ گیا تھا۔ وہ غصے میں شرابور تھا لیکن جونہی گلشن نور کے ان حسین پھولوں پر نظر پڑی اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔
نہایت نرمی سے دریافت کیا۔ ''تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟'' بعینہ یہی سوال اس رئیس نے بھی کیا تھا اور جواب سننے کے بعد اپنے دروازے سے اٹھا دیا تھا۔
سوال کا انجام سوچ کر چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''ہم لوگ آل رسول ہیں۔ یتیم بھی ہیں اور غریب الوطن بھی۔ تین دن کے فاقے سے نیم جان ہیں۔ تکلیف کی شدت برداشت نہ ہو سکی تو آج جگر کی آگ بجھانے نکلے ہیں، وہ سامنے والے رئیس کے گھر پر گئے تھے۔ اس نے ہمیں اپنے دروازے سے اٹھا دیا۔ دھوپ بہت تیز ہے، زمین تپ گئی ہے، ننگے پاؤں چلتے چلتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے تمہاری دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے ہیں۔ شام ہوتے ہی یہاں سے اٹھ جائیں گے۔''
مجوسی نے کہا ''سامنے والا رئیس تو اسی نبی کا کلمہ پڑھتا ہے جس کی تم اولاد ہو۔ اس نے اس رشتے کا خیال بھی نہیں کیا؟
بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ''وہ یہ کہتا ہے کہ تم آل رسول ہو تو اس کا ثبوت پیش کرو ہم نے ہزار اس سے کہا کہ غریب الوطنی میں ہم کیا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ تم اس کا ثبوت قیامت کے دن پر اٹھا رکھو جب کہ نانا جان بھی وہاں موجود ہوں گے۔''
قیامت کا تذکرہ سن کر مجوسی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری پیشانیوں میں عالم قدس کا جو نور جھلک رہا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہئے تھا اسے!
اور یہ بھی کسی کور چشم کو نہ نظر آئے تو قدموں کے نیچے بچھ جانے کے لئے ''اپنے رسول'' کا نام ہی کیا کم ہے۔ آخرت کی سرفرازی کا دارومدار تو نسبت کی توقیر پر ہے۔ نسبت نہ بھی واقعہ کے مطابق ہو جب بھی جزا کا استحقاق کہیں نہیں جاتا۔ دل کی نیت بخیر ہے تو اس کی راہ کی سرفرازی کا دارومدار تو نسبت کی توقیر پر ہے۔ نسبت نہ بھی واقعہ کے مطابق ہو جب بھی جزا کا استحقاق کہیں نہیں جاتا۔ دل کی نیت بخیر ہے تو اس کی راہ ٹھوکر بھی لائق تحسین ہے۔
بہر حال میں تمہارے نانا جان کا کلمہ گو تو نہیں ہوں لیکن ان کی پاکیزہ اور باعظمت زندگی سے دل ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ ان کی نسبت سے تم نونہالوں کے لئے اپنے اندر ایک عجیب کشش محسوس کر رہا ہوں۔
ویسے ایک عظمت رسول کے ساتھ نہ بھی تمہارا نسبتی تعلق ہوتا جب بھی تمہاری یتیمی، غریب الوطنی اور اس کے ساتھ یہ تمہارا معصوم چہرہ دلوں کو پگھلا دینے کے لئے کافی ہے۔
اب تم ایک معزز مہمان کی طرح میرے گھر کو اپنے قدموں کا اعزاز مرحمت کرو اور جب تک اطمینان بخش صورت نہ پیدا ہو جائے اس کے گھر سے کہیں جانے کا قصد نہ کرو۔
اس کے بعد مجوسی رئیس دونوں بچوں کو اپنے ہمراہ گھر کے اندر لے گیا اور بیوی کہنے لگا۔
"دیکھو! نازبرداروں کے پلے ہوئے یہ محمد ﷺ عربی کے شہزادے ہیں۔ ان کے گھر کی چوکھٹ کا اقبال تمہیں بھی معلوم ہے۔ چارہ گری اور فیض بخشی میں ان کا آستانہ ہمیشہ سے دردمندوں کی کائنات کا مرکز رہا ہے۔ وہ واقعہ تمہیں یاد ہو گا جب کہ تمہاری گود خالی تھی، گھر اندھیرا تھا، ایک چراغ آرزو کی تمنا میں کتنی بار تمہاری پلکیں بوجھل تھیں۔ بالآخر اضطراب شوق میں ایک دن ہم دونوں گھر سے نکل پڑے اور کئی ہفتے کی راہ طے کر کے گاؤں میں پہنچے تھے۔
جس خواجہ کارساز کی چوکھٹ ہو کر تمہیں ایک "لخت جگر" کی بشارت ملی تھی! معلوم ہے تمہیں وہ کون سی جگہ تھی؟ وہ انہی شہزادوں کے خانوادے کی ایک دل نواز بارگاہ تھی۔
لیکن یہ بھی وقت کا ماتم ہے بیگم! کہ لالہ کا جگر جب کے کف پا کی ٹھنڈک سے شاداب رہا ہے آج وہ کانٹوں کی نوک سے گھائل ہیں اور جن کی پلکوں کے سائے میں یہ جہان خاکی چین کی نیند سوتا ہے آج وہ خود دیواروں کا سایہ تلاش کر رہے ہیں۔
بیگم! ان کے بزرگوں کا احساس تمہیں یاد نہ ہو جب بھی کم از کم اتنا ضرور یاد رکھنا ہے یتیموں کی نازبرداری اور بے سہارا بچوں کی دلجوئی انسانی اخلاق کا بہت ہی دلکش نمونہ ہے۔"
مجوسی کی بیوی ایک رقیق القلب عورت تھی۔ ذرا سی دیر میں اس کی مامتا جاگ اٹھی۔ جذبہ بے اختیار میں دونوں بھائیوں کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا، نہلایا، کپڑے بدلوائے بالوں پہ تیل رکھا، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بنا سنوار کر شوہر کے سامنے لائی۔
فاطمی شہزادوں کی بلائیں لیتے ہوئے اس کے یہ رقت انگیز الفاظ ہمیشہ کے لئے گیتی کے سینے میں جذب ہو گئے۔

ذرا دیکھئے! یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کا کل، یہ چاند کی طرح دانتوں کی قطار، یہ پھولوں کی پنکھڑی کی طرح پتلے پتلے ہونٹ، یہ گل ریز تبسم، یہ گہربار تکلم، یہ رحمتوں کا سویرا، یہ سرگیں آنکھیں، یہ معصوم اداؤں کا چشمہ سیال، سچ بتائیے کیا یتیموں کی یہی سج، دھج ہوتی ہے؟ خبردار آج سے میرے ان جگر پاروں کو جو یتیم کہے گا میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔

ان کے گھر کا بخشا ہوا ایک چراغ پہلے ہی سے گھر میں تھا۔ دو چراغ اور آ گئے۔

جس گھر میں تین چراغوں کا نور برستا ہو وہ خاکیوں کا گھر نہیں ہے۔ وہ ستاروں کی انجمن ہے۔ "

بھائی سارا غم بھول گئے۔ اب جسم کا بال بال اور خون کا قطرہ قطرہ ان غمگسار شفیقوں کے لئے دعا کی زبان بن چکا تھا۔

آج مسلمان رئیس کی قسمت کا آفتاب گہن میں آ گیا تھا۔ وہ بھی جلد سو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور سر پیٹنے لگا۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ سب لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔

رئیس کی بیوی اس کی حالت دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ گھبراہٹ میں پوچھا۔

" کیا کہیں تکلیف ہے؟، معالج کو بلائیں، جلد بتایئے؟"

کچھ جواب دینے کی بجائے وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ارے میں لٹ گیا .... تباہ ہو گیا .... میری مٹی برباد ہو گئی ..... کلیجہ شق ہوا جا رہا ہے .... قیامت کی گھڑی آ گئی .... ہر طرف اندھیرا ہے۔ ہائے میں لٹ گیا ...... !ہائے میں لٹ گیا ....!

یہ کہتے کہتے اس پر غشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا تو بیوی نے روتے ہوئے کہا جلد بتایئے کیا قصہ ہے۔ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔

رئیس نے بڑی مشکل سے رکتے رکتے جواب دیا۔

ہائے میں لٹ گیا ...... اپنی تباہی کا قصہ کیا بتاؤں تم سے!

آج کا واقعہ تمہیں معلوم ہی ہے کتنی بے دردی کے ساتھ میں ان معصوم سید زادوں کو اپنے دروازے سے دھتکارا تھا۔ ہائے افسوس! اس وقت میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔

ابھی آنکھ لگتے ہی اس واقعہ کے متعلق میں نے ایک نہایت بھیانک اور ہولناک خواب دیکھا ہے۔

کہ میں ایک نہایت حسین اور شاداب چمن میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک ہجوم دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا میں نے لپک کر دریافت کیا آپ لوگ اتنی تیزی کے ساتھ کہاں جا رہے ہیں؟

ان میں سے ایک شخص نے بتایا کہ "باغ فردوس کا دروازہ کھول دیا گیا اور ایک اعلان کے ذریعے امت محمدی کو داخلے کی عام اجازت دے دی گئی ہے یہ سن کر میں خوشی سے ناچنے لگا اور ہجوم کے ساتھ شامل ہو گیا۔ باغ فردوس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ داخل ہو رہے تھے۔

میں بھی آگے بڑھا اور جونہی دروازے کے قریب پہنچا، جنت کے پاسبان نے مجھے روک دیا۔ میں نے کہا مجھے کیوں روکا جا رہا ہے آخر میں بھی سرکار ﷺ کا امتی ہوں۔

اس نے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا، تم امتی ہو تو اپنے امتی ہونے کا ثبوت دو، سند پیش کرو، اس کے بعد ہی تمہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل سکے گی۔ بغیر کسی ثبوت کے جنت میں داخلے کی اجازت کیونکر مل سکتی ہے۔

اب تم سے بات رحم و کرم کی نہیں ہو گی، ضابطے کی ہو گی۔ انجام سے مت گھبراؤ، اس سلسلے کا آغاز تم ہی نے کیا ہے۔

جاؤ محشر کی تپتی ہوئی زمین پر چہل قدمی کرو، یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

جب سے یہ ہولناک خواب دیکھا ہے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں، میرے تئیں یہ خواب نہیں ہے، واقعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فردائے قیامت میں یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آ کر رہے گا۔

ہائے! میں سرمدی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ قہر الٰہی کی زد سے جو مجھے بچا سکتا تھا اسی کو میں نے آزردہ کر لیا ہے۔ اب کون میری چارہ سازی کرے گا۔"

" آپ اپنی جان ہلکان مت کیجئے۔ خدا بڑا غفور الرحیم ہے، اس کے دربار میں روئیے، تڑپئے، فریاد کیجئے، توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے وہ آپ کی خطا ضرور معاف کر دے گا۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ خدا کی رحمتوں سے ناامید ہونا مسلمانوں کا نہیں کافروں کا شیوہ ہے۔"

رئیس نے کراہتے ہوئے جواب دیا" تمہاری عقل کہاں مر گئی ہے؟ ہوش کی بات کرو! خدا کا حبیب جب تک آزردہ ہے ہم لاکھ فریاد کریں، رحمت و کرم کا کوئی دروازہ ہم پر نہیں کھل سکتا۔

خدا کی رحمت ہمیشہ اپنے محبوب کا تیور دیکھتی ہے۔ محبوب کی نظر سے گرنے والا کبھی نہیں اٹھ سکا ہے۔ صد حیف! جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ سکتا ہے آج

اسی کے گھر کا آبگینہ میں نے توڑ دیا۔ وہ نہ بھی اپنی زبان سے کچھ کہے جب بھی مشیت الٰہی بہر حال اس کی طرف دار ہے وہ مجھے ہرگز معاف نہیں کرے گی۔"

بیوی کی آواز مدھم پڑگئی اور اس نے دبے دبے لہجے میں کہا" تو پہلے خدا کے حبیب ہی کو راضی کرلیا جائے۔ ابھی شہزادے شہر سے باہر نہیں گئے ہونگے۔ صبح سویرے ہی انہیں تلاش کریں اور جس طرح بھی ہو منت سماجت کر کے منا کر انہیں گھر لائیں۔ وہ اگر راضی ہو گئے اور انہوں نے آپ کو معاف کردیا تو خدا کا حبیب بھی راضی ہو جائیگا۔ اس کے بعد آسانی سے رحمت یزدانی کی توجہ حاصل کی جاسکے گی۔"

بیوی کی یہ بات سن کر رئیس کا چہرہ کھل گیا۔ جیسے نگاہوں کے سامنے امید کی کوئی شمع جل گئی ہو۔ اتنی دیر کے بعد اسے اپنی نجات کا ایک موہوم سہارا نظر آیا تھا۔

آج صبح ہی سے مجوسی کے گھر پر مردوں، عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جذبہء شوق کے عالم میں وہ بے تحاشہ گھر کی دولت لٹا رہا تھا۔

سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ خاندان رسالت کے دو شہزادے اس کے گھر مہمان ہیں۔

مسلمان رئیس اپنی بیوی کے ہمراہ ان کی تلاش میں جوں ہی گھر سے باہر نکلا مجوسی کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خاندان رسالت کے دونو نہال کل سے یہاں مقیم ہیں۔ پروانوں کا یہ ہجوم ان ہی کے اعزاز میں اکٹھا ہوا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی رئیس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ مجوسی کو بچوں کے معاوضے میں چاہے زندگی بھر کی کمائی دینی پڑے قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔ بگڑی ہوئی تقدیر سنور گئی تو دولت کمانے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔

نہایت تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے رئیس اور اس کی بیوی دونوں مجوسی کے گھر پہنچے۔ دیکھا تو دونوں شہزادے دولہے کی طرح بن سنور کر بیٹھے ہیں اور مجوسی ان کے سروں سے اشرفیاں اتار کر مجمع کو لٹا رہا ہے۔

رئیس نے آگے بڑھ کر مجوسی سے کہا۔

"مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری کام ہے۔ ایک لمحے کے لئے توجہ فرمائیں۔"

مجوسی، رئیس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟"

رئیس نے اپنی نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

یہ دس ہزار اشرفیوں کا توڑا ہے اسے قبول فرمایئے اور یہ دونوں شہزادے میرے حوالے کر دیجئے۔ مجھے حق بھی پہنچتا ہے کہ سب سے پہلے یہ میرے ہی غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔

مجوسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"فردوس کی جو عالی شان عمارت آپ نے دیکھی ہے اور جس میں داخل ہونے سے آپ کو روک دیا گیا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دس ہزار اشرفیوں میں اسے فروخت کردوں اور زندگی میں پہلی بار رحمت یزدانی کا جو دروازہ کھلا ہے اپنے اوپر مقفل کرلوں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ جس خواجہء کونین کو آزردہ کر کے اپنے اوپر جنت حرام کرلی ہے، رات کو ان کے جلوہ بار تبسم سے ہمارے دلوں کی کائنات روشن ہو چکی ہے۔

اے خوشا نصیب! کہ اب ہمارے گھر میں کفر کی شب دیجور نہیں ہے ایمان اور اسلام کا سویرا ہو چکا ہے۔

یاد کیجئے! خواب کی وہ بات جب آپ جنت کے پاسبان سے کہہ رہے تھے کہ " آخر میں بھی سرکار ﷺ کا امتی ہوں " مجھے کیوں روکا جارہا ہے؟ تو میں اس وقت اپنے چھوٹے کنبے کے ساتھ جنت کے صدر دروازے سے گزر رہا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ میں بھی سرکار ﷺ کا امتی ہوں۔ سرکار ﷺ کا امتی کروڑوں کی بھیڑ میں پہچان لیا گیا۔ وہاں زبان کی بات نہیں چلتی دل کا آئینہ پڑھا جاتا ہے .... میرے بھائی!

ہمارے حال پر سرکار ﷺ کی رحمت و نوازش کا اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھنا چاہتے ہے تو اپنی اہلیہ کو اندر بھیج دیجئے۔ حضرت سیدہ کی کنیز شکرانے کی نماز ادا کر رہی ہے۔ غالباً وہ ابھی سجدے میں ہوگی۔ سر اٹھانے کے بعد ذرا اس کی دمکتی ہوئی پیشانی کا نظارہ کرلیں۔ عالم خواب میں جس جگہ پر سیدہ نے اپنا دست شفقت رکھ دیا تھا وہاں اب تک چراغ جل رہا ہے۔ کرن پھوٹ رہی ہے اور در و دیوار سے نور برس رہا ہے۔

جن شہزادوں کے قدم سے ہمارے نصیب چمکے دلوں کی انجمن روشن ہوئی جیتے جی سرمدی امان کا پروانہ ملا اور ایک رات میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے آپ انہیں دس ہزار اشرفیوں میں خریدنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ صبح سے اب تک میں دس ہزار اشرفیاں صرف ان کے اوپر سے نثار کر چکا ہوں۔

اب وہ میرے مہمان نہیں ہیں گھر کے مالک ہیں۔ ہم خود ان کے حوالے ہیں انہیں کیا حوالہ کر سکتے ہیں۔

بھائی جان آپ کا یہ سارا جوش عقیدت رات کے خواب کا نتیجہ ہے خواب سے پہلے آنکھ کھل گئی ہوتی تو بات بن سکتی تھی۔ اب اس کا وقت گزر چکا ہے البتہ

ماتم کا وقت باقی ہے وہ کبھی نہیں گزرے گا۔

رئیس سے جھکائے ہوئے باتیں سن رہا تھا اور روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔

بڑے بھائی کی نظر جونہی اس کی طرف اٹھی، دل جذبہ رحم سے بھر آیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ بڑے سے بڑے غم کا بار سہہ لیا ہے لیکن بھیگی ہوئی پلکوں کا بوجھ ہم سے نہیں اٹھ سکا۔ تم نے ہمارے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ تمہارا شیوہ تھا لیکن ہم تمہارے ساتھ اپنے گھر کی ریت برتیں گے۔ جاؤ تمہیں ہم نے معاف کر دیا۔ نانا جان بھی معاف کر دیں گے۔ مایوسی کا غم نہ اٹھاؤ۔ جنت میں تم بھی ہمارے ساتھ رہو گے۔

گھر لوٹتے وقت رئیس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔

دو یتیم

آج خانوادۂ نبوت کی چشم وچراغ حضرت امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقدس خون سے کوفے کی سرزمین سرخ ہوگئی تھی۔ نبی زادے کے خیر مقدم کے لئے آنکھوں کا فرش بچھانے والی آبادی اب اس کی تڑپتی ہوئی لاش کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تلواروں کی دھار، برچھیوں کی انی، اور تیروں کی نوک پر اب بھی خون کے نشانات موجود تھے۔ ابن زیاد کے حکم سے حضرت امام کی مقدس نعش شاہراہ عام پر لٹکا دی گئی تھی۔

کئی دن تک لٹکتی رہی۔ نبی کا کلمہ پڑھنے والے کھلی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر دیکھتے رہے۔

آل رسول کی جان لے کر بھی شقاوتوں کی پیاس نہیں بجھ سکی، ہائے رے نیرنگی عالم! زمین وآسمان کی وسیع کائنات جس کے گھر کی ملکیت تھی آج اس کی تربت کے لئے کوفے میں گز بھر زمین نہیں مل رہی تھی۔

جس کی رحمتوں کے فیضان نے اہل ایمان کی جانوں کا نرخ اونچا کردیا تھا۔ آج اسی کے نور نظر کا خون ارزاں ہوگیا تھا۔ شرم سے سورج نے منہ چھپالیا۔ فضاؤں نے سوگ کی چادر اوڑھ لی اور جب شام آئی تو کوفہ ایک بھیانک تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مہمان کے ساتھ دغا قیامت تک لئے ضرب المثل بن گئی۔

شقاوتوں کی انتہا ابھی نہیں ہوئی تھی۔ جوروستم کی وادی میں بدبختیوں کا گھنا اندھیرا اور بڑھتا جارہا تھا۔

اچانک رات کے سناٹے میں ابن زیاد کی حکومت کے ایک منادی نے اعلان کیا "مسلم کے دونوں بچے جو ہمراہ آئے ہوئے تھے کہیں روپوش ہوگئے ہیں حکومت کی طرف سے ہر خاص وعام کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جو بھی انہیں اپنے گھر میں پناہ دے گا اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور جو انہیں گرفتار کر کے لائے گا اسے انعام واکرام سے مالا مال کردیا جائے گا۔"

حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے دونوں یتیم بچے جن میں سے ایک کا نام محمد تھا اور ان کی عمر آٹھ سال کی تھی اور دوسرے کا نام ابراہیم تھا اور ان کی عمر چھ سال کی تھی، کوفے کے مشہور عاشق رسول قاضی شریح کے گھر میں پناہ گزیں تھے۔ حضرت مسلم کے جگر گوشوں کا دردناک انجام نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا۔

دیر تک اسی فکر میں غلطاں رہے کہ کس طرح انہیں ظالموں کے چنگل سے بچایا جائے۔

کافی غوروخوض کے بعد یہ صورت سمجھ میں آئی کہ راتوں رات بچوں کو کوفے سے باہر منتقل کردیا جائے۔ اضطراب کی حالت میں اپنے بیٹے کو آواز دی۔

"نہایت احتیاط کے ساتھ کسی محفوظ راستے سے بچوں کو شہر پناہ کے باہر پہنچادو۔ رات کو مدینے جانے والا ایک قافلہ آبادی کے قریب سے گزر رہا ہے انہیں کسی طرح ان کے ساتھ لگادو۔"

زادراہ مکمل ہوجانے کے بعد رخصت کرنے کے لئے دونوں بچوں کو سامنے بلایا۔

جونہی ان پر نظر پڑی فرط غم سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ منہ سے ایک چیخ نکلی اور بیتاب ہوکر دونوں بچوں کو سینے سے لگایا۔ پیشانی چومی، سر پر ہاتھ رکھا اور سکتے کی حالت میں دیر تک دم بخود رہے۔

باپ کی شہادت کے واقعہ سے بچے اب تک بے خبر رکھے گئے تھے، نہ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ اب خود ان کی ننھی گردنیں بھی خون آشام تلواروں کی زد پہ ہیں۔

قاضی شریح کی اس کیفیت پر بچے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بڑے بھائی نے حیرانی کے عالم میں دریافت کیا۔

"ہمیں دیکھ کر گریۂ بے اختیار کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ اچانک اتنی رات کو پاس بلا کر ہمارے سروں پہ شفقت کا ہاتھ رکھنا بے سبب نہیں ہے۔ اس طرح کی پھوٹ پڑنے والی ہمدردی تو ہمارے خاندان میں یتیموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔"

تیرنشتر کی طرح دل میں آرپار ہوجانے والا جملہ ابھی ختم نہیں ہوا پایا تھا کہ پھر فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور قاضی شریح نے برستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گلوگیر آواز میں بچوں کو جواب دیا۔

"گلشن رسول کے مہکتے غنچو! کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ زبان میں تاب گویائی نہیں ہے۔ کس طرح خبر دوں کہ تمہارے ناز کا چمن اجڑ گیا اور تمہاری امیدوں کا آشیانہ دن دھاڑے ظالموں نے لوٹ لیا۔

ہائے! تم پردیس میں یتیم ہوگئے۔ تمہارے باپ کو کوفیوں نے شہید کرڈالا۔ اور اب تمہاری ننھی جان بھی خطرے میں ہے۔ آج شام ہی خون کے پیاسے تمہاری تلاش میں ہیں۔ ننگی تلواریں لئے ہوئے حکومت کے جاسوس تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔

یہ خبر سن کر دونوں بچے ہیبت وخوف سے کانپنے لگے۔ ننھا سا کلیجہ سہم گیا۔ پھولوں کی شاداب پنکھڑی مرجھا گئی۔ منہ سے ایک چیخ نکلی اور غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ ہائے رے تقدیر کا تماشا! ابھی چند ہی دن ہوئے ماں کی ممتا نے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں مدینے سے رخصت کیا تھا۔ ناز اٹھانے کے لئے باپ کی شفقتوں کا قافلہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب نہ باپ کا دامن ہے کہ پکڑ کر مچل جائیں نہ ماں کی آنچل ہے کہ سہم جائیں تو منہ چھالیں۔ کچی نیند سو کر اٹھنے والے اب کسے آواز دیں۔ کون ان کی پلکوں کا آنسو اپنی آستین میں جذب کرتے۔

آہ! غنچوں کی وہ نازک پنکھڑی جو شبنم کا بار بھی نہیں اٹھا سکتی آج اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔

پردیس میں ننھی جانوں کے لئے باپ کی شہادت ہی کی خبر کیا کم قیامت تھی کہ اب خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ قضا تیغ برہنہ لئے سر پہ کھڑی تھی آنکھوں کے سامنے امیدوں کا چراغ گل ہو رہا تھا قاضی شریح سے بچوں کا بلک بلک کر رونا اور پچھاڑیں کھا کھا کر تڑپنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بنو ہاشم کے نونہالو! اس طرح پھوٹ پھوٹ کر مت روؤ۔ دشمن دیوار سے کان لگائے کھڑے ہیں۔ تم اپنے باپ کی ایک مظلوم یادگار ہو۔ تاجدار عرب کی ایک مقدس امانت ہو۔ نازک آبگینوں کو کہیں ٹھیس لگ گئی تو میں عرصہ محشر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ اس لئے میری کوشش ہے کہ کسی طرح تمہیں مدینے کے دارالامان تک پہنچا دیا جائے۔

اسی وقت رات کے سناٹے میں تم دونوں ہمارے بیٹے کے ہمراہ کوفے سے باہر نکل جاؤ اور جو قافلہ مدینے کی طرف جا رہا ہے اس میں شامل ہو جاؤ۔ اپنے نانا جان کے جوار رحمت میں پہنچ کر ہماری طرف سے درود و سلام کی نظر پیش کر دینا۔

"اچھا اب جاؤ خدا تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔"

بھیگی پلکوں کے سائے میں قاضی شریح نے بچوں کو رخصت کیا۔ پاسبانوں اور جاسوس کی نگاہوں سے چھپ چھپ کر قاضی شریح کے بیٹے نے بحفاظت تمام انہیں کوفہ کی شہر پناہ کے باہر پہنچا دیا۔ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک گزرتے ہوئے قافلے کی گرد نظر آئی۔ انگلی کے اشارے سے بچوں کو دکھلایا۔ اشارہ پاتے ہی تیزی سے بچے قافلے کی طرف دوڑے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

رات کا وقت دہشت خیز سناٹا، بھیانک اندھیرا، خوف وہیبت میں ڈوبا ہوا ماحول اور آغوش مادر کی تازہ بچھڑی ہوئی دو ننھی جانیں، نہ ہاتھ میں عقل وشعور کا چراغ نہ ساتھ میں کوئی رفیق ورہبر تھوڑی دور چل کر راستہ بھول گئے۔

ہائے رے گردش ایام! کل تک جن لاڈلوں کا قدم پھولوں کی سیج پر تھا آج ان ہی کی راہ میں کانٹوں کی برچھیاں کھڑی تھیں جو اپنے نانا جان کے مزار تک بھی باپ کی انگلیوں کا سہارا لئے بغیر نہیں جا سکتے تھے آج وہ یکہ وتنہا دشت غربت میں بھٹکے پھر رہے تھے۔ کبھی عادت نہیں تھی، چلتے چلتے گر پڑتے۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی، تلوؤں میں کانٹے چبھتے تو اف کر کے بیٹھ جاتے۔ ہوا سنسناتی تو دہشت سے کانپنے لگتے۔ پتے کھڑکتے تو ننھا سا کلیجہ سہم جاتا۔ درندوں کی آواز آتی چونک کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔ ڈر لگتا تو ٹھٹھک جاتے۔ پھر چلنے لگتے۔ کبھی بلک بلک کر ماں کو یاد کرتے، کبھی مچل مچل کر باپ کو آواز دیتے۔ کبھی حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے اور کبھی ڈبڈباتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے۔

جب تک پاؤں میں سکت رہی اسی کیفیت کے ساتھ چلتے رہے۔ جب مایوس ہو گئے تو ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئے۔

ذرا تقدیر کا تماشہ دیکھئے! کہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈھلتے ہوئے چاندنی ہر طرف بکھر گئی تھی۔ ابن زیاد کی پولیس کا ایک دستہ جوان بچوں کی تلاش میں نکلا تھا، گشت کرتا ہوا ٹھیک وہیں پر آ کر رکا۔ جونہی بچوں پر نظر پڑی قریب آیا اور دریافت کیا۔

"تم کون ہو؟"

بچوں نے یہ سمجھ کر یتیموں کے ساتھ ہر شخص کو ہمدردی ہوتی ہے اپنا سارا حال صاف صاف بیان کر دیا۔

ہائے رے بچپن کی معصومی؟ ان بھولے بھالے نونہالوں کو کیا خبر تھی ک وہ خون کے پیاسوں کو اپنا پتہ بتا رہے ہیں؟

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہی حضرت مسلم کے دونوں بچے ہیں جلادوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ مشکیں کسیں اور گھسیٹتے ہوئے اپنے ہمراہ لے چلے۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر ڈوبتے ہوئے تاروں کی آنکھوں جھپک گئیں، چاند کا چہرہ فق ہو گیا۔ شدت کرب سے ابن عقیل کے یتیم بلبلا اٹھے۔ دل دہلا دینے والی فریاد صحرا میں گونجی۔

ہم بن باپ کے بچے ہیں۔ ہماری یتیمی پر رحم کرو! رات بھر چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ ہماری مشکیں کھول دو۔ اب اذیت برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ نانا جان کا واسطہ ہمارے گھائل جسم پر ترس کھاؤ! سنسان جنگل میں یتیموں کی فریاد سن لو۔

اس نالہ درد سے دھرتی کا کلیجہ ہل گیا لیکن سنگدل اشقیاء ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔

ترس کھانے کے بجائے ظالموں نے فرط غضب میں پھول جیسے رخساروں پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔

"تمہاری تلاش میں کئی دن سے آنکھوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ کھانا پینا حرام ہو گیا ہے اور تم راہ فرار اختیار کرنے کے لئے جنگل جنگل چھپتے پھر رہے ہو۔

جب تک تم کیفر کردار کو نہیں پہنچ جاتے تم پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔"

طمانچوں کی ضرب سے نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی صورتیں ماند پڑ گئیں۔ چہرے پر انگلیوں کے نشانات ابھر آئے۔

رونے کی بھی اجازت نہیں تھی کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا، ایک گرفتار پنچھی کی طرح سسکتے، لرزتے، کانپتے، سر جھکاتے شکنجے میں کسے قدم قدم پر جفا کاروں کے ظلم وستم کی چوٹ کھاتے رہے۔

اب امید کا چراغ گل ہو چکا تھا، دل کی آس ٹوٹ چکی تھی، سب کو آواز دے کر تھک چکے تھے۔ کہیں سے کوئی چارہ گر نہیں آیا۔ بالآخر ننھا سا دل مایوسیوں کے ساتھ اتھاہ ساگر میں ڈوب گیا۔

اب موت کا بھیانک سایہ دن کے اجالے میں نظر آرہا تھا۔ اسی عالم یاس میں وہ کشاں کشاں کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنے مستقر پر پہنچ کر سپاہیوں نے ابن زیاد کو خبر دی۔

حکم ہوا، بچوں کو قید خانے میں ڈال دیا جائے اور جب تک دمشق سے کوئی اطلاع نہیں آجاتی کڑی نگرانی رکھی جائے۔

حکومت کے سپاہی ابن زیاد کی ہدایت کے بموجب دونوں بچوں کو داروغہ جیل کے حوالے کر کے چلے گئے۔ داروغہ نہایت شریف النفس اور دل نثار اہل بیت تھا۔ اس نے نہایت عقیدت ومحبت کے ساتھ ہاشمی شہزادوں کی راحت وآسائش کا انتظام کیا۔

دو پہر رات گزر جانے کے بعد اپنی جان پر کھیل کر اس نے دونوں بچوں کو جیل سے باہر نکالا اور اپنی حفاظت میں قادسیہ جانے والی سڑک پر انہیں پہنچا کر ایک انگھوٹی دی اور اپنے بھائی کا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ قادسیہ پہنچ کر تم اس سے ملاقات کرنا اور بطور نشانی یہ انگوٹھی دکھانا وہ بحفاظت تمہیں مدینہ پہنچا دے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بچوں کو رخصت کیا۔

قادسیہ کی طرف جانے والا کارواں کچھ ہی دور تیار کھڑا تھا۔ بچے بے تحاشا اس کی طرف دوڑے، لیکن نوشتہ تقدیر نے پھر یہاں اپنا کرشمہ دکھایا۔ پھر گھٹا کی اوٹ سے نکلا ہوا سورج گہنا گیا۔ پھر مدینے کی ان ننھے مسافروں کو دشتِ غربت کی بلاؤں نے آکے گھیر لیا۔

پھر کچھ دور چل کر راستہ بھٹک گئے، قافلہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

پھر رات کا وہی بھیانک سناٹا، وہی خوفناک تاریکی، وہی سنسنان جنگل، وہی شام غربت کا ڈراؤنا خواب، ہر طرف خون آشام تلواروں کا پہرہ قدم قدم پر دشمنوں کا سایہ۔

چلتے چلتے پاؤں شل ہو گئے۔ تلوؤں کے آبلے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے۔ روتے روتے آنکھوں کا چشمہ سوکھ گیا۔

صبح ہوئی تو دیکھا کہ جہاں سے رات کو چلے تھے گھوم پھر کر وہیں موجود ہیں۔

ہائے رے تقدیر کا چکر! اس دنیا میں کیڑے مکوڑوں اور چرند پرند تک کا اپنا رین بسیرا ہے لیکن خاندان نبوت کے دو ننھے یتیموں کے لئے کہیں پناہ کی جگہ نہیں ہے۔

جب سویرا ہو گیا اور ہر طرف لوگوں کی آمد ورفت شروع ہو گئی تو کل کی گرفتاری کا واقعہ یاد کر کے بچے بے قرار ہو گئے۔ دشمن کی نظر سے چھپنے کے لئے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن چٹیل میدان میں کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی۔

حیرانی، بیچارگی، مایوسی اور خوف وہراس کے عالم میں دونوں بھائی حسرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ننھا سا دل، کم سنی کی عقل، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ انجام سوچ کر آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

تھوڑی ہی دور ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا۔

"چلو وہاں ہاتھ منہ دھو لیں۔ نماز فجر کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ خدا کی طرف سے اگر ہمارا وقت آہی گیا ہے تو اب اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

چشمے کے قریب پہنچ کر انہیں ایک بہت پرانا درخت نظر آیا۔ اس کا تنا اندر سے کھوکلا تھا۔ پناہ کی جگہ سمجھ کر دونوں بھائی اسی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ذرا سی آہٹ ہوتی تو دل دھڑکنے لگتا۔ کوئی راہ گیر گزرتا تو دشمن سمجھ کر سہم جاتے۔

ایک پہر دن چڑھنے کے بعد کوفہ کی طرف سے ایک لونڈی پانی بھرنے کی غرض سے چشمے کے کنارے آئی۔ پانی میں برتن ڈبونا چاہتی تھی کہ سطح آب پر آدمی کا عکس نظر آیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دو ننھے بچے درخت کی کھوہ میں سہمے بیٹھے تھے۔

سفید پیشانی سے نور کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ لالہ کی طرح دہکتے عارض پر موسم خزاں کی اداسی چھا گئی تھی۔

لونڈی نے حیرانی کے عالم میں دریافت کیا۔ اے گلشن دلربائی کے نو شگفتہ پھولو تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

ایک بار کے ڈسے ہوئے تھے کچھ جواب دینے کے بجائے خوف ودہشت سے لرزنے لگے۔ پھوٹ پھوٹ کر بہنے والے آنسوؤں سے چہرہ شرابور ہو گیا۔

لونڈی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ناز کے پلے ہوئے لاڈلو! کسی طرح کا اندیشہ نہ کرو۔

دل سے دہشت نکال دو! یقین کرو میں تمہارے گھر کی بھکارن ہوں۔ دشمن نہیں ہوں۔

تم نہ بھی اپنا پتہ ٹھکانہ بتاؤ جب بھی تمہارا یہ نورانی چہرہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ تم بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جنت کے پھول ہو۔

سچ بتاؤ! کیا تم ہی دونوں امام مسلم کے نونہال ہو؟ لونڈی نے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا " فلک نشیں شہزادو! کیڑے مکوڑوں کے بھٹ سے باہر نکلو۔ آؤ! میرے دل میں بیٹھو، آنکھوں میں سما جاؤ۔"

لونڈی کے اصرار پر بچے درخت کی کھوہ سے باہر نکلے اور ہمدرد غمگسار سمجھ کر اس سے اپنا سارا حال بیان کر دیا۔

ان کی دردناک سرگزشت سن کر لونڈی کا کلیجہ ہل گیا، آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ دل کی بے قرار کیفیت پر قابو پانے کے بعد بچوں کو چشمے کے کنارے لے گئی۔

آنسو پونچھے، منہ دھلایا، بالوں کا غبار صاف کیا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے محفوظ راستے سے اپنے گھر لائی۔ اس کی مالکہ بھی خاندان اہل بیت سے والہانہ عقیدت رکھتی تھی۔

اپنی مالکہ کے سامنے دونوں بچوں کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

خوش نصیب بی بی! چمنستان فاطمی کے دو پھول لے کر آئی ہوں۔ یہ دونوں امام مسلم کے لاڈلے ہیں۔ بن باپ کے یتیم بچے ہیں، پردیس میں ان کا کوئی نہیں ہے۔ ان کی بے کسی اور یتیمی پر ترس کھانے کی بجائے ظالم اب ان بے گناہوں کے خون کے درپے ہیں۔ خوف و دہشت سے ننھا سا کلیجہ سوکھ گیا ہے۔ ہاشمی گھرانے کے یہ دونوں لال ڈر کے مارے درخت کی ایک کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔

بی بی! سورج سوا نیزے پہ آگیا ہے لیکن گہوارۂ مادر سے نکلے ہوئے ان شیر خوار بچوں کے منہ میں ایک کھیل بھی اب تک نہیں پڑی ہے۔

مالکہ یہ سارا ماجرہ سن کر تڑپ گئی۔ گریہ بے اختیار سے اس کے آنچل کا دامن بھیگ گیا۔ وارفتگی شوق میں بچوں کو گود میں بٹھالیا۔ چہرے کی بلائیں لیں، سر پر ہاتھ پھیرا، اور نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا، زلفیں سنواریں اور کھلا پلا کر ایک محفوظ کوٹھڑی میں آرام کرنے کے لئے بستر لگا دیا۔

قدم قدم پر شفقت و پیار کا پھوٹتا ہوا سیلاب دیکھ کر غریب الوطن بچوں کو ماں یاد آگئی۔

یکا یک ممتا کی گود کا پلا ہوا ارمان مچل اٹھا، بے تاب ہو کر رونے لگے۔

پھول جیسے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسوں دیکھ کر مالکہ بے چین ہو گئی۔ دوڑ کر سینے سے لپٹا لیا۔ اپنے آنچل کے پلو سے آنسو پونچھے اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آنکھ کے تارو! اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو! تمہارے قدموں پر میری جان نثار میری روح صدقے، میں جب تک زندہ ہوں گی تمہارا ہر ناز اٹھاؤں گی، تمہارے قدم قدم سے میرے ارمانوں کا چمن کھل گیا ہے، میرے آنگن میں چھما چھم نور کی بارش ہو رہی ہے۔

رات کی بھیانک سیاہی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ امام مسلم کے یتیم بچوں کی تلاش میں حکومت کے جاسوس اور دنیا کے لالچی کتے گلی گلی پھر رہے تھے۔

کافی دیر تک گھر کی مالکہ اپنے شوہر "حارث" کے انتظار میں جاگتی رہی۔ ایک پہر رات ڈھل جانے کے بعد وہ ہانپتا کانپتا ماندہ گھر واپس لوٹا۔

بیوی نے یہ حال دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا" آج اتنے پریشان و بے حال کیوں نظر آتے ہیں آپ؟"

کچھ دم لینے کے بعد جواب دیا

تمہیں شاید خبر نہیں ہے کہ باغی مسلم کے ہمراہ اس کے دو بچے بھی آئے تھے۔ کئے دن تک وہ کوفہ میں روپوش رہے۔ پرسوں صبح کو مدینے کی طرف جانے والے راستے کے قریب انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ کل رات کے کسی حصے میں داروغہ جیل کی سازش سے وہ فرار ہو گئے۔

ابن زیاد کی طرف سے عام منادی کر دی گئی ہے کہ جو انہیں پکڑ کر لائے گا اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ وقت کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ زریں موقع اب ہاتھ نہیں آئے گا بیگم؟

صبح سے انہی بچوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ دوڑتے دوڑتے برا حال ہے ابھی تک کوئی سراغ نہیں لگ رہا ہے۔

حارث کی بات سن کر بیوی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ مسحور کر لینے والی ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ اس نے اپنے شوہر کو سمجھانا شروع کیا۔

"ابن زیاد آل رسول کا خون ناحق بہا کر اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔ دنیا کی آسائش چند روزہ ہے۔ انعام کے لالچ میں جہنم کا ہولناک عذاب مت خریدیئے!

ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے! کل میدان حشر میں رسول خدا ﷺ کو ہم کیا منہ دکھائیں گے؟"

حارث کا دل پوری طرح سے سیاہ ہو چکا تھا۔ بیوی کی باتوں کا کوئی اثر اس کے دل پر نہیں ہوا۔

جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عاقبت کا نفع نقصان میں خود سمجھتا ہوں۔ میرا ارادہ اٹل ہے۔ اپنی جگہ سے کوئی بھی مجھے نہیں ہٹا سکتا۔"

سنگدل شوہر کی نیت بد معلوم ہونے کے بعد منٹ منٹ پر دل دھڑک رہا تھا کہ مبادا ظالم کو کہیں بچوں کی بھنک نہ لگ جائے۔ اس لئے جلد ہی اسے کھلا پلا کر سلا دیا اور جب تک نیند نہیں آ گئی، بالیں پر بیٹھی اسے باتوں میں بہلاتی رہی۔ جب وہ سو گیا تو دبے پاؤں اٹھی اور بچوں کی کوٹھڑی میں تالا ڈال دیا۔

فکر سے آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ رہ رہ کر دل میں ہوک اٹھتی تھی۔

"ہائے اللہ، حرم نبوت کے ان راج دلاروں کو کچھ ہو گیا تو حشر کے دن سیدہ کو میں کیا منہ دکھاؤں گی؟

دنیا قیامت تک میرے منہ پر تھوکے گی کہ میں نے نبی زادوں کے ساتھ دغا کی۔ انہیں جھوٹا دم دلاسا دے کر مقتل کی راہ گزر تک لے آئی۔ آہ! میرے عشق پارسا کا سارا بھرم لٹ گیا۔ میرے حسین خوابوں کا تار تار بکھر گیا۔

ہائے افسوس! اس گھر کو معصوم بچے اپنا ہی گھر سمجھ رہے ہونگے۔ کہیں یہ راز فاش ہو گیا تو ان کے ننھے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ مجھے اپنے تئیں کیا سمجھیں گے لیکن میرے دل کا حال تو خدا اور اس کے رسول سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو جیتے جی لاڈلوں کی جان پر کوئی آفت نہیں آنے دوں گی۔

یا اللہ! مجھے اپنے محبوبوں کے عشق میں ثابت قدم رکھ، ان کے آنسوؤں کا گوہر ٹپکنے سے پہلے میرے جگر کا خون ارزاں کر دے۔"

رات کا پچھلا پہر تھا۔ کوفے کی بدنصیب آبادی پر ہر طرف نیند کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حارث بھی اپنے گھر میں بے خبر سو رہا تھا۔

دونوں بچے بند کوٹھڑی میں محو خواب ناز تھے کہ اسی درمیان انہوں نے ایک نہایت دردناک اور ہیجان انگیز خواب دیکھا۔

چشمہ کوثر کی سفید موجوں سے نور کی کرن پھوٹ رہی ہے۔ باغ فردوس کی شاہراہوں پر چاندنی کا غلاف بچھا دیا گیا ہے۔ قریب ہی کچھ فاصلے پر شہنشاہ کونین ﷺ مولائے کائنات حضرت حیدر، بنت رسول حضرت فاطمہ زہراء اور شہید مظلوم حضرت امام مسلم رضوان اللہ علیہم جلوہ فرما ہیں۔

دونوں بچوں پر نظر پڑتے ہی سرکار ﷺ نے امام مسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

مسلم! تم خود تو آ گئے اور جور و ستم کا نشانہ بننے کے لئے ہمارے جگر پاروں کو اشقیاء کے ہاتھوں میں چھوڑ آئے۔

حضرت مسلم نے نیچی نگاہ کئے جواب دیا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے آ رہے ہیں حضور! بہت قریب آ چکے ہیں، بس دو چار قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو کل سورج طلوع ہوتے ہی وہ دامن رحمت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں مچل رہے ہونگے۔

یہ خواب دیکھ کر دونوں بھائی چونک پڑے۔ بڑے نے چھوٹے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا اب سونے کا وقت نہیں ہے، ہماری شب زندگی کی سحر ہو گئی۔

بھیا! اُٹھو .... بابا جان نے خبر دی ہے کہ اب ہم چند گھنٹے کے مہمان ہیں۔ حوض کوثر پر نانا حضور ہمارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ دادی اماں نہایت بے تابی کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہی ہیں۔

"بھیا صبر کرو، اب دشمنوں کی خوں آشام تلواروں کی زد سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔

اب مدینے لوٹ کر جانا نصیب نہیں ہوگا۔ ہائے امی جان اب آخری وقت بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

چھوٹے بھائی نے ڈبڈباتے ہوئے جواب دیا۔

"بھائی جان! میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے۔ کیا سچ مچ ہم لوگ کل صبح کو قتل کر دیئے جائیں گے؟

ہائے! ایک دوسرے کو ذبح ہوتے ہم کیسے دیکھ سکیں گے بھیا؟"

یہ کہہ کر دونوں بھائی ایک دوسرے سے گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

قضا بھی تاک ہی میں تھی۔ نالہ ء بے اختیاری کی آواز سے جلاد حارث کی آنکھ کھل گئی۔

آہ! سوتی ہوئی قیامت جاگ اٹھی۔

"یہ بچوں کے رونے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

صورت حال کی نزاکت سے بیوی کا کلیجا سوکھ گیا۔

اس نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

"سو جایئے! کہیں پڑوس کے بچے رو رہے ہوں گے۔"

سنگدل نے تیور بدل کر کہا۔

"پڑوس میں نہیں، ہمارے گھر سے یہ آواز آ رہی ہے۔ ہو نہ ہو یہ مسلم کے بچے ہیں جن کی تلاش میں کئی دن سے میں سرگرداں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اس کوٹھڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ تالا توڑ کر اندر جا کر دیکھا تو دونوں بچے روتے روتے بے حال ہو گئے تھے۔

کرخت لہجے میں دریافت کیا۔ تم کون ہو! اچانک اس اجنبی آواز پر بچے سہم گئے۔ لیکن چونکہ اس گھر کو اپنا دار الامان سمجھے ہوئے تھے۔ یہ کہتے ہوئے

ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ ہم امام مسلم کے یتیم بچے ہیں۔

یہ سن کر ظالم غصے سے دیوانہ ہو گیا "میں تو چاروں طرف ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہا ہوں اور آپ لوگوں نے ہمارے ہی گھر میں عیش کا بستر لگایا ہے۔

یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور نہایت بے رحمی کے ساتھ ان ننھے یتیموں کے رخساروں پر طمانچے برسانا شروع کیے۔ شدت کرب سے دونوں بھائی بلبلا اٹھے۔ بے تحاشہ بیوی دوڑی اور یہ کہتے ہوئے درمیان میں حائل ہو گئی۔

ارے ظالم! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے فاطمہ کے راج دلارے ہیں! ان کی چاند جیسی صورتوں پر ترس کھا۔

ہاتھ روک لے ستمگر! جنت کے پھولوں کا سہاگ مت لوٹ! چمنستان قدس کی نازک کلیوں کو گھائل مت کر!

بن باپ کے دکھیاروں کا کچھ تو خیال کر ظالم! پھر ماتا کی جھونک میں اٹھی اور اس کے قدموں پر اپنا سر پٹکنے لگی۔ لے! میرا سر کچل اپنی ہوس کی آگ بجھالے لیکن فاطمہ کے جگر پاروں کو بخش دے۔

غصے میں چور سنگدل شوہر نے اسے اتنے زور کی ٹھوکر ماری کہ وہ پتھر کے ایک ستون سے ٹکرا کر لہولہان ہو گئی۔

طمانچہ مارتے مارتے جب تھک گیا تو شقئی ازلی نے دونوں بھائیوں کی مشکیں کسیں اور غلاف کعبہ کی لٹکتی ہوئی زلفوں کو زور سے کھینچا اور آپس میں ایک دوسرے سے باندھ دیا۔

مارے دہشت کے بچوں کا خون سوکھ گیا۔ حلق کی آواز پھنس گئی، آنکھوں کے آنسو جل گئے۔

اس کے بعد سیہ بخت یہ کہتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل آیا "جس قدر تڑپنا ہے صبح تک تڑپ لو، دن نکلتے ہی میری چمکتی ہوئی تلوار تمہیں ہمیشہ کے لئے چین کی نیند سلادے گی۔"

دروازہ مقفل تھا۔ اندر کا حال خدا جانے، ویسے بھی ننھی جانوں میں اب تاب ہی کہاں تھی کہ نالوں کا شور بلند ہوتا۔ البتہ زنداں کی کوٹھڑی سے تھوڑے تھوڑے وقفے پر آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز سنائی پڑتی تھی۔

بلاؤ قیامت کو! بڑا ناز ہے اسے مناظر کی ہولنا کی پر، سوا نیزے والے آفتاب کی روشنی میں وہ بھی سیدہ کے شیر خوار بچوں کی اسیری کا تماشہ دیکھ لے!

اور ذرا محشریوں کو بڑھ کے آواز دو! وہ بھی گواہ ہو جائیں کہ جس محمد عربی کے اشارۂ ابرو پر کل ان کی بیڑیاں ٹوٹ کر گرنے والی ہیں آج انہی کی گود کے لاڈلے زنجیروں میں سسک رہے ہیں۔

ہائے رے! مقام بلند کی قیامت آرائیاں! بڑے بڑے لالہ رخوں مہ جبینوں اور گل رویوں کا نگار خانہ جمال تو نے دن دھاڑے لوٹ لیا اور تیرے خلاف کہیں داد فریاد بھی نہیں ہو سکی ہے۔ ....

ارمانوں کے خون کی سرخیاں لئے لرزتی کانپتی سحر طلوع ہوئی۔ گھنے بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپائے سورج نکلا، جونہی دشمن ایمان نے اپنی خوں آشام تلوار اٹھائی زہر میں بجھا ہوا خنجر سنبھالا اور خونخوار درندے کی طرح کوٹھڑی کی طرف لپکا، نیک بخت بیوی نے دوڑ کر پیچھے سے اس کی کمر تھام لی۔ جفا کار نے اتنے زور کا اسے جھٹکا دیا کہ سر ایک دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ آہ کر کے زمین پر گر پڑی۔

بیوی کو گھائل کرنے کے بعد جوش غضب میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ننگی تلوار اور چمکتا ہوا خنجر دیکھ کر دونوں بھائی لرز گئے۔ خوف سے نرگسی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ابھی وہ اس ہولناک دہشت سے کانپ ہی رہے تھے کہ سیاہ بخت نے آگے بڑھ کر دونوں بھائیوں کی زلفیں پکڑیں اور نہایت بے دردی کے ساتھ انہیں گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔

تکلیف کی شدت سے معصوم بچے تلملا اٹھے، پچھاڑیں کھا کھا کر اس کی قدموں پر سر پٹکنے لگے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر آہ فریاد کرنے لگے لیکن سنگدل کو ترس نہ آنا تھا نہ آیا۔

لہو میں شرابور پاک طینت بی بی پھر اٹھیں اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرجتے ہوئے کہا۔

آخر گھسیٹ کر کہاں لے جا رہا ہے ان بے گناہ مسافروں کو؟ دشمنی تھی تو ان کے باپ سے تھی۔ چار دن کے معصوم بچوں سے کیا دشمنی ہے جو تو ان کا خون بہانے پر تلا ہوا ہے۔

ساری دنیا یتیم بچوں پر ترس کھاتی ہے اور تو رات سے انہیں شکنجے میں کسے ہوئے ہے۔

تھپڑوں سے مار مار کر تو نے ان کا پھول سا چہرا لہولہان کر دیا ہے۔ رحمتوں کی گھٹا کی طرح لٹکتی ہوئی زلفوں کو تو اتنی بے دردی کے ساتھ گھسیٹ رہا ہے کہ بالوں کی جڑوں سے خون بہنے لگا۔

رات سے اب تک مدینے کے یہ نازنین بے آب و دانہ لگاتار تیرے ظلم و ستم کی چوٹ کھا رہے ہیں اور تجھے ان کی کم سنی پر بھی ترس نہیں آتا۔ پردیس میں ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے۔ اس لئے بے سہارا سمجھ کر تو انہیں تڑپا تڑپا کے مار رہا ہے۔ جس نبی کا کلمہ پڑھتا ہے وہ اگر اپنی تربت سے نکل آئیں تو کیا ان کے روبرو بھی ان کے نازنین شہزادوں کے ساتھ تو ایسا سلوک کر سکے گا۔

تیرے بازوؤں میں بڑا کس بل ہے۔تو کسی کڑیل جوان سے پنجہ لڑا دودھ بچوں پہ کیا اپنی شہ زوری دکھلاتا ہے۔

اس کے سینے میں غیرت ایمانی کا جوش ابل پڑا تھا۔اپنی جان پر کھیل کر اب وہ رفاقت حق کا آخری فیصلہ کر دینا چاہتی تھی۔

جذبات میں بے قابو ہو کر نے جیسے ہی بچوں کو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی، اس بدبخت نے ایک بھرپور ہاتھ کا گھونسا اس کے سینے پر مارا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔لونڈی سامنے آئی تو وہ بھی اس کے تیغ ستم سے گھائل ہوئی۔

اس کے بعد خچر پر لاد کر دریائے فرات کی طرف چل پڑا۔

رسیوں میں جکڑے ہوئے مسلم یتیم زندانی اب مقتل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔مایوس چہروں پہ بے بسی کی حسرت برس رہی تھی۔دم بدم دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔

رہ رہ کے بچھڑی ہوئی ماں کی آغوش، شفقت و پیار کا گہوارہ مدینے کا دارالامان اور حجرۂ عائشہ میں گیتی کی آخری پناہ گاہ یاد آ رہی تھی۔

کچلے ہوئے ارمانوں کے ہجوم میں چھوٹے بھائی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔طویل خاموشی کے بعد اب آنسوؤں کا تھما ہوا طوفان ابل پڑا۔ بڑے بھائی نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

جان عزیز صبر کرو! ہمت سے کام لو! اب زندگی کی گنتی کی چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں انہیں بے تابیوں کے ہیجان سے رائیگاں مت کرو۔

"وہ دیکھو دریائے فرات کی سطح پر چشمہ کوثر کی سفید موجیں ہمیں سر اٹھا کر دیکھ رہی ہیں۔اب اس جہان فانی سے اپنا لنگر اٹھا لو۔چند ہی قدم کے بعد عالم جاوید کی سرحد شروع ہو رہی ہے۔بس دو گھڑی میں ہم اس جفا پیشہ دنیا کی دستر سے باہر نکل جائیں گے۔"

تھوڑی دور چلنے کے بعد دریائے فرات نظر آنے لگا۔جلاد نے اپنی تلوار چمکاتے ہوئے کہا۔

"سانپ کے بچو! دیکھ لو اپنا مقتل! یہیں تمہارا سر قلم کر کے سارے جہان کے لئے ایک عبرتناک تماشا چھوڑ جاؤں گا۔"

یہ سن کر بچوں کا خون سوکھ گیا، کنارے پہنچ کر شقی ازلی نے انہیں خچر سے اتارا، مشکیں کھولیں اور سامنے کھڑا کیا۔

اب دونوں کھلی آنکھوں سے منڈلاتی ہوئی قضا دیکھ رہے تھے۔بے بسی کے عالم میں ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف تکنے لگے۔

جوں ہی بھویں تانے، تیور چڑھائے قتل کے ارادے سے اس نے اپنی تلوار بے نیام کی، مظلوم بچوں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر رحم کی درخواست کی۔

اتنے میں ہانپتی کانپتی، گرتی پڑتی، پیکر وفا بی بی بھی آپہنچی۔آتے ہی اس نے پیچھے سے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک عاجز و درماندہ کی طرح خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے اب بھی مان جاؤ۔آل رسول کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین مت کرو۔

رحم و غمگساری کے جذبے میں ذرا ایک بار آنکھ اٹھا کر دیکھ! بچوں کی ننھی جان سوکھی جا رہی ہے۔تلوار سامنے سے ہٹا لو۔"

نفس کا شیطان پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ساری منت و سماجت بیکار چلی گئی۔غصے میں بھرپور تلوار کا ایک وار بیوی پر چلایا۔وہ پیکر ایمان گھائل ہو کر تڑپنے لگی۔

بچے یہ دردناک منظر دیکھ کر سہم گئے۔اب یہ بدبخت جلاد اپنی خون آلود تلوار لے کر بچوں کی طرف بڑھا۔چھوٹے پر وار کرنا ہی تھا کہ بڑا بھائی چیخ اٹھا۔

"خدارا پہلے مجھے ذبح کرو۔جان سے زیادہ عزیز بھائی کی تڑپتی ہوئی لاش میں نہیں دیکھ سکوں گا۔"

چھوٹے بھائی نے سر جھکاتے ہوئے خوشامد کی۔" بڑے بھائی کے قتل کا منظر مجھ سے ہرگز نہ دیکھا جا سکے گا۔خدا کے لئے پہلے میرا سر قلم کرو۔

اس لرزہ خیز منظر پر عالم قدس میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔شہنشاہ کونین ﷺ کلیجہ تھامے ہوئے مشیت کی ادا پر صابر و شاکر تھے۔سیدہ کی روح مچل مچل کر عرش الٰہی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ عالم گیتی کو تہ و بالا کر دے۔لیکن قدم قدم پر سرکار کی پرنم آنکھوں کا اشارہ انہیں روک رہا تھا۔

حیدر خیبر شکن اپنی تیغ ذوالفقار لئے ہوئے سرکار کی جنبش لب کے لئے منتظر تھے کہ آن واحد میں جفا شعاروں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں۔ روح الامین بال و پر گرائے دم بخود تھے۔

رضوان وکوثر و تسنیم کا ساغر لئے انتظار میں کھڑا تھا۔عالم برزخ ہلچل مچی ہوئی تھی۔ملکوت اعلیٰ پر سکتہ طاری تھا کہ ایک مرتبہ بجلی چمکی، ستارہ ٹوٹا اور فضا میں دو ننھی چیخیں بلند ہوئیں۔

مرکز عالم ہل گیا .... چشم فلک جھپک گئی .... ہوائیں رک گئیں .... دھارے تھم گئے اور دھرتی کا کلیجہ شق ہو گیا۔حیرت کا طلسم ٹوٹا تو امام مسلم کے یتیم بچوں کے کٹے ہوئے سر خون میں تڑپ رہے تھے اور لاشیں دریائے فرات کی لہروں کی گود میں ڈوبتی جا رہی تھی۔سلام ہو تم پر اے محمد و ابراہیم، اے امام مسلم کے راج دلارو تمہارے مقدس خون کی سرخی سے آج تک گلشن اسلام کی بہاروں کا سہاگ قائم ہے۔

خدائے غافر و قدیر تمہاری ننھی تربتوں پر شام و سحر رحمت و نور کی بارش برسائے

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

نوٹ: اس مضمون میں "معصوم" کا لفظ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہے جن معنوں میں شیعہ حضرات کے یہاں رائج ہے۔

جلوۂ زیبا

اس وقت کی بات ہے جب کہ سلطنت مغلیہ کا خورشید اقبال ڈوب چکا تھا اور سرحد سے لے کر مدراس کے ساحل تک سارا کشور ہند انگریزی اقتدار کے زیرنگیں تھا۔ لکھنؤ میں ایک انگریز کمشنر بحال کیا گیا۔ چونکہ اس وقت دفتری زبان فارسی تھی اس لئے کمشنر کو فارسی زبان سیکھنے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لئے مشہور فارسی دان ملاں سراج الدین کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ ملاجی روزانہ شام کو چار بجے انگریز کمشنر کو ٹیوشن پڑھانے آتے تھے۔ موصوف عصر اور مغرب کی نماز کمشنر صاحب کی کوٹھی ہی پر ادا کرتے تھے۔

کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ہزاروں لالہ رخوں اور زہرہ جمالوں کی کہانیاں اس کی ایک ایک ادا میں سمٹ آئی تھی۔ سرشار آنکھوں سے شراب کے پیمانے چھلکتے، مہتاب کی طرح درخشاں پیشانی ہر وقت موج نور میں غرق رہتی، چلتی تو فتنہ، حشر جگاتی، باتیں کرتی تو پھول جھڑتے، جمال و رعنائی اور حسن و دلکشی کا وہ ایک مجسمہ تھی کہ مغربی تہذیب کے گھرانے میں وہ ہر وقت پردے میں رہتی تھی۔ ایک تو ماں باپ کی اکلوتی بیٹی! اس پر مزاج میں نفاست، طبیعت میں لطافت اور ناز و نعمت کی زندگی سارے خاندان کی راج دلاری بن گئی تھی۔ سیرت خصلت کے اعتبار سے بھی وہ نہایت پاک طینت، نیک سرشت اور شریف الطبع لڑکی تھی۔ شرم و حیا، علم و ہنر، ذہانت و دانائی اور متانت و سنجیدگی میں دور دور اس کا کہیں جواب نہ تھا۔ سارا قبیلہ اس کے حسن اخلاق سے مسخر تھا۔ غیرت فطری ہی کا نتیجہ تھا کہ والدین کے اسرار کے باوجود کبھی وہ گرجا گھر نہیں جاتی تھی۔

سن شعور میں قدم رکھتے ہی اس نے باہر کی درسگاہ سے اپنا سلسلہ تعلیم منقطع کر لیا تھا اور اب گھر پر ہی شریف معلمات کے ذریعہ اس کی تعلیم کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں مہارت رکھنے والی معلمات اپنے وقت پر آتی تھیں اور سبق دے کر چلی جاتی تھیں۔ تدریس کا یہ سلسلہ صبح آٹھ بجے سے شام کے چار بجے تک جاری رہتا تھا۔

ملاجی کو آئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ کمشنر صاحب فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کر چکے تھے اور اب حضرت سعدی کی گلستان چل رہی تھی۔ کہتے ہیں ملاجی بہت خوش الحان قاری بھی تھے۔ جب مغرب کی نماز میں وہ جہر سے قرآن پڑھتے تو کمشنر صاحب پوری کوٹھی عالم قدس کے نغموں سے گونج اٹھتی تھی۔ ایک دن کمشنر صاحب کی صاحبزادی ٹھیک مغرب کے وقت اس کمرے کے قریب سے گزری جہاں ملاجی نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن کی آواز سن کر اس کے قدم اچانک رک گئے۔ چند ہی لمحے کے بعد دروازے کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن کے سحر جلال سے دل کے گھائل ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ آن واحد میں ایک طیب و طاہر روح تجلیات قرآنی کی بارش میں شرابور ہو گئی۔

زندگی میں پہلی بار اس نغمہ حیات سے اس کے کان آشنا ہوئے تھے۔ ایک نامعلوم کیف سے وہ بے خود ہو گئی۔ عالم اشتیاق میں پھر وہ آگے بڑھی اور پردے کی اوٹ سے ملاجی کو ایک نظر دیکھا۔ نماز کی ہیبت عبادت دیکھ کر وہ حیرت میں ڈوب گئی۔ ہاتھ باندھ کر ساکت و مئودب کھڑا رہنا پھر سرنگوں ہو جانا اور اس کے بعد ماتھا ٹیکنا عجز و نیاز کی یہ ادائیں، اس کی آنکھوں کے لئے اچنبھے سے کم نہیں تھیں۔ اب سے پہلے اس کی آنکھوں نے یہ روح پرور مناظر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جب تک ملاجی نماز پڑھتے رہے وہ تصویر حیرت بنی دیکھتی رہی۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد جب وہ واپس لوٹی تو جذبات کے سمندر میں ایک تلاطم سا تھا۔

دل از خود اندر سے کسی نامعلوم سمت کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس دن ساری رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ آیات قرآنی کا کیف اور نماز کی روحانی کشش ایک لمحے کے لئے بھی اس کے ذہن سے اوجھل نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ساری رات یہ سوچتی رہی کہ شیریں نغموں کی سحر طرازی مسلم، لیکن قرآنی نغمہ کا یہ اثر جس نے دل کے کشور کو تہ و بالا کر دیا ہے اسے صرف خوش الحان آواز کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی ایسی حقیقت بول رہی ہے جس کا رشتہ روح انسانی کے ساتھ منسلک ہے۔ پھر اگر نماز نشست و برخاست ہی کا نام ہے تو پھر میرے دل کو کیا ہو گیا ہے؟ قیام و قعود کے سوا انسانوں کی زندگی میں کیا ہے۔ پھر دنیا میں کتنے دل ہیں جو کسی کی نشست و برخاست پر عاشق ہوئے ہیں۔ اگر واقعتاً نماز کی یہی حقیقت ہے تو دل دیوانہ کی لغزش میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

پھر سوچتی ہے کہ اتنی آسانی سے دل کی تقصیر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو نہ ہو یہ نماز بھی اس عالم کی چیز ہے جہاں انسانی روح کا مزاج ڈھلتا ہے اور جہاں سے معنوی حیات کے چشموں کا دھارا پھوٹتا ہے۔

سوچتے سوچتے سحر ہو گئی لیکن روحانی اضطراب کی آگ ویسے ہی سلگتی رہی۔ اپنا حال خود اپنی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ صبح ہوئی دن نکلا۔ لیکن آج کتابوں میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ سارا دن شام کے انتظار میں کٹا۔

حسب معمول عصر کے وقت ملاجی ٹیوشن پڑھانے کے لئے تشریف لائے۔ جوں ہی ان کے قدموں کی آہٹ ملی فرط شوق سے صاحبزادی کا دل اچھلنے لگا۔ بڑی مشکل سے سورج ڈوبا اور ملاجی مغرب کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔

شہزادی قبل از وقت ہی پس پردہ کان لگائے کھڑی تھی۔ قرآن کی آواز کان میں پڑتے ہی دل کا حال بدلنے لگا۔ روح نغمہ جاوید کے کیف میں ڈوب گئی۔ آج دل ہی متاثر نہیں تھا بلکہ آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ کئی بار رومال سے بہتے ہوئے آنسوں خشک کئے لیکن چشمہ سیال کی طرح اس وقت تک سیلاب امنڈتا رہا جب تک ملاجی نے نماز ختم نہیں کر لی۔

اسی عالم کرب میں کئی مہینے گزر گئے۔ دل کے شور محشر سے کوئی واقف نہ تھا۔ ہر روز مغرب کی نماز کے وقت پردہ سے لگا ہوا جذبات کے تلاطم کا جو طوفان امنڈتا تھا خود ملاجی کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ اب کئی مہینے کے عرصے میں مسیحی گھرانے کی دوشیزہ نامعلوم طور پر اسلام سے بہت قریب ہو گئی تھی۔ نماز و قرآن کے عشق نے اب اسے اس راستے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا جو کسی بھی وارفتہ حال مسافر کو ذرا سی میں مدینے تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دل اس رسول اکرم ﷺ کی غائبانہ عقیدت سے سرشار ہوتا جا رہا ہے جس نے دنیا کو قرآن اور نماز جیسی نعمت لازوال سے بہرہ اندوز کیا۔

اکثر رات کی تنہائی میں سوچا کرتی تھی کہ جس رسول کے لائے ہوئے پیغام میں یہ کشش ہے خود رسول میں کتنی کشش ہوگی۔ بلاوجہ عرب کے صحرانشین اس پر شیفتہ نہیں تھے۔ اس کی زیبائی کا یہی جلوہ کیا کم ہے کہ آج اس کے نادیدہ عشاق سے ساری دنیا بھر گئی ہے۔ یقیناً محمد عربی ﷺ عظمت و راستی کی ایک سراپا حقیقت کا دوسرا نام ہے۔

ناز کی پلی ہوئی لاڈلی بیٹی روزانہ صبح کو نئے کپڑے زیب تن کر کے باپ کو آداب کیا کرتی تھی۔ باپ کے دل کی شادابی اور روح کی آسودگی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ آج وہ بڑی سج دھج سے آداب کرنے آئی تھی۔ آداب سے فارغ ہو کر مچلتے ہوئے ناز میں کہا۔

"فادر ایک درخواست پیش کروں؟ قبول فرمائیے گا۔"

بیٹی کے ان الفاظ پر باپ کی روح جھوم اٹھی۔ شفقت پدری کا جذبہ پھوٹ پڑا۔ فرط محبت میں بے قابو ہو کر جواب دیا۔

"میری لخت جگر! ساری زندگی یہ آرزو رہ گئی کہ دوسرے بچوں کی طرح تم بھی کچھ فرمائش کرو اور میں اسے پوری کر کے تمہاری مسرتوں کا تماشہ دیکھوں۔ لیکن نہ جانے تمہاری افتاد طبع کیسی واقع ہوئی ہے کہ یہ آرزو تشنہ ہی رہی۔ اب جبکہ زندگی میں پہلی بار اپنے ارمان کے اظہار کے لئے تمہاری زبان کھلی ہے تو کیا اب یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے کہ میں اسے قبول کروں گا یا نہیں؟ تمہارے علاوہ کون میری زندگی کی امیدوں کا مرکز ہے جس کے لئے کوئی بات اٹھا رکھوں گا۔"

بیٹی نے نگاہ نیچی کئے، رکتے جھجکتے ہوئے بڑی مشکل سے اتنے الفاظ ادا کئے مجھے اجازت دیجئے کہ ملاجی سے میں فارسی کی تعلیم حاصل کروں۔"

باپ نے یہ سن کر ایک قہقہہ لگایا اور بیٹی کو تھپکاتے ہوئے کہا۔

"اتنی ذرا سی بات کے لئے تم نے اتنی زبردست تمہید باندھی، میرا تو گمان تھا کہ تم کوئی بہت اہم فرمائش کرنے والی ہو۔ تمہیں اجازت ہی نہیں بلکہ تحسین و آفرین بھی ہے کہ تمہارے اندر حصول علم کا شوق جاگ اٹھا ہے۔"

دوسرے دن ملاجی بعد نماز مغرب صاحبزادی کو بھی فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ محنت و ذہانت نے تھوڑے ہی عرصے میں فارسی زبان سے اچھی طرح روشناس کر دیا۔ دوران تعلیم ہی میں ایک دن صاحبزادی نے ملاجی سے کہا۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پیغمبر اسلام کی سیرت پر مسلمان مصنفین کی چند کتابیں میرے لئے فراہم کر دیجئے۔"

ملاجی کو اس عجیب و غریب فرمائش پر حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکے۔

دوسرے دن چند مستند اور مفید کتابیں لا کر حوالے کر گئے۔

نماز و قرآن والے پیغمبر کی زندگی سے واقف ہونے کا موقع حاصل کر کے صاحبزادی کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ جذبہ شوق کے عالم میں کتاب کا پہلا ورق کھولا اور کائنات کی سب سے معظم ترین ہستی کا مطالعہ شروع کیا۔

ورق ورق پر فضل و رحمت، جلال و جمال، عظمت و زیبائی، طہارت و تقدس، صبر و تحمل، جود و کرم، زہد و عبادت، فقر و ایثار، علم و حکمت، اعجاز و توانائی، قدرت و اختیار قرب الٰہی کی جلوہ آرائی اور آسمان شوکت و اقتدار کے مناظر دیکھ کر دل کی دنیا جگمگا اٹھی، فرط شوق میں پلکوں پہ موتی کے قطرے جھلملانے لگے۔ لالہ کی پنکھڑی جیسے ہونٹ حرکت میں آئے اور ایک ننھی سی آواز فضا میں گونجی۔

"محمد کے خداوندا! تو گواہ رہنا کہ مسیحی مذہب سے نکل کر تجھ اور تیرے آخری رسول ﷺ پر ایمان لاتی ہوں۔ اے قادر و توانا معبودا! تیرے محبوب پیغمبر کا واسطہ، میری آنے والی زندگی کو کفر کی یلغار سے محفوظ رکھنا۔"

دل میں عشق محمدی کا چراغ جل چکا تھا۔ اب ایمان بالغیب کی ایک نئی دنیا نظر کے سامنے تھی۔ حیات سرور کونین ﷺ کی 63 سالہ تاریخ ذہن میں گھوم رہی تھی، سرکار کا جسم، ان کا نورانی پیکر، دلربا چہرا، سرگیں آنکھیں، عطر بار ساتی عنبریں زلفیں، موجہ نور میں لہراتا ہوا عارض تاباں جمال سراپا کا ایک نقش و نگار تصورات کی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ پچھلے پہر جونہی آنکھ لگی، قسمت بیدار نے آواز دی، رحمت نور اور محبت و دلکشی کی جو دنیا تصور میں گھوم رہی تھی اب وہ نظر کے سامنے تھی۔ کوٹھی کے قریب ہی ایک مسجد تھی، جیسے ہی موذن نے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ اور اشھد ان محمد رسول اللہ کا کلمہ فضا

میں نشر کیا، آنکھ کھل گئی۔

کلمہء اسلام سن کر دل بے تاب ہوگیا، ایمان کی امنگیں جاگ اٹھیں۔ آج چہرہ بشاشت سے کھلا جا رہا تھا۔ کونین کی ارجمندی بال بال سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک لالہ رخ حسینہ کا اپنا ہی جمال کیا کم تھا کہ وہ چشمہ نور میں غوطہ لگا کر آ گئی تھی۔ اب تو گل کدہء فردوش کی حور معلوم ہو رہی تھی۔ فرط بندگی سے چہرے پر نظر جمانا مشکل تھا۔

حسن و دل کشی کی یہ نمایاں تجلی دیکھ کر ماں باپ کو بھی حیرت ضرور تھی لیکن وہ اسے حضرت مریم کی عقیدت کا فیضان سمجھ رہے تھے۔ اس دن کافی انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد ملاجی تشریف لائے۔ نماز مغرب سے فراغت کے بعد صاحبزادی پڑھنے کے لئے حاضر ہوئی۔ جونہی چہرے پر نظر پڑی ملاجی کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

صاحبزادی نے کہا، حیرت نہ کیجئے مجھے کلمہ پڑھا کر میرے اسلام پر گواہ بن جایئے اور دیکھئے میں نے اپنا نام فاطمہ رکھ لیا ہے آئندہ مجھے اسی نام سے یاد کیجئے گا۔ ملاجی کمزور دل آدمی تھے۔ بڑھاپے میں کمشنر صاحب کو پڑھانے کا جو موقع مل گیا تھا اسے وہ بہت غنیمت سمجھتے تھے۔ پھر صاحبزادی کے حالات سے بھی بے خبر تھے۔ لرزتے ہوئے صاحبزادی کو جواب دیا۔

"دل کا مسلمان ہو جانا خدا کے تئیں نجات کے لئے کافی ہے صاحبزادی! نہ ابھی اپنے اسلام کا آپ اعلان کریں۔ جب بھی فلاح واخروی کا استحقاق کہیں نہ جائے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کو کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل کرلوں اور اس کی اطلاع کمشنر صاحب کو ہوگئی تو ہم پر بھی وبال آئے گا اور آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

صاحبزادی ملاجی کی کمزوریوں سے واقف تھی۔ یہ جواب سن کر خاموش ہوگئی۔

فارسی کی تعلیم ختم ہوجانے کے بعد فاطمہ نے قرآن مجید کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ملاجی کی آمد و رفت کا سلسلہ وہ منقطع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے توقع تھی کہ مستقبل کی کوئی ضرورت بھی ان سے متعلق ہوسکتی ہے۔ اب فاطمہ گھر والوں کی نظروں سے چھپ چھپا کر نماز پڑھنے لگی تھی۔ صبح کے وقت قرآن کی تلاوت بھی کیا کرتی تھی۔ چونکہ اس کے کمرے میں ابتداء ہی سے کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اس لئے اس کی زندگی کا اکثر حصہ صیغہء راز میں تھا۔ دل کے خاموش انقلاب کی گو والدین کو خبر نہیں تھی لیکن باطن کی تطہیر اور روحانی تقدیس کا اثر نا معلوم طور پر اس کے گردوپیش میں نمایاں تھا۔ خاندان کے دلوں میں صرف اس کی محبت و شفقت ہی کا نہیں توقیر و احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ اس کی شخصیت کا اثر بغیر کسی ظاہری سبب کے لوگوں کے تحت الشعور پر چھاتا جا رہا تھا۔ وہ رات کی تنہائی میں اپنی خواب گواہ کے اندر کیا کرتی تھی، اس کی خبر کسی کو بھی نا تھی۔ لیکن ملاجی کے ذریعے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو سرور کونین ﷺ کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کا بہت زیادہ اہتمام کرتی تھی۔

سب کے سوجانے کے بعد اپنا کمرہ بند کر کے عشاء کی نماز پڑھتی اس کے بعد سوجاتی، پھر تہجد کے لئے اٹھتی اور تا دم سحر گریہ و مناجات، تسبیح و تحلیل اور درود و سلام میں مشغول رہتی۔ اس کے دل کا آئینہ اتنا شفاف ہوگیا تھا کہ عالم الغیب کے انوار و اسرار کا وہ کھلی آنکھوں سے تماشا دیکھا کرتی تھی۔ اب آہستہ آہستہ اس کی زندگی کا رشتہ دوسرے مشاغل سے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ گھنٹوں وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اس کی روح کی لطافت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کئی کئی دن بغیر کسی ضعف و نقاہت کے وہ روزے میں گزار دیتی تھی۔

ایک دن ملاجی جب شام کے وقت پڑھانے آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ صاحبزادی آج کچھ علیل ہیں اس لئے وہ نہیں پڑھیں گی۔ جوں ہی واپس جانا چاہتے تھے کہ آیا نے اطلاع دی صاحبزادی اپنے حجرہء خاص میں آپ کو بلا رہی ہیں۔ ملاجی ہمت کر کے کمرے میں داخل ہوئے، دیکھا تو فاطمہ بستر پر دراز تھی، قدم کی آہٹ پاتے اٹھ کے بیٹھ گئی اور نہایت سرگوشی کے ساتھ ملاجی سے کہا۔

آپ کے احسانات سے میری گردن ہمیشہ بوجھل رہے گی کہ آپ کی وجہ سے مجھے ایمان نصیب ہوا اور حبیب ﷺ کی دولت عشق سے میری زندگی کیف و سرور کے ایک نئے عالم میں داخل ہوئی۔ اب میں روحانی قرب کی منزل میں ہوں جہاں ایک لمحہ کے لئے بھی میرے سرکار آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔

آثار و قرائن شہادت دے رہے ہیں کہ اب میں حیات کے آخری لمحے سے گزر رہی ہوں۔ عالم قدس کا پیامی جلد ہی آنے والا ہے۔ میں بھی اس کی منتظر آنکھوں سے راہ دیکھ رہی ہوں۔ رخت سفر باندھ کر میں نے اپنی تیاری مکمل کر لی ہے۔ اپنے انجام کی فیروز بختی پر دل اتنا مطمئن ہے کہ مسکراتے ہوئے پیک اجل کا خیر مقدم کروں گی۔ صرف ایک آرزو ہے جس کے لئے میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی ہے۔ اگر بعد مرگ میری وصیت پوری کرنے کا اگر یقین دلائیں تو عرض کروں۔ اتنا کہتے کہتے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ملاجی بھی اپنے تئیں سنبھال نہ سکے اور وہ بھی اشک بار ہو گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"خدا آپ کی زندگی کا اقبال بڑھائے۔ آپ کی عمر کی برکتوں کو دراز کرے۔ نصیب دشمناں مرگ ناگہاں کی خبر سننے کے لئے ہم ہرگز تیار نہیں ہیں۔ لیکن علم الٰہی میں اگر یہی مقدر ہو چکا ہے تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آپ اپنی آرزو کا برملا اظہار فرمائیے میں اس کی تعمیل کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔"

صاحبزادی نے رازدارنہ لب ولہجہ میں کہا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے قبول اسلام کی خبر گھر والوں کے علم میں نہیں ہے۔ وہ تاہنوز مجھے اپنے آبائی مذہب کا پیرو سمجھ رہے ہیں۔ گو میں نے آج تک گرجا میں قدم نہیں رکھا ہے لیکن وہ اسے میری غیرت حیا پر محمول کرتے ہیں۔ اس سے مجھے یقین ہے کہ وہ بعد مرگ میری تجہیز وتکفین مسیحی مذہب کے مطابق کریں گے اور مسیحی میں میرا مدفن بنائیں گے۔

"میں نہیں چاہتی کہ اپنا اسلام ظاہر کر کے میں آپ کو اور یہاں کے دوسرے مسلمانوں کو آفات کا نشانہ بناؤں۔ اس لئے میرے مودبانہ گذارش ہے کہ بعد مرگ جب وہ مجھے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیں تو رات کے کسی حصے میں میرا تابوت نکال کر اسلامی طریقے کے مطابق مجھے کسی مسلمان قبرستان میں دفن کر دیں تاکہ اہل ایمان کے جوار میں رہ کر میری روح کو دائمی سکون حاصل ہو۔"

ملاجی نے برستی ہوئی آنکھوں سے وصیت کی تعمیل کا یقین دلایا۔ فاطمہ نے آخری سلام کرتے ہوئے کہا کہ اب قیامت ہی کے دن فاتح محشر کے لواء الحمد کے نیچے ہماری آپ کی ملاقات ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے ملاجی کو رخصت کیا۔

صبح کے وقت سارے شہر میں کہرام مچا ہوا تھا کہ کمشنر صاحب کی لاڈلی بیٹی کی وفات کی خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اقارب واحباب اور غم گساروں کے ہجوم سے کوٹھی میں تل رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ اس اچانک حادثہ سے سارے خاندان پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔ ماں باپ کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ شدت الم سے وہ پاگل ہو گئے تھے۔ اکلوتی بیٹی کی مرگ ناگہاں ان کے لئے قیامت سے کم نہیں تھی۔ ماتم وفغاں کے شور میں دوپہر کے وقت جنازہ اٹھا۔ عیسائی مذہب کے رسوم کے مطابق لاش ایک تابوت میں بند کر دی گئی۔ جنازہ کے ساتھ ساتھ ملاجی بادیدۂ پرنم چل رہے تھے۔ عیسائی قبرستان میں پہنچ کر تابوت کو ایک پختہ قبر میں اتارا گیا اور اوپر سے سنگ مرمر کی سل رکھ کر قبر کا کھلا ہوا حصہ بند کر دیا گیا۔ دفن کی آخری رسم ادا ہو جانے کے بعد لوگ قبرستان سے واپس لوٹ گئے۔ ملاجی اپنے ذہن میں قبر کا نشان اچھی طرح محفوظ کر کے سب کے بعد واپس ہوئے۔ سیدھے کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہنچے اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کلمۂ تعزیت کہہ کر گھر واپس چلے آئے۔

آج نہیں پوری رازداری کے ساتھ ایک اہم فرض انجام دینا تھا۔ اقدام اتنا سنگین تھا کہ ہر قدم پر خطرات کے اندیشے راہ میں حائل تھے۔ رات کی تنہائی میں لوگوں کی نظر سے بچ کر عیسائی قبرستان سے کسی لاش کو منتقل کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ حالات کی نزاکت سوچ کر ملاجی کانپ اٹھے۔ لیکن ایک مرنے والی سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل بھی ضروری تھی۔ اسلام کا رشتہ اخلاص بھی اس امر کا متقاضی تھا کہ جیسے بھی ہو اس فرض کو انجام دیا جائے۔

ملاجی کا ضمیر اندر سے جاگ اٹھا تھا۔ آخر بسم اللہ پڑھ کر انہوں نے اس مہم کا آغاز کر ہی دیا۔ اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کو گھر لے گئے اور شروع سے آخر تک ان سے سارا ماجرا بیان کیا۔ واقعہ سن کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ انہوں نے کف افسوس ملتے ہوئے ملاجی سے کہا ....

صد حیف کہ اسی شہر میں اسلام کی فتح وصداقت کا اتنا عظیم الشان واقعہ رونما ہوا اور آپ نے کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب جس طرح بھی ہو آج ہی شب وعدے کی تکمیل ضروری ہے۔

ٹھیک اس وقت جب کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا سناٹا طاری تھا۔ ملاجی کے علاوہ چار آدمی عیسائیوں کے قبرستان میں داخل ہوئے۔ یہ اقدام انتہائی خطرناک تھا۔ لیکن اسلامی ہمدردی کے جوش میں خطرے کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ملاجی کی راہنمائی میں چار آدمی قبر تک پہنچے۔ سنگ مرمر کی سل ہٹائی اور قبر میں اتر کر تابوت کو باہر نکالا۔

جوں ہی لاش نکالنے کے لئے تابوت کا تختہ کھولا، ملاجی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لوگ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ بڑی مشکل سے حواس پر قابو پانے کے بعد لوگوں کو بتایا کہ لاش بدل گئی ہے۔ ہم لوگوں نے غلطی سے دوسری قبر کا تابوت نکال لیا ہے۔ یہ لاش کسی اور کی ہے۔ لیکن ملاجی نے پھر غور سے دیکھا تو قبر کا نشان وہی تھا جسے دن کے وقت دیکھ گئے تھے۔ قبر کا نیا پن بھی بتا رہا تھا کہ یہ بالکل تازہ قبر ہے۔ اب یہ گتھی کسی سے نہیں سلجھ رہی تھی کہ کمشنر صاحب کی بیٹی کے تابوت میں دوسرے کی لاش کیسے آگئی اور خود اسکی لاش کہاں چلی گئی۔

صورت حال کی تفتیش کے لئے چاروں آدمی لاش کی طرف بڑھے اور جھک کر دیکھ ہی رہے تھے کہ ان میں سے ایک شخص بیساختہ چیخ پڑا......

یہ لاش تو بارہ بنکی کے مرزاجی کی ہے میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔

اس واقعہ سے ان لوگوں پر دل ہلا دینے والی عجیب قسم کی ہیبت طاری ہو گئی۔ دہشت سے کانپنے لگے اور فوراً ہی تابوت کا منہ بند کر کے اسے قبر میں اتارا اور اوپر سے سنگ مرمر کی سل رکھ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک سب پر سکتہ طاری رہا۔ کئی گھنٹے کے بعد جب حواس بجا ہوئے تو ملاجی نے کہا کہ عالم برزخ کے یہ تصرفات ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مشیت الٰہی کے راز کو سمجھنا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ جب کمشنر صاحب کی بیٹی کی قبر میں بارہ بنکی کے مرزاجی کی لاش ہے تو یقیناً مرزاجی کی قبر میں کمشنر صاحب کی بیٹی کی لاش ہوگی۔

لوگوں نے کہا .... " یہ بات قرین قیاس ضرور ہے لیکن بہتر ہوتا کہ حقیقت کا سراغ لگانے کے لئے ہم بارہ بنکی چلے چلیں اور مرزاجی کی قبر کھود کر دیکھ لیں۔"

یہ بات طے کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔ بستر پر پہنچنے کے بعد ہر شخص کے ذہن میں یہی عجیب وغریب واقعہ گھوم رہا تھا۔

دوسرے دن ملاجی اپنے چاروں ساتھیوں کے ہمراہ بارہ بنکی پہنچ گئے۔ سیدھے مرزاجی کی کوٹھی کا رخ کیا۔ دروازے پر آدمیوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر پتا چلا کہ پرسوں مرزاجی کا انتقال ہوگیا ہے آج ان کا تیجا ہے۔ اظہار افسوس اور رسم تعزیت ادا کرنے کے بعد یہ لوگ بھی ایصال ثواب کی مجلس میں شریک ہوگئے۔ فارغ ہونے کے بعد خواہش ظاہر کی کہ ہمیں قبر تک پہنچا دیا جائے تاکہ ان کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر کم از کم حق دوستی تو ادا کردیں۔

ایک شخص کی رہنمائی میں قبرستان پہنچ کر فاتحہ پڑھی اور قبر کا نشان اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹ آئے۔ سارا دن مرزاجی کے حالات معلوم کرتے رہے۔ پتا چلا کہ اس علاقے کے وہ ایک چھوٹے موٹے نواب تھے۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ اور انگریزوں کے غایت درجہ بہی خواہ تھے۔ شام وسحر کی زندگی عیش وعشرت میں ڈوبی رہتی تھی۔ گھر کا سارا ماحول انگریزی تمدن میں غرق تھا۔

شام کے وقت کھانے سے فارغ ہو کر اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ سارے شہر پر نیند کا سناٹا طاری ہوجائے۔ خدا خدا کر کے جب آدھی سے زیادہ رات ڈھل گئی تو پانچوں آدمی اٹھے اور دبے پاؤں قبرستان کی طرف چل پڑے۔ خطرناک اقدام کی دہشت سے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ لیکن حقیقت حال کی جستجو کے جنون میں آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ قبرستان میں داخل ہوگئے۔ اپنے حافظے کی راہنمائی میں آسانی سے مرزاجی کی قبر تک پہنچ گئے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قبر کی مٹی ہٹانی شروع کی۔ کافی دیر کے بعد تختہ نظر آیا۔ اب ہمت کر کے دو شخص قبر میں اترے اور ایک ایک کر کے تختہ ہٹایا۔ اب سفید رنگ کا کفن سامنے نظر آرہا تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد بھی کفن کھولنے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ سہا جارہا تھا کہ معلوم نہیں کفن کا منہ کھولنے کے بعد کیا نقشہ نظر آئے۔ کافی جرات سے کام لے کر ایک شخص نے پائنتی کے تختے پر کھڑے ہو کر چہرے سے کفن کا نقاب الٹ دیا۔ جونہی چہرے پر نظر پڑی دہشت سے لوگوں کا خون سوکھ گیا۔ مرزاجی کی لاش کے بجائے قبر میں ایک عرب کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ڈیل ڈول اور چہرے بشرے سے وہ عرب ہی معلوم ہورہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ حیرت میں ڈوب گئے۔ جلد جلد کفن کو درست کیا۔ تختے لگائے اور مٹی برابر کر کے قبرستان سے باہر نکل آئے، مرے ہیبت کے سانس پھول رہی تھی۔ قیام گاہ پر پہنچ کر ایک ہولناک سکتے کی کیفیت سب پر طاری تھی۔ قدرت کا یہ عجیب و غریب تماشہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کمشنر کی لڑکی کی لاش کہاں غائب ہوگئی۔

نیند کچھ زیادہ گہری نہیں تھی صرف پلک جھپکتی تھی کہ ملاجی نے ایک نہایت حسین ودلکش خواب دیکھا۔ وہی کمشنر کی بیٹی فاطمہ حوران خلد کے جھرمٹ میں سامنے کھڑی مسکرارہی ہے۔ قریب آکر اس نے سلام کیا۔ عالم برزخ کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس نے کہا...... میری روح جب عالم بالا کی طرف لائی گئی تو رحمت الٰہی نے میری توقیر واعزاز کا اہتمام فرمایا۔ حوران خلد نے مجھے چشمہ نور میں غوطہ دیا میں نکھر گئی۔ میرے حسن کی چاندنی جنت کے میدانوں میں ہر طرف بکھر گئی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ عالم برزخ میں ہر طرف شوکت محمدی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ سارے انبیاء مرسلین ان کے دربار کے نیازمند حاضر باش ہیں۔

جب میری روح ان کی بارگاہ میں لائی گئی تو تجلیات کی تیز بارش سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ان کی ناز برداررحمتوں نے میری ہستی کا فروغ بڑھادیا۔ حکم ہوا کہ میری لاش طیبہ کی سرزمین پر منتقل کردی جائے۔ جس دن میری لاش عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کی گئی تھی اسی دن تین لاشیں اپنی اپنی قبروں سے منتقل کی گئیں۔

مدینے میں ایک عرب سوداگر جسے ہندوستان بے حد پسند تھا، عرصہ قدیم سے اس کی آرزو تھی کہ وہ یہاں بود باش اختیار کرے۔ جب مرگیا اور لوگوں نے اس کی لاش کو جنت البقیع میں دفن کیا تو عالم برزخ کے کارپردازوں کو حکم ہوا کہ مدینے میں رہ کر ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کی آرزو رکھتا تھا۔ مدینے کی سرزمین اس کی نگاہ میں عزیز نہیں تھی اس لئے اس کی لاش ہندوستان منتقل کردیا جائے۔ اسے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دوسری لاش بارہ بنکی کے مرزاجی کی تھی۔ عیسائیوں کے ساتھ غایت درجہ الف کی وجہ سے وہ زندگی بھر انگلستان جانے کی تمنا میں مرتے رہے۔ بھول کر بھی انہیں دیار عرب کا خیال نہیں آیا۔ جب ان کی لاش دفن کی گئی تو حکم ہوا اسلام سے بیگانہ ہو کر اس نے جس عیسائی قوم کے ساتھ زندگی کے دن گزارے ہیں اسے اسی قوم کے قبرستان میں منتقل کردیا جائے۔ اموات مسلمین کے ساتھ اسے ہرگز نہیں رکھا جاسکتا۔ اپنا سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے فاطمہ نے خواب ہی میں کہا کہ فرمان غیب کے مطابق مدینہ کے احاطہ نور سے عرب کی لاش بارہ بنکی کے قبرستان میں منتقل میں منتقل کی گئی اور اس کی خالی شدہ قبر میں لکھنو سے میری لاش پہنچادی گئی اور مرزاجی کی لاش کو عیسائیوں کے قبرستان میں میری جگہ پر منتقل کردیا گیا۔

فاطمہ نے کہا کہ عالم برزخ کے ان واقعات پر حیرت کی وجہ نہیں۔ موت کے بعد انسان کے اعتقاد اور عمل کا اثر کی برزخی زندگی پر یقیناً پڑتا ہے۔ یہاں پر ہر آن اس طرح کے مناظر نگاہوں سے گزر رہے ہیں۔ میں واضح طور پر محسوس کررہی ہوں کہ اس عالم میں کسی عمل کو بھی اعزاز حاصل نہیں ہے جو عشق رسول کو ہے۔ میری روحانی آسائش وتکریم کی ساری ارجمندی عشق رسول ہی کا صدقہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رحمت وکرم کی تسخیر کے لئے اس سے زیادہ زود اثر نسخہ بنی نوع انسان کو اب تک میسر نہیں آسکا ہے۔ کاش خاکدان گیتی کے رہنے والے اس راز کو سمجھ سکتے۔ اتنا کہنے کے بعد فاطمہ کی روح نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ ملاجی کی جب آنکھ کھلی تو ان پر ایک رقت انگیز کیفیت طاری تھی۔ بار بار وہ سینہ پیٹتے تھے کہ ہائے میں نے فاطمہ کی قدر نہیں

پہچانی۔

اس خواب نے غفلت کا سارا خمار اتار دیا۔ جس نے سنا دم بخود ہو کے رہ گیا۔ برزخ کے حالات پر لوگوں کا یقین تازہ ہو گیا۔ قبر کے بھیانک انجام سے لوگ ڈرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان پانچوں آدمیوں پر چشم دید واقعات کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ ان سب کی زندگی اچانک بدل گئی۔ وہ ترک دنیا کر کے یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔

انعام شکست

جنید نامی خلیفہ بغداد کا درباری پہلوان مملکت کی ناک کا بال تھا۔ وقت کے بڑے بڑے سورما اس کی طاقت اور فن کا لوہا مانتے تھے۔ ڈیل ڈول اور قد وقامت کے لحاظ سے بھی وہ دیکھنے والوں کے لئے ایک تماشا تھا۔ شخصیت کے رعب و دبدبے کا یہ حال تھا کہ وقت کا بڑے سے بڑا جیوٹ بھی نظر ملانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ کمال فن کی غیر معمولی شہرت نقطۂ انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ ساری مملکت میں جنید کا کوئی مقابل و حریف نہیں رہ گیا تھا۔ اب جنید کا مصرف سوا اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بغداد کی شاہانہ سطوت کا ایک واضح نشان تھا۔ دربار شاہی میں جنید کے لئے اعزاز کی ایک جگہ مخصوص تھی جہاں وہ بن سنور کر کلغی لگائے خلیفہ کی دائیں جانب بیٹھا کرتا تھا۔

دربار لگا ہوا ...... اراکین سلطنت اپنی اپنی کرسیوں پر فروکش تھے .... جنید بھی اپنے مخصوص لباس میں زینت دربار تھے کہ ایک چوبدار آ کر اطلاع دی۔

صحن کے دروازے پر ایک لاغر و نیم جان شخص کھڑا ہے۔ صورت و شکل کی پراگندگی اور لباس و پیراہن کی شکستگی سے وہ ایک فقیر معلوم ہوتا ہے۔ ضعف و نقاہت سے قدم ڈگمگاتے ہیں، زمین پر کھڑا رہنا مشکل ہے لیکن اس کی آواز کے تیور اور پیشانی کی شکن سے فاتحانہ کردار کی شان ٹپکتی ہے۔

آج صبح سے وہ برابر اصرار کر رہا ہے کہ میرا چیلنج جنید تک پہنچا دو میں اس سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ قلعہ کے پاسبان ہر چند اسے سمجھاتے ہیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات مت کرو۔ جس کی ایک پھونک سے تم اڑ سکتے ہو اس سے کشتی لڑنے کا خواب پاگل پن ہے۔ لیکن وہ بضد ہے کہ اس کا پیغام دربار شاہی تک پہنچا دیا جائے۔

چوبدار کی زبانی یہ عجیب و غریب خبر سن کر اہل دربار کو اس آنے والے اجنبی شخص سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ خلیفہ نے حکم دیا اسے حاضر کیا جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد چوبدار اسے ہمراہ لئے ہوئے حاضر ہوا، اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے، چہرے پر ہوائی اڑ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ دربار میں آ کر کھڑا ہوا۔

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ وزیر نے دریافت کیا۔

"جنید سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔" اجنبی نے جواب دیا۔

کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جنید کا نام سن کر بڑے بڑے زور آوروں کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ ساری ریاست میں اب ان کا کوئی مد مقابل نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی مضحکہ خیز بات کے لئے اصرار مت کرو جو دماغی جنون میں متہم کرنے کے علاوہ تمہاتے لئے باعث ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔ وزیر نے فہمائش کے انداز میں کہا۔

جنید کی شہرت ہی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ اسی اعتقاد موہوم کی میں تردید کرنا چاہتا ہوں کہ ساری ریاست میں جنید کا کوئی مد مقابل نہیں رہ گیا ہے۔

قد وقامت کا شکوہ اور بازوؤں کا کس بل ہی فتح و شکست کا معیار نہیں ہے۔ فن کی ذہانت بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اطمینان رکھیے! میرا دماغی توازن اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ سود و زیاں سمجھانے کے لئے مجھے ناصح کی ضرورت نہیں ہے، انجام کا سارا نقشہ میری نظر کے سامنے ہے۔ اب غیر متعلق بحثوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے اثبات و نفی میں جواب دیا جائے۔" اجنبی شخص نے فاتحانہ تیور کے ساتھ جواب دیا۔

اجنبی شخص کی جرات گفتار پر سارا دربار دم بخود ہو کے رہ گیا۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ شخص دماغی جنون میں متہم کئے جانے کے قابل ہے۔

دانشوروں کی طرح اس کا انداز گفتگو یقیناً کسی پر اسرار شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ظاہری بے مائیگی کیا ساتھ کشور کشا بہادروں جیسے کردار کے پیچھے ہو نہ ہو کوئی مہارت فن کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔"

جنید بھی اجنبی شخص کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہزار تجسس کے بعد بھی اس کے سراپا فنی مہارت کی کوئی علامت نہیں مل رہی تھی۔ سخت حیران تھے کہ آخر کس چیز نے اسے اتنا جری بنا دیا ہے۔ مسئلہ بہت پیچیدہ بن گیا تھا اس لئے خلیفۃ المسلمین کے اشارے پر وزیر نے اہل دربار کی رائے دریافت کی۔

"سارا نشیب و فراز سمجھانے کے بعد بھی اگر یہ بضد ہے تو اس کا چیلنج منظور کر لیا جائے۔ انجام کا یہ خود ذمہ دار ہے۔ مقابلے میں شکست کھا گیا ہے تو یہ توقع کے عین مطابق ہو گی۔ اور اگر فتح یاب ہو گیا تو ایک پر اسرار شخصیت کے جوہر کمال سے پہلی بار دنیا کو روشناس کرانے کا فخر ہمیں حاصل ہو گا۔"

اہل دربار نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر تک بحث و تمحیص کے بعد بالآخر یہ بات طے پا گئی کہ اس کے چیلنج کو قبول

کرلیا جائے۔ خلیفہء وقت نے بھی اس قرارداد پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی۔ کشتی کے مقابلے کے لئے دربار شاہی سے مملکت میں اس کا اعلان کردیا جائے۔

اطمینان رکھا جائے..... میں وقت مقررہ پر دنگل میں حاضر ہوجاؤں۔ یہ کہتے ہوئے اجنبی شخص دربار سے رخصت ہوگیا۔

"اپنے زمانے میں جنید کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔" یہ یقین لوگوں کے دلوں میں اس طرح گھر کر چکا تھا کہ مقابلے کی تیاری کا ذکر جس نے بھی سنا دم بخود رہ گیا۔

ساری مملکت میں ہونے والے دنگل کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔ شاہراہوں پر، بازاروں میں، ہر جگہ یہی تذکرہ موضوع سخن بن گیا تھا۔ ہر شخص اس اجنبی مسافر کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں لوگوں میں گشت کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا "دیوانوں کے بھیس میں وہ ایک نہایت شاطر آدمی تھا اپنی چرب زبانی سے سب کو بے وقوف بنا گیا۔ اب وہ ہرگز پلٹ کر نہیں آسکتا، وہ اپنی ہلاکت کو کبھی دعوت نہیں دے گا"۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دربار خلافت کا ایک امیر پاگل آدمی کی جنون انگیز حرکتوں کا شکار ہوگیا۔ عقل کی سلامتی کے ساتھ اس طرح کا اقدام ناممکن ہے۔

اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ اسے شاطر اور پاگل سمجھنا غلط ہے۔ وہ فنی مہارت میں ایک پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ کسی پاگل کا دماغ اتنی گہرائی میں اتر کر نہیں سوچ سکتا۔ اس کے سراپا کی جن لوگوں نے تصویر کھینچی ہے وہ نہایت پرکشش اور والہانہ ہے۔ کسی شاطر آدمی کی شخصیت میں اس طرح کی روحانی جاذبیت نہیں ہوا کرتی۔

بہر حال ہوا کچھ ایسی چل گئی تھی کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ تاریخ جیسے جیسے قریب آتی جارہی تھی انتظار شوق کی آنچ تیز ہوتی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ اچنبھا لوگوں کو اس بات کا تھا کہ مقابلہ پہاڑ اور تنکے کے درمیان تھا۔ برس ہا برس کے بعد جنید کے کسی مقابل سے لوگوں کے کان آشنا ہوئے تھے۔ شور و ہنگامہ سے فضا اتنی بوجھل ہوگئی تھی کہ جنید بھی عالم تحیر میں کھوئے سے رہنے لگے۔ بڑی تیزی کے ساتھ اندر سے کوئی چیز انہیں بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دن بہ دن شاہی دربار کے قریبی حلقوں میں یہ چرچا عام ہوگیا تھا کہ اس بار کا مقابلہ اتنا پراسرار ہے کہ پہلے ہی سے جنید پر ایک نامعلوم ہیبت طاری ہوگئی ہے۔

اب مقابلے کی تاریخ قریب آگئی تھی۔ دور دراز ملکوں سے سیاحوں اور تماشائیوں کے قافلے بغداد میں اترنا شروع ہوگئے تھے۔ مملکت کی آبادیوں سے اونٹوں کی قطاروں کا سلسلہ ٹوٹتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی انسانوں کا انبوہ سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا دکھائی پڑتا تھا۔

اب وہ شام آگئی تھی جس کی صبح تاریخ کا ایک اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔ آفتاب ڈوبتے ڈوبتے کئی لاکھ آدمیوں کا ہجوم بغداد میں ہر طرف منڈلا رہا تھا۔ جنید کے لئے آج کی رات بہت پراسرار ہوگئی تھی۔

ساری رات بے چینی میں کروٹ بدلتے گزری۔ اپنے زمانے کا مانا ہوا سورما آج نامعلوم طور پر دل کے ہاتھوں ڈوبتا جارہا تھا۔ جس نے بڑے بڑے زور آوروں کا غرور پلک جھپکتے خاک میں ملا دیا تھا آج ایک نحیف و نزار انسان کے مقابلے میں وہ ہزار اندیشوں کا شکار ہوگیا تھا۔ دربار شاہی کے ناموس کے علاوہ اپنی عالمگیر شہرت کا سوال بار بار سامنے آرہا تھا۔ اس اجنبی شخص کے متعلق رہ رہ کر دل میں یہ خلش پیدا ہو رہی تھی کہ اس کے فاتحانہ تیور کے پیچھے کوئی نہ کوئی طاقت ضرور ہے۔ دل کے یقین کے آگے جسم کی ناتوانی کوئی چیز نہیں ہے۔ معنوی کمالات اور نادیدہ قوتوں کا کوئی مخفی جوہر ضرور اس کی پشت پناہی میں ہے ورنہ کسی تہی دست و بے مایہ انسان میں یہ جرأت کردار کبھی نہیں پیدا ہوسکتی۔ انہی پریشان خیالات کے ادھیڑبن میں ساری رات گزر گئی اور بغداد کی پہاڑیوں پر سحر کا اجالا پھیل گیا۔ صبح ہوتے ہی شہر کے سب سے وسیع میدان میں نمایاں جگہوں پر قبضہ کرنے کے لئے تماشائیوں کا ہجوم آہستہ آہستہ جمع ہونے لگا۔

بغداد کا سب سے وسیع میدان لاکھوں تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اکھاڑے کے حاشئے پر چاروں طرف نہایت قرینے سے کرسیاں بچھادی گئی تھیں۔ یہ شاہی خاندان، درباری معززین اور مملکت کے عمائدین کی نشست گاہ تھی۔ تمام آنے والے اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ چکے تھے۔ خلیفہ بغداد کی زرنگار کرسی ابھی تک خالی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد نقیبوں کی آواز گونجنے لگی۔ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ بادشاہ کی سواری آرہی تھی۔ درباری خدام سروں پر کلغیاں لگائے، کمر باندھے راستہ صاف کرنے میں مصروف ہوگئے۔ خدام و حشم کے ساتھ حضرت جنید بھی بادشاہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ سب آچکے تھے اب اس اجنبی شخص کا انتظار تھا جس نے چیلنج دے کر سارے علاقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

حضرت جنید کے طرفدار فاتحانہ خوشی کے جذبے میں مجمع کو یقین دلا رہے تھے کہ اس کا انتظار بے سود ہے اب وہ نہیں آئے گا۔ جنید سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں ہے۔ جنید کے تصور ہی بڑے بڑوں کا زہرہ پانی ہوجاتا ہے۔ ایک معمولی آدمی کی کیا بساط ہے کہ مقابلے کے لئے سامنے آسکے۔ بلاشبہ وہ پوری مملکت کو فریب میں مبتلا کرگیا ہے۔ اسے آنا ہوتا تو بہت پہلے اس میدان میں آجاتا۔

اس کی بات ابھی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ درباری حلقون میں سے ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا "میں اعتراف کرتا ہوں کہ حکومت نہایت سادہ لوحی کے ساتھ ایک گہری سازش کا شکار ہوگئی ہے۔ یہ اقدام دانش مندی کے قطعی خلاف ہوا کہ محض ایک گمنام شخص کی بات پر مختلف ملکوں کے کئی لاکھ انسانوں کی

بھیڑ جمع کردی گئی۔ چکمہ دے کر نکل جانے والے اس راہ گیر کو اگر حکومت گرفتار بھی کرنا چاہے تو بغیر نام و نشاں کے کیسے گرفتار کرے گی۔

اس میدان میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو غائبانہ طور پر اس اجنبی شخص کے حامی تھے۔ نامعلوم طور پر ان کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ موجودہ صورت حال سے ان کے چہروں پر افسردگی کا نشان واضح ہونے لگا۔ ناامیدی کے عالم میں بڑی ہمت کر کے ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی وقت مقررہ میں کچھ وقفہ باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے اجنبی شخص کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی معقول عذر کی بنا پر تاخیر ہو گئی ہو۔ وقت گزر جانے کے بعد وہ نہیں آیا تو یقیناً اسے قابل مذمت گردانا جائے گا۔

منٹ منٹ پر حضرت جنید کے حامیوں کا جوش مسرت بڑھتا جا رہا تھا اور وہ طرح طرح کی آوازیں کس کر مجمع کے ذہن سے اس اجنبی شخص کا اثر زائل کر رہے تھے۔ لیکن خود حضرت جنید پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گئے ہیں۔ لاشعوری طور پر وہ پیش آنے والے کسی حیرت انگیز واقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔

مجمع کا اضطراب اب قابو سے باہر ہونے لگا تھا۔ حضرت جنید کے حامیوں کی طرف سے بار بار یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ مسند خلافت سے کوئی فیصلہ کن اعلان کر کے مجمع کو منتشر کر دیا جائے۔

وقت مقررہ میں اب چند ہی لمحے باقی رہ گئے تھے کہ وزیر اعلان کرنے کھڑا ہوا۔ سارا مجمع گوش بر آواز ہو گیا۔ منہ سے پہلا لفظ ہی نکلا تھا کہ مجمع کے کنارے سے ایک شخص نے آواز دی ....ذرا ٹھہر جائیے! وہ دیکھئے سامنے گرد اڑ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے اہی اجنبی شخص آ رہا ہو۔

اس آواز پر سارا مجمع گرد راہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آنے والے راہ گیر کے ہر قدم پر دلوں کا عالم زیر و زبر ہو رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر فضاؤں میں اڑتا ہوا غبار لاکھوں امیدوں کا مرکز نگاہ بن گیا تھا۔ چند ہی لمحے کے بعد جب گرد صاف ہوئی تو دیکھا گیا کہ ایک نحیف ولاغر انسان پسینے میں شرابور ہانپتے ہانپتے چلا آ رہا ہے۔ مجمع سے قریب ہونے کے بعد آثار و قرائن سے لوگوں نے پہچان لیا کہ وہی اجنبی شخص ہے جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سارا مجمع اس اجنبی شخص کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا۔ بڑی مشکلوں سے ہجوم پر قابو حاصل کر کے اسے میدان تک پہنچایا گیا۔ ظاہری شکل و صورت دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت تھی کہ ضعف و ناتوانی سے زمین پر جس کے قدم سیدھے نہیں پڑتے وہ جنید جیسے کوہ پیکر پہلوان سے کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔

حضرت جنید کے ہموا پورے مطمئن تھے کہ ابھی چند منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے وقت کی ایک عظیم شخصیت کے ساتھ گستاخانہ جسارت کی سزا کتنی عبرت ناک ہوتی ہے۔

دنگل کا وقت ہو چکا تھا۔ اعلان ہوتے ہی حضرت جنید تیار ہو کر اکھاڑے میں اتر گئے۔ وہ اجنبی شخص بھی کمر کس کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ لاکھوں تماشائیوں کے لئے بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا یہ! حضرت جنید کے سامنے وہ اجنبی شخص گرد راہ معلوم ہو رہا تھا۔ پھٹی آنکھوں سے سارا مجمع دونوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ حضرت جنید نے خم ٹھونک کر زور آزمائی کے لئے پنجہ بڑھایا۔ اس اجنبی نے دبی زبان میں کہا " کان قریب لائیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ "

نہ جانے اس آواز میں کیا سحر تھا کہ سنتے ہی حضرت جنید پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ اچانک پھیلے ہوئے ہاتھ سٹ گئے۔ کان قریب کرتے ہوئے کہا..

"فرمایئے!"

اجنبی کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اتنی بات منہ سے نکل سکی۔

" جنید! میں کوئی پہلوان نہیں ہوں۔ زمانے کا ستایا ہوا ایک آل رسول ہوں، سیدہ فاطمہ کا ایک چھوٹا سا کنبہ کئی ہفتہ سے جنگل میں پڑا ہوا فاقوں سے نیم جان ہے۔ سیدانیوں کے بدن پر کپڑے بھی سلامت نہیں ہیں کہ وہ گھنی جھاڑیون سے باہر نکل سکیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کی شدت سے بے حال ہو گئے ہیں۔ ہر روز صبح کو یہ کہہ کر شہر آتا ہوں کہ شام تک کوئی انتظام کر کے واپس لوٹوں گا۔ لیکن خاندانی غیرت کسی کے آگے منہ نہیں کھولنے دیتی۔ گرتے پڑتے بڑی مشکل سے آج یہاں تک پہنچا ہوں۔ فاتح خیبر کا خون ہاشمی رگوں میں سوکھتا جا رہا ہے۔ چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ شرم سے بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھتے۔ میں نے تمہیں صرف اس امید پر چیلنج دیا تھا کہ آل رسول کی جو عقیدت تمہارے دل میں ہے آج اس کی آبرو رکھ لو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ کل میدان قیامت میں نانا جان سے کہہ کر تمہارے سر پر فتح کی دستار بندھواؤں گا۔

فاطمی چمن کی مرجھائی ہوئی کلیوں کی اداسی اب دیکھی نہیں جاتی جنید! عالم گیر شہرت و اعزاز کی صرف ایک قربانی سوکھے چہروں کی شادابی کے لئے کافی ہے۔ یقین رکھو آل رسول کے خانہ بدوش قافلہ کی حرمت و آسودگی کے لئے تمہاری عزت و ناموس کا ایثار کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہمارے خاندان کی یہ ریت تمہیں معلوم ہے کہ کسی کے احسان کا بدلہ زیادہ دیر تک ہم قرض نہیں رکھتے۔

اجنبی شخص کے یہ چند جملے نشتر کی طرح حضرت جنید کے جگر میں پیوست ہو گئے۔ پلکیں آنسوؤں کے طوفان سے بوجھل ہو گئیں۔ عشق و ایمان کا

ساگر موجوں کے تلاطم سے زیروزبر ہونے لگا۔ آج کونین کا سرمدی اعزاز سرچڑھ کر جنید کو آواز دے رہا تھا۔ عالم گیر شہرت وناموس کی پامالی کے لئے دل کی پیش کش میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ بڑی مشکل سے حضرت جنید نے جذبات کی طغیانی پر قابو حاصل کرتے ہوئے کہا....... "کشور عقیدت کے تاجدار! میری عزت وناموس کا اس سے بہترین مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ اسے تمہارے قدموں کی اڑائی ہوئی خاک پر نثار کردوں۔ چمنستان قدس کی پژمردہ کلیوں کی شادابی کے لئے اگر میرے جگر کا خون کام آسکے تو اس کا آخرے قطرہ بھی تمہارے نقش پا میں جذب کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اے خوشا نصیب کہ کل میدان حشر میں سرکار اپنے نواسوں کے زرخرید غلاموں کی قطار میں کھڑے ہونے کی اجازت مجھے مرحمت فرمائیں۔"

اتنا کہنے کے بعد حضرت جنید خم ٹھونک کر للکارتے ہوئے آگے بڑھے اور اجنبی شخص سے پنجہ ملا کر گتھ گئے۔ سچ مچ کشتی لڑنے کے انداز میں تھوڑی دیر پینترا بدلتے رہے۔ سارا مجمع نتیجے کے انتظار میں ساکت وخاموش نظر جمائے دیکھتا رہا۔ چند ہی لمحے کے بعد حضرت جنید نے بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک داؤ چلایا۔ آنکھیں کھلیں تو جنید کے حامیوں کے نعرہ ہائے تحسین سے میدان گونج اٹھا۔ ہیبت سے دیکھنے والوں کی پلکیں جھپک گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے حضرت جنید چاروں شانے چت تھے اور سینے پر سیدہ کا ایک نحیف وناتواں شہزادہ فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حضرت جنید کی فاتحانہ زندگی کا نقشہ دیکھنے والی آنکھیں اس حیرت انگیز نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔ ایک لمحے کے لئے سارے مجمع پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت کا طلسم ٹوٹتے ہی مجمع نے نحیف وناتواں سید کو گود میں اٹھالیا۔ میدان کا فاتح اب سروں سے گزر رہا تھا اور ہر طرف سے انعام واکرام کی بارش ہو رہی تھی۔ تحسین وآفرین کے نعروں سے کان پڑی سنائی نہیں دیتی تھی۔ شام تک فتح کا جلوس سارے شہر میں گشت کرتا رہا۔ رات ہونے سے پہلے پہلے ایک گمنام سید خلعت وانعامات کا بیش بہا ذخیرہ لے کر جنگل میں اپنی پناہ گاہ کی طرف لوٹ چکا تھا۔

حضرت جنید اکھاڑے میں اسی شان سے چت لیٹے ہوئے تھے۔ اب کسی کی کوئی ہمدردی ان کی ذات سے نہیں رہ گئی تھی۔ ہر شخص انہیں پائے حقارت سے ٹھکراتا اور ملامت کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ عمر بھر مدح وستائش کا خراج وصول کرنے والا آج زہر میں بجھے ہوئے طعنوں اور توہین آمیز کلمات سے مسرور وشادکام ہو رہا تھا۔

ہجوم ختم ہوجانے کے بعد خوب ہی اٹھے اور شاہراہ عام سے گزرتے ہوئے اپنے دولت خانے پر تشریف لے گئے۔ آج کی شکست کی ذلتوں کا سرور ان کی روح پر ایک خما کی طرح چھا گیا تھا۔ عمر بھر فاتحانہ مسرتیں وہ اپنی ننگی پیٹھ کے نشانات پر بکھیر آئے تھے۔

رات کی زلف سیاہ کمر کے نیچے ڈھل چکی تھی۔ بغداد کا سارا شہر تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں محو خواب تھا۔ کہیں کہیں سے مشعل بردار پاسبانوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت جنید جب اپنے بستر پر لیٹے تو بار بار کان میں یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"وعدہ کرتا ہوں کہ کل میدان قیامت میں نانا جان سے کہہ کر تمہارے سر پر فتح کی دستار بندھواؤں گا۔"

کیا سچ مچ ایسا ہوسکتا ہے کیا میری قسمت کا ستارہ یک بیک اتنی بلندی پر پہنچ جائے گا کہ سرکار ﷺ کے نورانی ہاتھوں کی برکتیں میری پیشانی کو چھولیں۔ اپنی طرف دیکھتا ہوں تو کسی طرح اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن لاڈلوں کی "ہٹ" بھی تو کوئی چیز ہے۔ اگر میدان حشر میں شہزادے مچل گئے تو رحمت تمام کو کیونکر گوارا ہوسکے گا کہ ان کے دل کے نازک آبگینے پر کوئی آنچ آجائے۔ سارے زمانے میں آل رسول کی زبان کا بھرم مشہور ہے۔ گردن کٹ سکتی ہے دی ہوئی زبان نہیں کٹ سکتی۔ آخر کربلا کے لالہ زار کی سرخی زبان ہی کے بھرم سے تو آج تک قائم ہے۔ نبی زادوں کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا۔ قیامت کے دن وہ ضرور اپنے نانا جان تک میری بات پہنچائیں گے۔ اے کاش! آج ہی قیامت آجاتی، آج ہی میدان حشر کا وہ روح پرور نظارہ نگاہوں کے سامنے ہوتا۔

آہ! اب جب تک زندہ رہوں گا قیامت کے لئے ایک ایک دن گننا پڑے گا۔ حساب وشمار کی گرفت میں آنے والی ایک طویل مدت کیسے کٹے گی؟

یہ سوچتے سوچتے حضرت جنید کی پرنم آنکھوں پر نیند کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور خاکدان گیتی سے بہت دور ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔

پہاڑوں، صحراؤں اور آبادیوں کے سارے حجابات نظر کے سامنے سے اٹھ چکے تھے۔ اب بغداد سے گنبد خضرا کا کلس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جب تک آنکھ کھلی رہی نظر کا قافلہ بہاروں کے جلوۂ شاداب سے سیر ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنہری جالیوں سے ایک کرن پھوٹی اور مدینے کا آسمان روشنی سے معمور ہوگیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ نور کا ایک سفید بادل مدینے کے افق سے بغداد کی طرف بڑھتا آرہا ہے، جہاں جہاں سے گزرا نور برستا گیا۔ فضا نکھرتی گئی، اندھیرا اچھٹتا گیا، سحر پھیلتی گئی، قریب آتے آتے اب رحمت وتجلی کا وہ روشن قافلہ بغداد کے آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ چند ہی لمحے کے بعد وہ نیچے اترنا شروع ہوا۔ ایوانوں کے کنگرے جھک گئے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سرنگوں ہوگئیں۔ درختوں کی شاخیں سجدے میں گر پڑیں۔ بغداد کی زمین جھومنے لگی۔ بہاروں نے پھول برسائے۔ صبا نے خوشبو اڑائی۔ سحر نے معمور ہوگیا۔ طلعت جمال سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ دل کیف وسرور میں ڈوب گیا۔

در ودیوار اور شجر وحجر کو زبان مل گئی اور اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ کے نغموں سے فضا گونج اٹھی۔

عالم بے خودی میں حضرت جنید سلطان کونین ﷺ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ سرکار ﷺ نے رحمتوں کے ہجوم میں مسکراتے ہوئے فرمایا۔

جنید! اٹھو قیامت سے پہلے اپنے نصیبے کی سرفرازیوں کا نظارہ کرلو۔ نبی زادوں کے ناموس کے لئے شکست کی ذلتوں کا انعام قیامت تک قرض نہیں رکھا جائے گا۔

سر اٹھاؤ! تمہارے لئے فتح وکرامت کی دستار لے کر آیا ہوں۔ آج سے ہمیں عرفان وتقریب کی سب سے اونچی بساط پر فائز کیا گیا۔ تجلیات کی بارش میں اپنی ننگی پیٹھ کا غبار اور چہرے کے گرد کا نشان دھو ڈالو۔ اب تمہارے رخ تاباں میں خاکدان گیتی ہی کے نہیں عالم قدس کے رہنے والے بھی اپنا منہ دیکھیں گے۔ بارگاہ یزدانی سے گروہ اولیا کی سروری کا اعزاز تمہیں مبارک ہو۔

ان کلمات سے سرفراز فرمانے کے بعد سرکار مصطفےٰ ﷺ نے حضرت جنید کو سینے سے لگایا۔ اس عالم کیف بار میں شہزادوں کے جاں نثار پروانے کو کیا عطا فرمایا اس کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ جاننے والے بس اتنا ہی جان سکے کہ صبح کو جب حضرت جنید کی آنکھ کھلی تو پیشانی کی موجوں میں نور کی کرن لہرا رہی تھی۔ آنکھوں سے عشق وعرفان کی شراب کے پیمانے چھلک رہے تھے۔ دل کی انجمن تجلیات کا گہوارہ بن چکی تھی۔ لبوں کی جنبش پر کارکنان قضا و قدر کے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے۔ غیب وشہود کی ساری کائنات شفاف آئینے کی طرح تار نظر کی گرفت میں آگئی تھی۔ نفس نفس میں عشق ویقین کی دہکتی ہوئی چنگاری پھوٹ رہی تھی۔ نظر نظر میں دلوں کی تسخیر کا سحر جلال انگڑائی لے رہا تھا۔

کل کی شام جو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا تھا آج صبح کو اس کی راہ گزر میں پلکیں بچھی جارہی تھیں۔ کل جو شکست کی ذلتوں سے بوجھل ہو کر اکیلا اپنے گھر تک آیا آج اس کے جلو میں کونین کی امیدوں کے کارواں چل رہے تھے۔ ایک ہی رات میں سارا عالم زیر وزبر ہو گیا تھا۔

خواب کی بات باد صبا گھر گھر پہنچا دی تھی۔ طلوع سحر سے پہلے ہی حضرت جنید کے دروازے پر درویشوں کی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ جونہی باہر تشریف لائے خراج عقیدت کے لئے ہزاروں گردنیں جھک گئیں، خلیفہ بغداد نے اپنے سر کا تاج اتار کر قدموں میں ڈال دیا۔ سارا شہر حیرت پشیمانی کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے ایک بار نظر اٹھائی اور ہیبت سے لرزتے ہوئے دلوں کو سکون بخش دیا۔ پاس ہی کسی گوشے سے آواز آئی گروہ اولیاء کی سروری کا اعزاز مبارک ہو۔ منہ پھیر کر دیکھا تو وہی نحیف ونزار آل رسول فرط خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ ساری فضا سید الطائفہ کی مبارک باد سے گونج اٹھی۔

دل کی آشنائی

اپنے عہد طالب علمی کی وہ خوشگوار شام میں کبھی نہیں بھولوں گا جب کہ دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور کے صدر دروازے پر میں کھڑا تھا۔ لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا دیہاتی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور ہانپتے ہوئے دریافت کیا۔

"مبارکپور میں کوئی بہت بڑا مدرسہ ہے۔ اس کا نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ بریلی کے جن مولانا صاحب نے تیرہ برس کے اسلام کا چہرہ باطل پرستوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار سے صاف کیا ہے وہ مدرسہ انہیں کے مسلک کا حامی ہے۔

اس واقعہ کو بیس سال کا عرصہ ہو گیا لیکن آج سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ اس بوڑھے انسان کے ہیکل میں فطرت خود بول رہی تھی۔ بریلی کے ان ہی مولانا صاحب کی کیف بار زندگی کا ایک رخ اس مضمون میں پڑھیے۔"

ارشد القادری

پرانے شہر بریلی کے ایک محلّہ میں آج صبح ہی سے ہر طرف چہل پہل تھی، دلوں کی سرزمین پر عشق رسالت کا کیف و سرور کالی گھٹاؤں کی طرح برس رہا تھا۔ بام و در کی آرائش، گلی کوچوں کا نکھار، رہ گزاروں کی صفائی اور دور دور تک رنگین جھنڈیوں کی بہار ہر گزرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ بالآخر چلتے چلتے ایک راہگیر نے دریافت کیا۔ آج یہاں کیا ہونے والا ہے؟

کسی نے جواب دیا .... دنیائے اسلام کی عظیم ترین شخصیت، دین کے مجدد اہل سنت کے امام، عشق رسالت کے گنج گرانمایہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی آج یہاں تشریف لانے والے ہیں انہیں کے خیر مقدم میں یہ سارا اہتمام ہو رہا ہے۔

پھر اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا ...... "کہاں سے تشریف لائیں گے وہ؟"

کسی نے جلدی سے گزرتے ہوئے جواب دیا ...."اسی شہر کے محلّہ سوداگران سے"۔

جواب سن کر وہ حیرت سے منہ تکتا رہ گیا۔ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ آنے والا اسی شہر سے آ رہا ہے۔ وہ آنا چاہے تو صبح و شام آسکتا ہے۔ مسافت بھی کچھ اتنی طویل نہیں ہے کہ وہاں سے آنے والے کو کوئی خاص اہمیت دی جائے اور ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اس کے خیر مقدم کا شاندار اہتمام کیا جائے۔

آخر لوگوں کے سامنے اپنے دل کی اس خلش کا اظہار کئے بغیر اس سے نہ رہا گیا۔

ایک بوڑھے آدمی نے ناصحانہ انداز میں اسے جواب دیا....... بھائی! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ وہ آنے والا کس حیثیت کا ہے؟ کس شان کی اس کی ہستی ہے؟ اعزاز و اکرام کی بنیاد مسافت کے قریب و بعد پر نہیں ہے، شخصیت کی جلالت شان اور فضل و کمال کی برتری پر ہے۔

آنے والے مہمان کی زندگی یہ ہے کہ وہ اپنے دولت کدے سے نکل کر یا تو فرائض بندگی کے لئے خدا خانے میں جاتا ہے یا پھر جذبہ عشق کی تپش بڑھ جاتی ہے تو دیار حبیب کا سفر کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس کی شام و سحر اور شب و روز کا ایک ایک لمحہ دینی مہمات میں اس درجہ مصروف ہے کہ نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی اسے مہلت نہیں ملتی۔ اس کی حریم دل پر ہر وقت عشق بے نیاز کا پہرہ کھڑا رہتا ہے۔ ہزار انداز دلربائی پر آج تک خیال غیر کو باریابی کی اجازت نہیں مل سکی ہے۔ اس کی نوک قلم کا ایک قطرہ فکر و اعتقاد کی جنتوں میں کوثر و تسنیم کی طرح بہہ رہا ہے۔ اس کے خون جگر کی سرخی سے ویراوں میں دین کے گلشن لہلہا اٹھے ہیں۔

اس کے عرفان و آگہی کی داستان چمن چمن میں پہنچ گئی ہے اور لوح قرطاس سے گزر کر اب اس کے علم و دانش کا چراغ کشور دل کے شبستانوں میں جل رہا ہے۔

عشق و ایمان کی روح اس کے وجود کی رگ رگ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اپنے محبوب کی شوکت جمال کے لئے وہ ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ اس کے جگر کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ اس کے دل کا دھواں کبھی نہیں بند ہوتا۔ اور نقش و نگار جاناں کے لئے اس کے قلمدان کی رہشنائی کبھی نہیں سوکھتی۔ پلکوں کا قطرہ ڈھلکنے نہیں پاتا کہ اس کی جگہ آنسوؤں کا نیا طوفاں امنڈنے لگتا ہے۔

وہ اپنے محبوب کے وفاداروں پر اس درجہ مہربان ہے کہ قدموں کے نیچے دل بچھا کر بھی وہ اہتمام شوق کی تشنگی محسوس کرتا ہے۔

اور جہاں اہل ایمان کے لئے وہ لالہ کے جگر کی ٹھنڈک ہے، وہیں اہل کفر کی بغاوت کے حق میں وہ غیظ و غضب و جلال کا ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ اپنے محبوب کے گستاخوں پر جب وہ قلم کی تلوار اٹھاتا ہے تو انگلیوں کی ایک جنبش پر تڑپتی ہوئی لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ باطل کے جگر میں اس کے نشتر کا ڈالا ہوا شگاف زندگی کی آخری ہچکیوں تک مندمل نہیں ہوتا۔

اور سن لو وہ اپنے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کر سکتا ہے لیکن محبوب کی حرمت سے کھیلنے والوں کے لئے اس کے ہاں صلح و درگزر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوستی کا پیمان تو بڑی چیز ہے وہ تو ان دشنام طرازوں سے انس کربات بھی ناموس عشق کی توہین سمجھتا ہے۔

بارگاہ رب العزت اور شان رسالت میں اس کا ذوق احترام و ادب اس درجہ لطیف ہے کہ متکلم کے قصد و نیت سے قطع نظر وہ الفاظ کی نوک پلک پر بھی شرعی تعزیرات کا پہرہ بٹھاتا ہے۔ ہوائے نفس کی دبیز گرد کے نیچے چھپ جانے والی شاہراہ حق کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ اس نے واضح کر دیا ہے کہ اب اہل عرفان کی دنیا بیک زبان اسے "مجدد" کہتی ہے۔ فرش گیتی پر رحمت و فیضان کے چشموں کی طرف بڑھنے والوں کے لئے اب درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں ہے۔ طلسم فریب کی وہ ساری فصلیں ٹوٹ کر گر گئی ہیں جو شیاطین کی سربراہی میں جادۂ عشق کے مسافروں کو واپس لوٹانے کے لئے کھڑی کی گئی تھیں۔

اس کے فکر و نظر کی اصابت علم و فن کا تبحر، فضل و کمال کی انفرادیت، شریعت و تقویٰ کا التزام، مجد و شرف کی برتری، تجدید و ارشاد کا منصب امامت اور دین و سنت کے فروغ کے لئے اس کے دل کا عشق و اخلاص سارے عرب و عجم نے تسلیم کر لیا ہے۔

وہ اپنے زمانے کا بہت سخنور بھی ہے لیکن آج تک کبھی اس کی زبان اہل دنیا کی منقبت سے آلودہ نہیں ہوئی۔ وہ بھری کائنات میں صرف اپنے محبوب ﷺ کی مدح سرائی سے شاد کام رہتا ہے۔

وہ اپنے کریم آقا کی گدائی پر دونوں جہاں کا اعزاز نثار کر چکا ہے۔ دنیا کے ارباب ریاست صرف اس آرزو میں بارہا اس کی چوکھٹ تک آئے کہ اپنے

حضور میں صرف باریاب ہونے کی اجازت دے دے لیکن زمانہ شاہد ہے کہ ہر بار نہیں شکستہ خاطر ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔

بوڑھے آدمی نے جذباتی انداز میں اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ اپنے وقت کی اتنی عظیم و برتر شخصیت جس کی دینی و علمی شوکتوں کا پرچم عرب وعجم میں لہرا رہا ہے اور جسے عشق مصطفےٰ ﷺ کی وارفتگی نے دونوں جہان سے چھین لیا ہے آج اگر وہ یہاں قدم رنجہ فرمانے کے لئے مائل کرم ہے تو کیا یہ ہماری قسمتوں کی معراج نہیں ہے؟ پھر اگر ہم اس کے خیر مقدم کے لئے اپنے دلوں کا فرش بچھا رہے ہیں تو اپنے جذبہ شوق کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ خوشگوار جنون انگیز موسم اور کیا ہو سکتا ہے۔"

بوڑھے آدمی کی طویل گفتگو ختم ہو جانے کے بعد اس اجنبی راہ گیر کے چہرے کا اتار چڑھاؤ حیرت و مسرت کے گہرے تاثرات کی نشاندہی کر رہا تھا۔

امام اہل سنت کی سواری کے لئے پالکی دروازے پر لگا دی گئی تھی۔ سینکڑوں مشتاقان دیدار انتظار میں کھڑے تھے۔ وضو سے فارغ ہو کر کپڑے زیب تن فرمائے، عمامہ باندھا اور عالمانہ وقار کے ساتھ باہر تشریف لائے۔ چہرۂ انور سے فضل و تقویٰ کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ شب بیدار آنکھوں سے فرشتوں کا تقدس برس رہا تھا۔ طلعت جمال کی دلکشی سے مجمع پر ایک رقت انگیز بے خودی کا عالم طاری تھا گویا پروانوں کے ہجوم میں ایک شمع فروزاں مسکرا رہی تھی اور عندلیبان شوق کی انجمن میں ایک گل رعنا کھلا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے سواری تک پہنچنے کا موقع ملا۔

پابوسی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد کہاروں نے پالکی اٹھائی۔ آگے پیچھے داہنے بائیں نیاز مندوں کی بھیڑ ہمراہ چل رہی تھی۔

پالکی لیکر تھوڑی دیر چلے تھے کہ امام اہل سنت نے آواز دی ..... "پالکی روک دو"

حکم کے مطابق پالکی رکھ دی گئی۔ ہمراہ چلنے والا مجمع بھی وہیں رک گیا۔

اضطراب کی حالت میں باہر تشریف لائے، کہاروں کو اپنے قریب بلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ آپ لوگوں میں کوئی آل رسول تو نہیں ہے؟ اپنے جد اعلیٰ کا واسطہ سچ بتایئے، میرے ایمان کا ذوق لطیف تن جاناں کی خوشبو محسوس کر رہا ہے۔"

اس سوال پر اچانک ان میں سے ایک شخص کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ پیشانی پر غیرت و پشیمانی کی لکیریں ابھر آئیں۔

بے نوائی، آشفتہ حالی اور گردش ایام کے ہاتھوں ایک پامال زندگی کے آثار اس کے انگ انگ سے آشکار تھے۔

کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد نظر جھکائے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

مزدور سے کام لیا جاتا ہے ذات پات نہیں پوچھا جاتا۔ آہ! آپ نے میرے جد اعلیٰ کا واسطہ دیکر میری زندگی کا ایک سربستہ راز فاش کر دیا۔

سمجھ لیجئے کہ میں اسی چمن کا ایک مرجھایا ہوا پھول ہوں جس کی خوشبو سے آپ کی مشام جاں معطر ہے۔ رگوں کا خون نہیں بدل سکتا اس لئے آل رسول ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن اپنی خانماں برباد زندگی کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

چند مہینے سے آپ کے اس شہر میں آیا ہوں۔ کوئی ہنر نہیں جانتا کہ اسے اپنا ذریعہ معاش بناؤں۔ پالکی اٹھانے والوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ ہر روز سویرے ان کے جھنڈ میں آ کر بیٹھ جاتا ہوں اور شام کو اپنے حصے کی مزدوری لیکر اپنے بال بچوں میں لوٹ جاتا ہوں۔

ابھی اس کی بات تمام بھی نہ ہو پائی تھی کہ لوگوں نے پہلی بار تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھا کہ عالم اسلام کے ایک مقتدر امام کی دستار اس کے قدموں پر رکھی ہوئی تھی اور وہ برستے آنسوؤں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر التجا کر رہا تھا۔

"معزز شہزادے! میری گستاخی معاف کر دو، لاعلمی میں یہ خطا سرزد ہو گئی ہے۔ ہائے غضب ہو گیا، جن کے کفش پا کا تاج میرے سر کا سب سے بڑا اعزاز ہے ان کے کاندھے پر میں نے سواری کی۔ قیامت کے دن اگر کہیں سرکار ﷺ نے پوچھ لیا کہ احمد رضا! کیا میرے فرزندوں کا دوش ناز نیں اسی لئے تھا کہ وہ تیری سواری کا بوجھ اٹھائے تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس وقت بھرے میدان حشر میں میرے ناموس عشق کی کتنی بڑی رسوائی ہوگی آہ! اس ہولناک تصور سے کلیجہ شق ہوا جا رہا ہے۔"

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جس طرح ایک عاشق دلگیر روٹھے ہوئے محبوب کو مناتا ہے، بالکل اسی انداز میں وقت کا ایک عظیم المرتبت امام اس کی منت و سماجت کرتا رہا اور لوگ پھٹی آنکھوں سے عشق کی نازبرداریوں کا یہ رقت انگیز تماشہ دیکھتے رہے۔

یہاں تک کہ کئی بار زبان سے معاف کر دینے کا اقرار کرا لینے کے بعد امام اہل سنت نے پھر اپنی ایک آخری التجائے شوق پیش کی۔

"چونکہ راہ عشق میں خون جگر سے زیادہ وجاہت ناموس کی قربانی عزیز ہے اس لئے لاشعوری کی اس تقصیر کا کفارہ جب ہی ادا ہوگا کہ اب تم پالکی میں بیٹھو اور میں اسے اپنے کاندھے پر اٹھاؤں۔"

اس التجا پر جذبات کے تلاطم سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ وفور اثر سے فضا میں چیخیں بلند ہو گئیں۔ ہزار انکار کے باوجود آخر سید زادہ کو عشق جنوں خیز کی ضد پوری کرنی پڑی۔

آہ! وہ منظر کتنا رقت انگیز اور دل گداز تھا جب اہل سنت کا جلیل القدر امام کہاروں کی قطار سے لگ کر اپنے علم و فضل، جبہ و دستار اور اپنی عالمگیر شہرت کا سارا اعزاز خوشنودیٔ حبیب کے لئے ایک گمنام مزدور کے قدموں پر نثار کر رہا تھا۔

شوکت عشق کا یہ ایمان افروز نظارہ دیکھ کر پتھروں کے دل پگھل گئے، کدورتوں کا غبار چھٹ گیا، غفلتوں کی آنکھ کھل گئی اور دشمنوں کو بھی ماننا پڑا کہ آل رسول کے ساتھ جس کے دل کی عقیدت و اخلاص کا یہ عالم ہے، رسول کے ساتھ اس کی وارفتگی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ اہل انصاف کو حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہوا کہ نجد سے لیکر سہارنپور تک رسول کے گستاخوں کے کلاف احمد رضا کی برہمی قطعاً حق بجانب ہے۔

صحرائے عشق کے اس روٹھے ہوئے دیوانے کو اب کوئی نہیں منا سکتا۔ وفا پیشہ دل کا یہ غیظ ایمان کا بخشا ہوا ہے نفسانی ہیجان کی پیداوار نہیں۔

ہے ان کے عطر بوئے گریباں سے مست گل

گل سے چمن چمن سے صبا اور صبا سے ہم

دل کا یقین

تقریباً سو برس پہلے کی بات ہے جونپور شہر میں سناروں کا ایک ہندو خاندان آباد تھا۔ خاندان کا سربراہ سندر لال نامی ایک بڑا زیرک، تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص تھا۔ بے شمار دولت اور جائیداد اس کے پاس تھی۔ بیچ شہر کے چوراہے پر سونے چاندی کی ایک بہت بڑی دوکان بھی اس کی تھی۔ کاروبار اتنے عروج پر تھا کہ رات دن من برستا تھا۔

لیکن ساری دولت وخوش حالی کے باوجود سندلال کی دنیا تاریک تھی۔ وہ اکثر اداس اور ملول رہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی ایک دولت مند گھرانے کی حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کے رخ وعارض اور قدو قامت کی زیبائی ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سندرلال جب بہت پریشان ہوتا تو وہ دل موہ لینے والی آواز سے تسلی دیتی۔

"ناحق آپ اپنا خون جلاتے ہیں۔ اولاد قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے۔ وہ کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے۔ جس دن مالک کی کرپا ہو جائے گی آپ کے نام کا چراغ جل اٹھے گا۔ وقت کا انتظار کیجئے ...... سنسار کا پالن ہار اپنی چوکھٹ سے محروم نہیں کریگا۔ ایک نا ایک دن ہماری آرزوؤں کی کلی کھل کر رہے گی۔"

حسین ودلکش بیوی کی باتوں سے شبنم کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوند ٹپکتی اور تھوڑی دیر کے لئے دل کی آگ بجھ جاتی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد دھواں اٹھنے لگتا اور پھر سلگنے کی کیفیت چہرے سے نمایاں ہو جاتی۔

بیوی کا حال بھی اپنے شوہر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کی ممتا کا سوکھا ہوا چشمہ اس کی آغوش کی ویران محفل اور اس کی راتوں کی اداس تنہائی اندر ہی اندر اسے تڑپاتی رہتی تھی۔ چونکہ فطرتاً وہ بہت زیادہ متحمل مزاج اور صبر آزما واقع ہوئی تھی اس لئے اس کے دل کی بے قراریوں کا اظہار نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں بھی عورت کی سرشت بہت زیادہ غم فراموش اور شکیب پرور ہوتی ہے۔ ویسے اپنی غم نصیبی پر سلگتی وہ بھی رہتی تھی لیکن آنکھوں کے چلن سے دھواں نہیں اٹھتا تھا۔

محرم کا پرسوز موسم تھا۔ بھیگی ہوئی پلکوں کے سائے میں ہر طرف شہیدان وفا کی یاد منا جارہی تھی۔ آہ و گریہ کے پھیلے ہوئے اضطراب سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ لرزہ خیز واقعہ کل ہی رونما ہوا ہے۔

سندرلال کی دیوار سے بالکل لگی ہوئی دیوار ایک خوش عقیدہ مسلمان کی تھی۔ اس کا نام سید شریف تھا۔ وہ ان اعتدال پسند لوگوں میں سے تھا جو شہیدوں کی روحانی توانائی پر محسوس قوتوں کی طرح یقین رکھتے ہیں لیکن عقیدت ومحبت کے اظہار کے لئے شریعت کے مقرر کردہ حدود سے قدم باہر نہیں نکالتے۔

وہ ہر سال محرم کی دسویں تاریخ کو نہایت اہتمام کے ساتھ ذکر شہادت کی محفل منعقد کیا کرتا تھا جس میں شہر کے سارے معززین اور عاشقان اہل بیت انتہائی جذبہ عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر شہدائے کربلا کی ارواح طیبات کو شربت وغیرہ کا ایصال ثواب کیا جاتا تھا جسے تبرک کے طور پر حاضرین مجلس کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

یہ اس کے ہر سال کا معمول تھا لیکن آج جس واقعہ کی سارے شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی وہ محرم کی عام روایات سے بالکل مختلف واقعہ تھا۔ آج صبح ہی سے سید شریف کے دروازے پر شہر کے بیشمار فقراء ومساکین کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ان پر بے دریغ پیسے لٹائے جارہے تھے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صاحب خانہ نے آج اپنے تین مہینے کے شیر خوار بچے کو پیسوں کے برابر وزن کیا ہے اہی پیسے تقسیم کیے جارہے ہیں۔

ہمسائیگی کے رشتے سے سنار کی بیوی اکثر سید شریف کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ آج اس کے دروازے پر سارا دن انسانوں کا ہجوم دیکھ کر تفتیش کی غرض سے شام کو اس کے گھر آئی اور سید شریف کی بیوی سے دریافت کیا۔

"کیوں بہن! آج تمہارے گھر پر کیا تھا۔ دن بھر فقیروں کا تانتا بندھا تھا۔ ابھی شام کو بھیڑ کم ہوئی ہے تو خیریت دریافت کرنے آگئی ہوں۔"

شریف کی بیوی نے جواب دیا .... "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ آج محرم کی دسویں تاریخ تھی، ساری دنیا کے مسلمان آج کے دن نواسہ رسول فرزند بتول کی روح پاک کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔"

سنار کی بیوی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ...... "وہ تو میں بھی جانتی ہوں، بہن کہ آج غمی کا دن ہے۔ آج سارے مسلمان کربلا کے پاک شہیدوں کی یاد مناتے ہیں۔ لیکن دراصل معلوم یہ کرنا چاہتی تھی کہ آج تم نے اپنے ننھے کو پیسوں میں وزن کر کے خیرات تقسیم کیا ہے کیا محرم کی مذہبی رسومات میں یہ بھی شامل ہے؟"

سید شریف کی بیوی نے غلط فہمی دور کرنے کے انداز میں کہا۔

"محرم کی رسومات میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔ ویسے خبر صحیح ملی ہے تمہیں۔ لیکن اس کی کہانی بڑی دردانگیز ہے وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگی۔"

سنار کی بیوی اس جواب پر چونک گئی۔ اس نے دبی زبان میں جھجکتے ہوئے کہا.... "یہ صحیح ہے کہ ہم ہندو دھرم کی ماننے والی ہوں۔ لیکن کسی واقعہ کے سمجھنے کا تعلق دھرم سے نہیں ہے۔ حقیقت کی کہانی کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔ یہ عذر بیان کر کے تم نے اور بھی مشتاق بنادیا ہے۔ اب تو یہ کہانی میں سن کر ہی اٹھوں گی۔"

اس کے جنون انگیز اصرار پر شریف کی بیوی مجبور ہوگئی اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔

اپنے دھرم کے مطابق ہم لوگ شہیدوں کو زندہ جاوید سمجھتے ہیں۔ آج انہی شہیدوں کے سب سے بڑے سردار کی شہادت کا دن تھا۔ وہ ہمارے پاک پیغمبر کے لاڈلے نواسے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی دلاری بیٹی بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نور کے برستے ہوئے بادل میں صبح و شام اپنے لال کو نہلایا کرتی تھیں۔

یہ بات بھی اوپر ہی سے ہمیں پہنچی ہے کہ رحمتوں کے جس آبشار سے ان راج دلاروں نے دودھ پیا ہے اس کا سوتا دریائے قدس سے جاملتا ہے۔

ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ہمارے سرکار ﷺ کے نواسے کو شہادت کے بعد بہت بڑا درجہ ملا ہے۔ اب وہ کربلا کے راج سنگھاسن سے دونوں جگ پر حکومت کرتے ہیں۔ خدا کی بات پر انہوں نے اپنا سر کٹایا اس لئے اب ان کی بات کبھی نہیں رد ہوئی۔"

ہمارے سماج میں ایسے بہت سے زندہ واقعات موجود ہیں کہ ان کے چاہنے والے دکھیاروں نے جب اپنے دل کے سوز کے ساتھ انہیں پکارا تو وہ غیبی راستے سے پلک جھپکتے آگئے۔ انہیں خدا نے دیکھنے اور سننے کی اتھاہ قوت عطا فرمائی ہے۔

دور کیوں جاؤ؟ ایک تازہ مثال ہماری ہی موجود ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دھن دولت، نوکر چاکر، زمین اور آسائش و عزت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن گھر میں جب تک کوئی چراغ جلانے والا نہ ہو سارا دھن بیکار تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ہمیشہ اپنی تقدیر کا ماتم کرتے رہے ہیں۔ علاقے میں کوئی ایسا پیر فقیر اور وید حکیم نہیں جس کے پاس ہم اپنی فریاد لیکر نہ گئے ہوں، لیکن کہیں ہماری مراد بر نہ آئی۔

جب ہم ہر طرف سے مایوس ہوگئے تو گزشتہ سال اسی محرم کے موقع پر جبکہ ہم سب روزہ سے تھے، شام کو افطار کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اچانک بیٹھے بٹھائے میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو رواں ہوگئے۔ رہ رہ کر یہ خیال نشتر کی طرح دل میں چبھنے لگا کہ کاش آج ہماری گود میں بچے ہوتے تو وہ بھی افطار پر ہمارے ہمراہ بیٹھتے۔ ہر چند اس خیال کو دل سے نکالنا چاہتی تھی لیکن آتش صحرا کی طرح دم کے دم میں یہ آگ ارے جسم کے اندر پھیل گئی۔ بال بال سے چنگاری پھوٹنے لگی، سالہا سال سے ضبط و شکیب کا تھما ہوا ساگر آج امنڈ پڑا تھا۔ اسی اضطراب انگیز ہیجان کے عالم میں بے ساختہ منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔

"یا حسین؟ مایوسیوں کے منجدھار سے اب تمہی ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کو باہر نکالو۔ ایک ایک کر کے امیدوں کے سارے دیپ بجھ گئے۔

فاطمہ رضی اللہ عنہا کے راج دلارے، مانگنے والوں کو تمہاری چوکھٹ سے کیا نہیں ملا ہے۔ اپنے قدموں کے دھول کی ایک ہی چٹکی میرے آنچل میں ڈالدو۔ زندگی بھر کا ارمان پورا ہو جائے گا۔

شہنشاہ کونین ﷺ کے شہزادے! تمہیں کربلا کے لالہ زار میں منہ لپیٹ کر سوئے ہوئے ہزار برس سے اوپر گزر گئے لیکن آج بھی تمہارے نام کا ڈنکا گلی گلی میں بج رہا ہے۔

عالم ہستی کے راج کمار، اپنی دولت اقبال کا ایک چراغ میرے گھر میں بھی جلادو۔ تمہارے گھر میں چراغوں کی کمی نہیں سرکار!"

بڑی مشکل سے گھر والوں نے میرے جذبات کے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی کا چھینٹا دیا۔ یہاں تک کہ کافی دیر کے بعد رفتہ رفتہ میری حالت سکون پذیر ہوئی۔ روزے کی تکان تو تھی ہی، دل کی اس ہنگامہ خیز کیفیت نے سارے جسم کو نڈھال کر دیا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے چارپائی پہ لیٹ گئی۔ چند ہی لمحے کے بعد گہری نیند آگئی۔ پچھلے پہر ایک نہایت سہانا خواب میں نے دیکھا۔

اتنا یاد ہے کہ تن تنہا میں ایک میدان میں کھڑی ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اسی درمیان میں اچانک آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور میری گود میں آکر گر پڑا۔ ایک روشنی چمکی اور فضاؤں میں بکھر گئی۔ کہیں پاس ہی سے یہ آواز کان میں آئی۔

"جا! مایوسیوں کے منجدھار سے تیری کشتی نکال دی گئی۔ صدا لگانے والوں کو محروم واپس کرنا ہمارے گھر کی ریت نہیں ہے۔ تاریکیوں کی عمر ختم ہوگئی اب جلد ہی تیرے گھر میں اجالا ہوگا۔ امیدوں کی مرجھائی ہوئی کلیوں کو زندگی کا نیا فروغ مل گیا۔"

ابھی چند دن بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ میرا یہ خواب سچ ہونے لگا اور ٹھیک نو مہینے کے بعد ایک دن اس خواب کی تعبیر میری گود میں مچلنے لگی۔ یہ وہی ننھا ہے جسے پیسوں میں وزن کر کے آج سرکار کے نام کی خیرات لٹائی گئی ہے۔

سنار کی بیوی انتہائی محویت کے عالم میں یہ کہانی سن رہی تھی۔ کہانی کے اختتام پر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ چند ہی لمحے کے بعد آنکھیں کھلیں تو پلکیں بھیگ گئی تھیں اور موٹے موٹے اشک کے دو قطرے عارض پر ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔

حیرانی کے عالم میں شریف کی بیوی نے دریافت کیا۔

"ہائے اللہ! تم رونے کیوں لگیں؟ کیا تمہیں میری کہانی کے آخری حصے سے دکھ پہنچا ہے؟"

بس اتنا پوچھنا تھا کہ وہ پھوٹ پڑی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان امنڈنے لگا شریف کی بیوی نے جلد جلد آنچل کے گوشے سے اس کے آنسوؤں کا سیلاب خشک کیا اور تسلی دیتے ہوئے رونے کی وجہ دریافت کی۔ کچھ دیر بعد جب اسے افاقہ ہوا تو بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"بہن! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا سینہ بھی اسی نشتر سے گھائل ہے جس نے تمہیں برسوں تڑپایا ہے۔ ہم بھی مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوب رہے ہیں۔ اب اپنی آرزوؤں کی ویرانی نہیں دیکھی جاتی۔ تمہاری کہانی سن کر اس ارمان میں آنسو نکل آئے ہیں کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے راج کمار کی ایک ہندو عورت کی فریاد سنیں گے۔ کاش ...... مین بھی ان کے گھر کی لونڈیوں کی قطار میں کھڑی ہونے کے قابل ہوتی۔"

اتنا کہتے کہتے پھر اس کی پلکیں نم ہو گئیں اور فرط اضطراب سے آواز حلق میں پھنس کے رہ گئی۔ شریف کی بیوی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"ایسا مت سوچو .... ان کے نانا جان سارے سنسار کے لئے رحمت بن کر آئے ہیں۔ اس گھر کے راج کمار فریاد سننے کے لئے دکھیاروں کا دھرم نہیں دیکھتے۔ جو مصیبت کا مارا بھی ان کی چوکھٹ پر کھڑا ہو جائے وہ خدا کی دی ہوئی شکتی سے اس کی مصیبتوں کی بیڑی ضرور کاٹ دیتے ہیں۔ اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اسلام کا دھرم کارسازی کی رشتوں سے نہیں پھیلا ہے۔ اس کی سچائی دل کے گوشوں میں خود اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔"

یہ جواب سن کر امید کی ایک نئی تازگی سے سنار کی بیوی کا چہرا کھل اٹھا۔ اس نے تنکے کا سہارا ڈھونے کے انداز میں کہا۔

"تو بہن، پھر ہمارے لئے بھی کربلا کی راجدھانی تک فریاد پہنچانے کا کوئی راستہ نکالو۔ ہوسکتا ہے ہماری گود کی ویران محفل ان کی کرپا سے جگمگا اٹھے۔"

شریف کی بیوی نے مسکراتے ہوئے جوب دیا ...... کوئی ذریعہ تلاش کرنے کی بجائے خود ہی تو ان کا دھیان کر کے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی زبان میں ان سے فریاد کرو۔ تمہاری پکار ان کی چوکھٹ تک ضرور پہنچ جائے گی۔ اس طرح کے معاملے میں اصل چیز دل کا یقین ہے۔ اور بہتر ہوگا کہ کربلا کی راجدھانی تک اپنا پیغام بھیجنے سے پہلے ان کے نام پر فاتحہ کئے ہوئے شربت کے چند گھونٹ پی لو۔ میرے خیال میں اس کی برکت سے تمہارے دل کی آواز میں ضرور شامل ہوگی۔

سنار کی بیوی نے نہایت عقیدت کے ساتھ شربت کے چند گھونٹ پی کر کربلا کی طرف منہ کیا اور دل ہی دل میں شہزادہ کونین کی سرکار میں اپنا استغاثہ پیش کر دیا۔

دل کا یقین بھی غمزدوں کا کیسا خیر اندیش ساتھی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو تاریخ عالم کا مطالعہ کیجیے زندگی کی ایسی بے شمار مہم آپ کو ملے گی جو صرف یقین کے بل پر سر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی سنار کی بیوی کا واقعہ لے لیجیے۔ جب یہ اٹھ کر اپنے گھر واپس گئی تو اسے نا معلوم طور پر امید ہوگئی تھی کہ کربلا کی راجدھانی میں پیش کی ہوئی فریاد رائیگاں نہیں جائے گی۔

دوسرے دن اس نے اپنے شوہر سے جب اس کا تذکرہ کیا تو وہ صرف اپنی لاڈلی بیوی کی دلدہی کی خاطر اس کی خوشی میں شریک ہو گیا۔ اسے قطعاً یقین نہیں آیا کہ صرف ایک خیالی بنیاد پر نامرادیوں کا وہ طلسم ٹوٹ جائے گا جسے توڑنے کے لئے عمر بھر کی جدوجہد بھی بیکار ثابت ہوئی ہے۔ اس کا ذہن کسی طرح اسے قبول نہیں کر رہا تھا کہ سید شریف کے یہاں جو بچہ تولد ہوا ہے اس کے پیچھے کسی کا روحانی تصرف کارفرما ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر چیز کے ظہور کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ جب اس کا وقت آجاتا ہے تو وہ چیز خوب بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ عالم ہستی کا یہ کارخانہ ہمیشہ اسی ڈھنگ پر چلتا رہے گا۔ بیوی کی زبان سے سرا قصہ سن کر بھی اس کی مایوسی اپنی جگہ بدستور قائم رہی۔

لیکن بیوی کے دل کا حال بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہ ہر وقت اس یقین کے اجالے میں رہتی تھی کہ شریف کی بیوی کی کہانی کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ اگر اس کی اجڑی ہوئی گود کی آبادی میں شہید کربلا کے روحانی فیضان کا دخل نہیں ہوتا تو کیا اسے ہزاروں روپے کاٹ رہے تھے جو اس نے خراج عقیدت کے طور پر فقیروں میں لٹائے تھے۔

امید و خوشی عقیدگی کے اسی ہجوم میں اس کی زندگی کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ کئی مہینے گزرنے کے بعد ایک دن اسکے شوہر نے ایسا سخت طعنہ دیا کہ اس کے یقین کا آبگینہ گھائل ہو کے رہ گیا۔ اس دن سے وہ بہت اداس رہنے لگی۔ شاخ سے ٹوٹ جانے والے پتے کی طرح اس کے چہرے کی تمام رونقیں اڑ گئیں، اب شریف کی بیوی سے ملنا جلنا بھی اس نے کم کر دیا۔ اپنی زود اندیشی پر دل ہی دل میں اسے پشیمانی کا احساس بڑھنے لگا۔

اب پھر اس کی امیدوں کی دنیا تاریک ہوگئی۔ دل کا حال پھر اسی مقام پر پلٹ آیا جہاں سے دسویں محرم کو اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

انہی پر سوز اور جاں گسل مرحلے سے وہ گزر رہی تھی کہ اچانک ایک دن اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی مرکز تمنا کی وہ حامل ہوگئی ہے۔ لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ ہوسکتا ہے یہ احساس کے لاشعور کی کوئی مصنوئی کیفیت ہو۔ بات ابھی چونکہ وہم کے درجے میں تھی اس لئے اس نے اس کا انکشاف کسی پر نہیں کیا۔ لیکن دوسرے مہینے میں جب یقین ہوگیا کے آثار پوری طرح نمایاں ہوگئے اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جب اس نے اپنے شوہر کو اس کی اطلاع دی تو فرط حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے خودی کی حالت میں وہ پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔

اسی والہانہ کیفیت میں اس نے پھر دریافت کیا .... "میرے سر کی قسم کھا کر کہو کہ تم غلط نہیں بول رہی ہو۔"

بیوی نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا .... غلط وہاں بولا جاتا ہے جہاں غلطی چھپائی جا سکتی ہو۔ یقین کرو یہ بالکل واقعہ ہے۔ میں تمہیں جھوٹی خبر نہیں دی۔

ویسے آج نہیں تو کل میرا سچ جھوٹ ظاہر ہو ہی جائے گا۔ وقت کا انتظار کرو۔

شہر کی سب سے مشہور دایہ نے بھی جب اس کی تصدیق کر دی تو شوہر کی مسرتوں کا عالم بے قابو سے باہر ہو گیا۔

فرطِ ندامت سے وہ اپنا منہ پیٹنے لگا۔

کربلا والے شہید، میری غلطی معاف کر دو۔ میں نے تمہاری روحانی شکتی کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اپنی لاعلمی سے میں نے تمہارے ادھیکار کا ایمان کیا ہے .... دیالو مہاراج! میں اپرادھی ہوں ...... اپنی کرپا سے مجھے چھما کر دو۔"

اسی دن شام کو ایک عرصے کے بعد سنار کی بیوی شریف کے گھر گئی اور ان کی بیوی سے سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ یہ خبر سن کر خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسوں امنڈ آئے۔ اسے سب سے زیادہ مسرت اس بات کی ہوئی کہ اسے اپنے عقیدے کی صحت کا دوسرا تجربہ حاصل ہوا۔ اس کی مسکراہٹوں کی جگمگاہٹ میں سنار کی بیوی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا .... "دل کا یقین اپنا اثر لائے بغیر نہیں رہتا۔ یاد کرو میں نے تم سے اسی دن کہہ دیا تھا کہ مشکل کشائی کے لئے وہاں دھرم نہیں دیکھا جاتا، فریادی کا سوز و اخلاص دیکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ خدائے کریم خیر و سلامتی کے ساتھ اس آغاز کو انجام تک پہنچائے۔"

سنار کی بیوی نے جواب میں کہا۔

"بی بی .... اپنی سرگزشت کہتی ہوں یقین کرو میرا ستارہ گہن میں آ گیا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ جس سرکار سے میں نے بنتی کی تھی انہوں نے فوراً ہی مجھے سنبھال لیا ورنہ میرے دل کا وشواس اٹھا جا رہا تھا۔ آج میں سوچتی ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔

کبھی کبھی تو ایسی ہوک اٹھتی ہے کہ کربلا کی جس بھومی پر ان کا راج سنگھاسن رکھا ہوا ہے اسے آنکھوں سے لگا کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

بہن! آج میں نے مان لیا کہ سارے جگت میں اسلام کی روحانی شکتی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو ماننے کے قابل یہی درھم ہے جس پر چل کر آدمی ایسا اَسر ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی روح کے گیان کا سوتا نہیں سوکھتا۔

خیر سے دن گزر گئے تو میں بھی سرکار کے نام پر فقیروں کو خیرات لٹاؤں گی۔ اسی دن سارے شہر کو معلوم ہوگا کہ میرے دل کے اندھ شواس میں کیا جادو تھا۔ اب سنسار میں میرا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے انہی کے چرنوں میں تج دیا ہے۔

آج صبح ہی سے سنار کے گھر پر شہنائی بج رہی تھی۔ اندر سے لیکر باہر تک سارا ماحول خوشی کی لہروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور سے رشتہ داروں کی سواریاں اتر رہی تھیں۔ دوسری طرف شہر کے سارے فقیر ہجوم لگائے کھڑے تھے۔

آج اس کے یہاں بچی تولد ہوئی تھی۔ دل کی انجمن میں ارمانوں کا پہلا چراغ جلا تھا۔ ممتا کی ویران محفل آج پہلی بار آباد ہوئی تھی۔ فقیروں کو خیرات لٹاتے ہوئے فرطِ مسرت سے سنا کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ وہ بے خودی کی حالت میں زور زور سے چلا رہا تھا۔

"شہید کربلا کا اقبال سلامت! آج انہی کی کرپا سے ہمارا گھر جگمگا رہا ہے۔ ایک اسی مری ہوئی حسرت جی اٹھی ہے جس کے لئے سارے جہاں کی خاک چھان کر ہم مایوسی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئے تھے۔"

فقیر اپنی جھولیاں بھر کر دعائیں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ایک دو روز کے بعد باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی بھیڑ بھی چھٹ گئی۔ بہت سے مہمانوں کو سنا اور اس کی بیوی کا یہ انداز پسند نہیں آیا کہ وہ ہندو دھرم رکھ کر مسلمانوں کے پیر پیغمبر کے گن گا رہے تھے۔ بعض عورتوں سے سنار کی بیوی نے جھگڑا بھی کیا اور وہ روٹھ کر چلی گئیں لیکن اس نے ان کے روٹھنے کی کچھ پرواہ نہیں کی۔

چھٹی کی رسم سے فراغت کے بعد اب لاڈلی بچی کی پرورش و پرداخت کا اہتمام شروع ہوا۔ کئی کئی ماماَئیں رکھی گئیں۔ ناز و نعمت کے سارے سامان فراہم کر دیئے گئے۔

بچی کیا تھی؟ حسن و زیبائی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک مورت تھی۔ جو دیکھتا حیران و ششدر رہ جاتا۔ سارے شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر مشہور ہو گئی کہ سنار کے گھر میں آسمان کی زہرہ اتر آئی ہے۔

ماں باپ پیار سے اسے لالہ کہتے تھے۔ آگے چل کر یہی نام سب کی زبانوں پر چڑھ گیا۔ لالہ جب ذرا ہوشیار ہو گئی اور باتیں کرنے لگی تو اس کی تعلیم و تربیت کا نہایت معقول اور اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ اسی نکھرے ہوئے ماحول میں دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ چودہ سال کے سن میں پہنچتے پہنچتے وہ اس زمانے کے رواج کے مطابق سارے علم و ہنر میں یکتائے روزگار بن گئی۔ اس کے ظاہر کے حسن دلفریب ہی کیا کم تھا کہ اب وہ معنوی جمال سے بھی آراستہ ہو گئی تھی۔

شباب کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد تو وہ مجسم ساحرہ معلوم ہوتی تھی۔ پری زاد کی طرح اس کا غیر معمولی حسن سارے علاقے میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ ماں باپ اسے بچپن ہی سے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اور اب تو سوائے بادِ صبا کے کوئی اس کی خواب گاہ کے دروازے تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ گھر والوں کو چھوڑ کر وہ باہر کی عورتوں سے پردہ کرتی تھی۔ ایسی باحیا اور غیور فطرت لے کر پیدا ہوئی تھی کہ کبھی کبھی آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر رو پڑتی تھی، اسے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہا کرتی تھی کہ ہوس پرستوں اور بدقماشوں کی اس دنیا میں وہ کہاں اپنے لئے چھپنے کی

جگہ تلاش کرے۔ کب تک ننگی تلواروں کا پہرہ اس کے حسن جہاں تاب کی حفاظت کرے گا۔

جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی وہ شہید کربلا کی عقیدت میں ہروقت شرابور رہا کرتا تھا۔ بار بار پر اس کی ماں کربلا والے سرکار کی دہائی دیا کرتی تھی۔ ویسے تو شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کربلا والے سرکار کے گھر کی بھیک میں ملی ہے لیکن اب قدم قدم پر ان کی عقیدت کے ہنگامہ شوق نے اسے ایسا وارفتہ عشق بنادیا تھا جیسے کربلا کی خاک سے اس کی سرشت تیار ہوئی ہو۔

اسی دلگیر تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ سال میں صرف ایک بار دسویں محرم کو سید شریف کی مجلس میں شرکت کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلتی تھی۔ کربلا کی دردانگیز سرگزشت سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔ مجلس سے اٹھنے کے بعد بھی کئی دن تک اس کی پلکوں کا آنسو جذب نہیں ہوتا تھا۔ سبز جوڑا پہن کر جب وہ مجلس کے لئے تیار ہوجاتی تو ایسا لگتا تھا کہ کسی شاداب چمن کی ساری رعنائیاں اس کے دامن میں سمٹ آئی ہیں۔ خواتین کی بزم مین پہنچ کر وہ ماہ کامل کی طرح سب میں نمایاں روشن رہتی تھی۔

جب اس کی عمر اٹھارہ سال ہوگئی تو والدین کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ سارے علاقے میں اس کے حسن وشباب کی قیامتوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ غائبانہ طور پر اس کے عشاق کی کمی نہیں تھی۔ سینکڑوں دیوانے صرف گھر کے دیدار کے لئے آتے رہتے تھے جو اس کی غیرت مہ وانجم کی چاندنی کا گہوارہ تھا۔

بڑے بڑے راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں کے پیغامات کا انبار لگ گیا۔ علاقے کے جاگیردار کا بیٹا تو ہزار جان سے اس پر شیفتہ تھا۔ صبح وشام اٹھتے بیٹھتے اسی کے نام کی مالا جپتا تھا۔ وہ بڑا ہی ضدی، ہوس پرست اور عیاش قسم کا نوجوان تھا۔ قوی ہیکل غنڈوں کا ایک گروہ اس نے پال رکھا تھا جو اس کی شبستان عیش کو گرم رکھنے کے لئے آئے دن دوشیزاؤں کے گھروں پر چھاپہ مارتے رہتے تھے۔ بڑے نازوں کا پلا ہوا اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ساری ریاست میں اس کی راج ہٹ مشہور تھی۔

سنار کی بیٹی کے حسن وجمال کا شہرہ سن کر وہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس کے حاصل کرنے کی ساری کوششیں جب بیکار گئیں تو اداس وملول چہرہ بنائے ہوئے وہ اپنی ماں کے پاس آیا اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"جونپور کے سنار کی بیٹی سے اگر میری شادی نہیں ہوئی تو میں زہر کھا کر جان دے دوں گا۔" اس کی ماں خاندانی راجپوت کی بیٹی تھی۔ اس کی آن بان کسی رانی سے کم نہیں تھی۔ بیٹے کی زبان سے اس طرح سن کر للکارتے ہوئے کہا۔

"راجپوت ہوکر ایک معمولی بات کے لئے تم نے اتنی بڑی قسم کھالی ہے۔ سنار کی کیا مجال ہے کہ وہ راج دربار کے حکم کی سرتابی کرے۔ اس کا گھر پھنکوادوں گی اور اس کی بیٹی کو لونڈی بنا کر رکھوں گی۔ تم ناحق فکر کرکے اپنی جان مت گھلاؤ۔ ویسے یہ رشتہ تمہاری برابری کا نہیں ہے لیکن تمہاری ضد پوری کرنے کے لئے سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

دوسرے دن اپنی مخصوص دائی کے ذریعے اس نے رشتے کا پیغام سنار کے گھر بھیجا۔ سنار کی بیوی نے پیغام سن کر جواب دیا۔

"اور بھی بہت سے پیغامات آئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ راج ماتا سے کہہ دینا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔"

جاگیردار کی بیوی یہ جواب سن کر غصے سے سرخ ہوگئی۔ پیچ وتاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

"دیکھنا ہے وہ آسمانی حور شادی کہاں کرتی ہے۔ دلہن کی سجی سجائی ڈولی دروازے پر نہ منگواؤں تو میں راجپوت کی بیٹی نہیں۔"

ایک دن لالہ کی ماں نے بیٹی کا رخ معلوم کرنے کے لئے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

"بیٹی زمانے کا یہ دستور ہمیشہ سے چلا آرہا ہے کہ لڑکیاں جب سیانی ہوجاتی ہیں تو انہیں پرایا گھر آباد کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے پیغامات آرہے ہیں۔ اجازت دو تو تمہارے ہاتھ پیلے کرنے کا انتظام کیا جائے۔"

لالہ نے شرم سے منہ ڈھانپ لیا اور لجائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے تم پرائے گھر بھیجنا ہی چاہتی ہو تو میرا بر ایسی جگہ تلاش کرنا جو اتنا پارسا ہو کہ کسی غیرعورت کو بری نظر سے بھی نہ دیکھا ہو۔"

بیٹی کے مزاج اور اس کی روح کی نفاست سے گھر والے بخوبی واقف تھے۔ قد وقامت اور صورت وشکل ہی نہیں اس کے خصائل وعادات بھی عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس کے ذوق طبیعت کا پیمانہ ہی سب سے جداگانہ تھا۔ دنیا کی عام روش سے ہٹ کر ایک تنہا اور منفرد طرز زندگی کی خوگر بن گئی تھی۔"

اس کا خیال معلوم کرنے کے بعد آئے ہوئے سارے پیغامات مسترد کردیئے گئے۔ ان میں سے کوئی بھی بیٹی کے پسند کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔

کافی عرصہ کے بعد ایک دن سنار کی بیٹی سید شریف کے گھر گئی۔ دوران گفتگو میں لالہ کے رشتے کی بات نکل آئی۔ سید صاحب کی بیوی نے دریافت کیا۔

"سنا تھا کہ لالہ کے لئے بہت سے پیغامات آئے ہیں۔ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا۔ زیادہ انتظار مت کرو۔ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر بچی کے ہاتھ پیلے کردو۔ جوان بیٹی سر پر بوجھ بنی رہتی ہے۔"

سنار کی بیوی نے اداس لہجے میں جواب دیا۔
بہن کیا بتاؤں؟ ہم لوگ بھی اس کے رشتے کے لئے بہت پریشان ہیں۔ جتنے بھی پیغامات آئے ہیں وہ سب واپس کر دیئے گئے۔
درمیان میں بات کاٹتے ہوئے سید صاحب کی بیوی نے دریافت کیا...... " کیاان میں کوئی رشتہ بھی قبل قبول نہیں تھا؟
سنار کی بیوی نے معذرت خواہ لہجے میں جواب دیا...... "بہت سے رشتے خاندان کے معزز گھرانوں سے آئے تھے۔ کچھ رشتے راجاؤں اور جاگیرداروں کے بھی تھے۔ لیکن لالہ نے ایک ایسی شرط لگادی ہے کہ انہیں واپس کرنا پڑا۔
بہن! تمہیں بھی اس سے انکار نہیں ہوگا کہ یہ سوداز بردستی کا نہیں ہے۔ بچی کی مرضی کے خلاف کوئی رشتہ اس کے سر پر مسلط کرتے ہوئے ڈرلگتا ہے۔ وہ بے چھوئی ہوئی شاخ کی ایک نازک کلی ہے کہیں مرجھا گئی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ بچی کا کہنا ہے کہ میرا بر کسی ایسی جگہ تلاش کرو جو ایسا پارسا ہو کہ کسی عورت کو بری نگاہ سے بھی نہ دیکھتا ہو۔ کئی مہینے سے لالہ کے بابوجی ایسے بر کی تلاش میں نگر نگر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ تحقیق کرنے پر کوئی نہ کوئی خامی ضرور نکل آتی ہے۔ ہم اپنی لالہ کے ساتھ دھوکہ نہیں کریں گے۔ جب تک ایسا بر نہیں مل جائے گا ہم ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔"
سارا قصہ سننے کے بعد سید شریف کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا تمہاری لالہ جس گھر کی خیرات میں ملی ہے اس کی دیواروں کا سایہ تو اس پر پڑنا ہی چاہیئے۔ برا نہ مانو تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی اور طرف جارہی ہے۔ اس کی راہ میں حائل ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ سنا کی بیوی نے چونک کر دریافت کیا۔
"بہن تمہاری بات کا مطلب میں نہیں سمجھ سکی۔ کیا نصیب دشمناں میری لالہ کے دن خراب آنے والے ہیں؟"
سید شریف کی بیوی نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا..... "توبہ کرو کیسی منحوس بات تم اپنی زبان سے نکال رہی ہو۔ تمہاری لالہ پر پاک روحوں کا سایہ ہے۔ کبھی اس کے خراب دن نہیں آسکتے۔ دراصل میری بات کا مطلب یہ تھا کہ اس کی زندگی کی باگ ڈور کسی بالائی طاقت کے ہاتھ میں ہے۔"
تھوڑی دیر کے بعد جب سنار کی بیوی اپنے گھر واپس گئی تو شوہر اس کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آج اس کا چہرہ بہت شگفتہ تھا۔ اپنی خوشی کو ضبط نہ کرسکا۔ نظر پڑتے ہی چیخ اٹھا۔
"مبارک ہو بچھی! بہت ہی شاندار اور بھروسے کے لائق بر مل گیا۔ یہاں سے سات میل کے فاصلے پر نورالدین پور نام کا جو گاؤں ہے، وہیں برادری کا ایک لڑکا ہے جس کی عمر پچیس سال ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے اسے ایک پہنچے ہوئے فقیر کی صحبت نصیب ہوگئی تھی۔ آج تک اس نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ محلے کے لوگ بھی اسے نہیں پہچانتے۔ اپنے باپ سے اس نے زرگری کا فن سیکھ لیا ہے۔ گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے گزر بسر کے لائق کما لیتا ہے۔ اس کی صرف ایک بوڑھی ماں ہے، مدت ہوئی باپ کا انتقال ہوگیا۔ سارا گاؤں اس بات کا شاہد ہے کہ آج تک اس نے کسی غیر عورت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ہے۔ بہت ہی نیک پاک دامن اور شرمیلا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ صورت شکل تو ایسی پائی ہے کہ دل میں بٹھا لینے کو جی چاہتا ہے۔ ویسے اس کے گھر میں دھن دولت نہیں ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور صحت مند ہے۔ اپنی ماں سے اس نے بھی کہہ رکھا ہے کہ میرا بر ایسی جگہ تلاش کرنا جس لڑکی نے ساری زندگی کسی غیر مرد کا چہرہ نہ دیکھا ہو۔"
بیوی یہ تفصیل معلوم کر کے باغ باغ ہوگئی اس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ رشتہ منظور کر لینا چاہئے۔ دھن دولت کوئی چیز نہیں ہے۔ لڑکا کھرا ہے تو ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ مالک کا دیا بہت کچھ ہے۔ مالک نام لیکر کل شبھ گھڑی میں منگنی کی رسم ادا کر آیئے۔"
میاں بیوی کے مشورے سے یہ رشتے طے پا گیا۔ دوسرے دن سنار نے منگنی کی رسم ادا کردی اور خوشی خوشی واپس لوٹ آیا۔
سید شریف کی بیوی نے بھی اس رشتے کو بیحد پسند کیا۔
لڑکے کی طرف سے شادی کے جملہ رسومات کا خرچ بھی سنار ہی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اب دونوں طرف نہایت دھوم دھوم سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ بہت سے لوگ اچنبھے میں اس خوش نصیب کو دیکھنے کے لئے اس گاؤں پہنچ گئے لیکن گھر ہی دیکھ کر انہیں واپس لوٹ آنا پڑا۔
آج سنارے کے گھر میں مسرت ش نشاط کی فصل بہار آگئی تھی۔ اندر سے باہر تک ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ بڑی آرزوؤں کے بعد اکلوتی بیٹی کی شادی کے یہ دن نصیب ہوئے تھے۔ ارمانوں کے ہجوم میں آج لالہ دلہن بنائی جارہی تھی۔ ایک مہینے تک ہلدی کے ابٹن نے اسے آب زر کی طرح چمکا دیا تھا۔ فنکار مشاطاؤں نے جن اسے بنا سنوار کر حجلہ عروسی میں پہنچایا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو کے رہ گئیں۔ شفاف جھیل کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں میں کاجل کی لکیر کالی گھٹاؤں کے افق پر سفید افشاں کی جگمگاہٹ اور بیچ میں سیندور کی لالی، موسم برسات کے ڈوبتے ہوئے سورج کی تصویر اتار لائی تھی۔ ہزار اہتمام کے باوجود گھونگھٹ کا چلمن اس ماہ وش کی چاندنی پر حائل نہیں ہوسکا تھا۔ فرط حیا سے جھکی ہوئی پلکوں کا عالم

سوئی ہوئی قیامت کا صحیح نمونہ تھا اور شادی کا سرخ جوڑا زیب تن کر لینے کے بعد تو ایسا لگتا تھا کہ کسی لالہ زار کی پری اتر آئی ہے۔

آج حسن وشباب کا عروج اس نقطۂ انتہا پر پہنچ گیا تھا کہ اجنبی نگاہوں پر پہرے بٹھادیئے گئے تھے۔ اپنے وقت کی سینکڑوں مہ لقائیں محروم واپس لوٹ گئیں جو اس زہرہ جمال کا شہرۂ حسن سن کر صرف ایک جھلک دیکھنے کا اشتیاق لے کر آئی تھیں۔ سید شریف کی بیوی کے سوا گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھنے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔

شام ہوتے ہی شہر کے معززین جمع ہونے لگے۔ اب بارات کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ فانوسوں کے نقاب میں جلتے ہوئے چراغوں کی لمبی قطار بارات کے آگے آگے چل رہی تھی۔ جونہی بارات دروازے پر پہنچی دولہا کو دیکھنے کے لئے ہزاروں شائقین کا مجمع ٹوٹ پڑا۔ دیکھنے والوں کو اس سے زیادہ اور کچھ نظر نہیں آیا کہ پھولوں کی لڑیوں میں ایک شرم وحیا کا مجسمہ چھوئی موئی کی طرح سمٹا ہوا تھا۔ سب سے پہلے عورتوں نے ہندو دھرم کے مطابق دولہا کی آرتی اتاری اس کے بعد منڈپ میں ایک مخصوص جگہ پر اسے بٹھادیا گیا۔

رات جب ڈھل گئی تو شہر کے وقت کا منظر بڑا ہی رومان انگیز تھا۔ پہلی مرتبہ آئینے کے اندر دولہا نے ایک زہرہ جمال دوشیزہ اور پارسا دلہن کے چہرے کا عکس دیکھا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر حسن وزیبائی کے تیر وترکش سے مسلح تھے۔ دونوں کے نازک آبگینے نظر کی چوٹ سنبھال نہیں سکے۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی اور آنکھیں بند ہوگئیں۔

دوسرے دن دوپہر ڈھل جانے کے بعد رخصتی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دلہن کی پالکی دروازے پر لگادی گئی۔ جس لاڈلی بیٹی کو بیس سال تک پلکوں کے سائے میں پالا تھا آج اسے جدا کرتے ہوئے ماں کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ رخصت کی گھڑی قیامت سے کم نہیں تھی۔ باپ کو غشی پر غشی آرہی تھی۔ ماں شدت کرب سے پاگل ہوگئی تھی۔

سید شریف کی بیوی لالہ کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں دروازے تک لے گئی۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر کربلا والے سرکار کی دہائی دی اور پالکی میں سوار کرادیا۔

آہ نالہ اور گریہ بکا کے شور میں لالہ پرائے گھر کے لئے رخصت ہوگئی۔ کہاروں نے دلہن کی پالکی اٹھائی، دولہا کی سواری آگے بڑھ گئی۔

جب سے ایک غریب سنار کے ساتھ لالہ کی شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جاگیردار کی راجپوتنی بیوی غیظ غضب وحسد کی آگ میں جل رہی تھی۔

آج آتش انتقام کے بھڑکنے کا دن تھا۔ صبح ہی سے اس کے ہرکارے منٹ منٹ کی خبر دے رہے تھے۔ عین دوپہر کے وقت ایک مخبر نے آکر اطلاع دی کہ خبر ملی ہے کہ سورج ڈھلنے کے بعد دلہن رخصت کردی جائے گی۔

یہ خبر سنتے ہی راجپوتنی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تیوری چڑھا کر اس نے اپنے جوان بیٹے سے کہا۔ "تیری نسوں میں راجپوت کا سچا خون ہے تو آج سورج ڈوبنے سے پہلے سنار کی بیٹی پالکی راج محل کے دروازے پر لگ جائے۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس ہوسکتا ہے لیکن راجپوت کی قسم واپس نہیں ہوسکتی۔"

بیٹے نے فاتحانہ تیور کے ساتھ جواب دیا.... "کسی طرح کا چنتا مت کرو ماں! سارا انتظام مکمل کرلیا گیا ہے۔ نورالدین پور کے راستے میں جو گھنا جنگل پڑتا ہے وہاں ہتھیاروں سے مسلح ہوکر ہمارے سپاہی پہنچ گئے ہیں۔ میں بھی چند سپاہیوں کے ساتھ وہیں جارہا ہوں۔ انتظار کرو شام ہوتے ہوئے پالکی راج محل کے دروازے پر لگ جائے گی۔"

نورالدین پور سے میل بھر کے فاصلے پر ایک جنگل پڑتا تھا جس کی لمبائی آدھ میل اور عرض تین میل کا تھا۔ سورج کی ٹکیہ تیزی سے افق کی طرف ڈھل رہی تھی۔ کہار دولہا اور دلہن کی پالکیاں لئے ہوئے اتنے تیز قدموں سے چل رہے تھے کہ باراتی پیچھے رہ گئے۔ جونہی بیچ جنگل پہنچے قریب ہی سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور پلک جھپکتے ننگی تلوار چمکاتے ہوئے دس پندرہ کڑیل جوانوں نے پالکیوں کو گھیر لیا۔

کہار اپنی جان کے خوف سے بے تحاشہ پالکی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سنسان جنگل میں دو ننھی جانوں کا اب کوئی محافظ نہیں رہ گیا تھا۔ جاگیردار کا بیٹا شراب میں بدمست تھا۔ قریب آکر اپنے ساتھیوں کو للکارتے ہوئے کہا۔ ان دونوں پالکیوں کو اٹھا کر جنگل کے اندر فوراً لے چلو۔ عام رہ گزر پر رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہیں دولہا کا کام تمام کرکے نئی نویلی دلہن کے ساتھ پہلی رات کی ملاقات کی جائے گی۔

اچانک ایک غیر متوقع حادثے سے لالہ پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ دماغ ماؤف ہوکے رہ گیا تھا۔ ہوش جواب دے چکے تھے۔ یہ خوفناک آواز سنتے ہی لالہ کا خون سوکھ گیا۔ سب سے زیادہ ناموس کی فکر تھی، جان کے لالے الگ پڑے ہوئے تھے۔ دولہا اپنی پالکی سے جست لگانا ہی چاہتا تھا کہ دو سپاہیوں نے اسے رسی سے جکڑ کر باندھ لیا دیا اور نہایت سرعت کے ساتھ دونوں پالکیوں کو اٹھا کر جنگل کے اندر لے چلے اور بیچ جنگل میں پہنچ کر گھنی جھاڑیوں کے درمیان انہیں رکھ دیا۔ اس کے بعد رسی میں جکڑے ہوئے دولہا کو پالکی سے باہر نکالا اور اسے قتل کرنے کے لئے دو سپاہی تلوار لے کر کھڑے ہوگئے۔ تلوار اٹھانا ہی چاہتے تھے کہ لالہ اس منظر کی تاب نہ لاسکی۔ وحشت اضطراب میں پالکی سے باہر نکل آئی اور ایک مظلوم فریادی کے لہجے میں کہا۔

"پہلے مجھے قتل کردو میں اپنے پتی کا خون نہیں دیکھ سکوں گی۔"

لالہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ہیبت جمال سے قاتلوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہاتھ لرزے اور تلوار چھٹ کر گر پڑی۔ اتنے میں جاگیردار کا بیٹا نشے کی حالت میں لالہ کے قریب پہنچ گیا اور خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"اب اس وقت سے میں تمہارا پتی ہوں۔ بھول جاؤ اپنے اس پتی کو جس نے میری راہ میں حائل ہو کر اپنا خون حلال کر لیا۔"

یہ کہتے ہوئے لالہ کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ بے ساختہ لالہ کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔

"یاحسین! میری لجا کو بچاؤ۔"

یہ کلمہ سن کر جاگیردار کا بیٹا غصے سے تلملا اٹھا اور دانت پیستے ہوئے کہا...... "ہندو دھرم کی لڑکی ہو کر مسلمانوں کے دیوتا کو پکارتی ہے۔ دیکھتا ہوں کون تجھے اور تیرے پتی کو میرے ہاتھ سے بچاتا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سپاہیوں کو للکارا۔ اب دیکھتے کیا ہو تلوار اٹھا کر اس کے پتی کے دو ٹکڑے کر دو۔ اور اس ادھری لڑکی کو شکنجے میں کس کر گھوڑے پر باندھ دو۔ اب پالکی پر لاد کر لے جانے کا وقت نہیں ہے۔ ماں کو بچن دے چکا ہوں کہ سورج است ہونے سے پہلے پہلے راج محل کے دروازے پر سنار کی بیٹی پہنچ جائے گی۔"

اس کی آواز پر سپاہی سنبھل کر کھڑے ہو گئے اور زمین پر گری ہوئے تلوار کو دوبارہ اٹھا لیا۔ ادھر دو سپاہی رسیوں کا گچھا لے کر لالہ کے قریب پہنچ گئے۔ امیدوں کا چراغ گل ہونے میں اب صرف پلک جھپکنے کی دیر تھی۔ لالہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ تلوار اٹھ چکی تھی۔ شکنجوں میں کسنے والے ہاتھ لالہ کے جسم کے قریب پہنچ چکے تھے۔ امیدوں کے خون کے ساتھ انتظار کی گھڑی ختم ہو چکی تھی اور اب کربلا والے سرکار غیبی امداد کے یقین کا آبگینہ ٹوٹنے ہی والا تھا کہ اچانک فضا میں ایک بجلی کوندی، ایک تلوار چمکی اور کڑکتی ہوئے دھمک سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھوں کے پٹ کھلے تو زمین پر پندرہ لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ رسیوں میں جکڑے ہوئے شوہر کی گرہیں کھل چکیں تھیں اور وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

جذبہ عقیدت کی بے خودی میں لالہ اور اس کے شوہر کی پیشانی حسین کے خدا کا سجدۂ شکر ادا کرنے کے لئے بیساختہ زمین پر جھک گئیں۔ کربلا والے سرکار کی چمکتی ہوئی تلوار سے کافر ہی نہیں قتل ہوئے لالہ اور اس کے شوہر کا آبائی کفر بھی قتل ہو کے رہ گیا تھا۔

اب ان کے سینے میں ایک مومن کا دل جگمگا رہا تھا۔

جان کے خوف سے بھاگے ہوئے کہاروں نے نورالدین پہنچ کر سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ خبر سنتے ہی سارے گاؤں میں کہرام برپا ہو گیا۔ بجلی کی طرح سارے علاقے میں اس واقعہ کی خبر پھیل گئی۔ جس نے جہاں سنا وہیں سے جنگل کی طرف دوڑ پڑا۔ سنار اور اس کی بیوی کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ شدت کرب سے پاگل ہو گئے اور کلیجہ پیٹتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں واقعہ پیش آیا تھا۔ لالہ کی ساس بھی بین کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ دم کے دم میں ہزاروں افراد کا میلہ لگ گیا تھا۔ ہر شخص اس واقعہ کے اضطراب سے بے چین سید شریف کی بیوی بھی افتاں وخیزاں وہاں پہنچ گئی تھی۔

پالکیوں کی تلاش میں لوگ مشعل لیکر جنگل کے اندر گھس گئے۔ کافی مسافت طے کر لینے کے بعد ایک جھ جھاڑیوں کے جھنڈ میں انہیں کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ وہاں پہنچے تو سب پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پالکیاں خالی پڑی ہوئیں تھیں۔ جھلسے ہوئے چہروں کے ساتھ میں پر لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ رسیوں کی کنڈ الگ پڑی ہوئی تھی۔ تلواریں چمک رہی تھیں لیکن ان میں خون کا دھبہ نہیں تھا۔ حیرانی کے عالم میں لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ چند ہی قدم کے فاصلے پر سید شریف کو سرخ پیراہن کی ایک جھلک نظر آئی۔

مشعل لیکر آگے بڑھے تو دیکھا کہ دولہا اور دلہن زمین پر ماتھا ٹیکے ہوئے سجدے کی حالت میں بے خبر پڑے ہیں۔

وفور حیرت میں منہ سے چیخ نکل پڑی۔ دولہا، دلہن مل گئے۔ اس آواز پر سب لوگ بے تحاشہ دوڑ پڑے۔ نبض دیکھی تو چل رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کا عالم طاری تھا۔ سنار، اس کی بیوی اور دولہا کی ماں جوڑے کو سلامت پا کر خوشی سے پاگل ہو گئے تھے۔

طلسم ہوشربا کی طرح یہ واقعہ پراسرار ہو گیا تھا۔ حیرت کی گرہ کھولنے کے لئے ظاہری اسباب کی کوئی کڑی نہیں مل رہی تھی، ہوش آنے کے بعد بھی دولہا اور دلہن سکتے کے عالم میں تھے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ فوراً ہی انہیں پالکی پر لاد کر جونپور لایا گیا۔ رات بھیگ چکی تھی لیکن کئی ہزار آدمیوں کا ہجوم سنار کے دروازے پر ٹھٹھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ دولہا اور دلہن کی زبان سے واقعہ کی حیرت انگیز تفصیل معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے۔

اپنی مانوس پناہ گاہ میں پہنچ کے لالہ اب پوری طرح ہوش میں تھی۔ دولہا بھی سکتے کی حالت سے باہر نکل آیا تھا۔

"ماں سے برداشت نہیں ہو سکا تو اس نے لالہ سے دریافت کیا۔ بیٹی! کیا واقعہ پیش آیا کچھ تو سنا دو۔ عق کام نہیں کر رہی ہے، دماغ پھٹا جا رہا ہے۔"

لالہ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ایک ایک کر کے سارا واقعہ سنایا۔

سرگزشت کا آخری حصہ بیان کرتے ہوئے رقت انگیز جذبات کے تلاطم میں ڈوب گئی۔ بڑی مشکل سے یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل سکے۔

" کربلا والے سرکار کو آواز دیتے ہی برق آسا ایک تلوار چمکی، ایک بجلی کوندی اور دہشت سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے بعد کس طرح کیا ہوا معلوم نہیں!

کچھ دیر کے بعد آنکھوں کے پٹ کھلے تو اتنا دیکھا کہ زمین پر بے جان لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ سجدۂ شکر کے لئے زمیں پر گر پڑے۔"

کہانی یہاں تک پہنچ پائی تھی کہ جذبات میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ حسین کے نعروں سے سارے گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ بے خودی کے کیف میں لالہ کی ماں کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخ پڑی۔

"حسین! تم سچے تمہارا دھرم سچا اور تمہارے جس نانا جان نے تمہاری آتما کو اتھاوہ شکتی بخشی ہے وہ سچے۔"

حسین! تم گواہ رہنا کہ آج سے میں تمہارے نانا جان کا دھرم قبول کرتی ہوں۔ آج ایمان و اسلام کی سچائی کا آفتاب سوا نیزے پہ چمک رہا تھا۔

واقعات کے راویوں کا کہنا ہے کہ اس دن دولہا اور دولہن کے متعلقین کے علاوہ ہزاروں افراد کربلا والے سرکار کی برکتوں سے مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

منکرین نے بھی مان لیا کہ خاصان خدا کی غیبی چارہ گری کا وقیدہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہے! ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے۔ دل اگر بے یقینی کے آزار میں نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے شکست نہیں دے سکتی۔

دل ہی ڈبوئے دل ہی اترائے   دل دوست نہ دل ا دشمن

ایک دوشیزہ

پنڈت لالہ رام کاسی کے پنڈتوں کا ایک نہایت مشہور گھرانہ تھا۔ اطراف ہند کے سینکڑوں جاتری ہر وقت اس کے مہمان خانے میں بھرے رہتے تھے۔ جائیداد بھی اچھی خاصی تھی۔ برادری کے لوگ بھی اعتماد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کم وبیش سارے بنارس کے لوگ پنڈت جی کو جانتے تھے۔ شہرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہزار تمناؤں کے بعد ادھیڑ عمر میں ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ بچی کیا تھی جمال وزیبائی کی مورت تھی۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کہاں نہیں ہوتی، لیکن اس گھر کا قصہ بڑا عجیب وغریب ہو گیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب تک ماں باپ اپنی بچی کا منہ نہیں دیکھ لیتے تھے کسی چیز کو دیکھنا حرام سمجھتے تھے۔ بچی نے جیسے ہی شعور کی منزل میں قدم رکھا اس کی تعلیم وتربیت کے لیے کئی اتالیق مقرر کر دیئے گئے۔ قامت ورخ کی دل کشی کے ساتھ ساتھ عقل وذہانت بھی اسے غضب کی ملی تھی۔ چودہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ علم وہنر میں یکتائے روزگار ہوگئی۔

حسن کی شہرت کے ساتھ ساتھ اب اس کے علم وکمال کی چاندنی دور دور تک پھیل گئی تھی۔ صبح کے تڑکے جب وہ گنگا اشنان کرنے کے لیے نکلتی تھی تو راہ گزر میں سینکڑوں پروانے اپنی آنکھیں بچھائے کھڑے رہتے تھے۔ حیا اور پارسائی کی وہ ایک مجسمہ تھی۔ گھر سے نکلتے وقت پلکوں کی جو چلمن گرتی تھی وہ گھر ہی واپس آ کر اوپر اٹھتی تھی۔ گھاٹ یا راستے پر کبھی نظر اٹھا کر اس نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ سال میں ایک بار وہ ہنومان مندر میں پوجا کے لیے جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پوجا کے موقعہ پر وہاں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی۔ دور دور سے نادیدہ عشاق اس کے خرام ناز کا محشر دیکھنے کے لئے مندر کے آس پاس پجاری کے بھیس میں وہاں جمع ہو جاتے تھے۔

متھرا، اجودھیا اور ہندو دھرم کے تمام بڑے بڑے شہروں سے پیغام نکاح کا تانتا بندھا رہتا تھا لیکن ماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی لاڈلی بیٹی ایک لمحے کے لیے بھی اس کی پلکوں کی چھاؤں سے اوجھل ہو۔ وہ کوئی ایسا بر تلاش کرتی تھی جو ساری خوبیوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ گھر داماد بننے کے لیے بھی تیار ہو۔ اس لئے جتنے رشتے آتے تھے انہیں مسترد کر دیا جاتا تھا۔ ماں باپ پیار سے اپنی بیٹی کو شکنتلا کہتے تھے۔ بڑے ہونے پر یہی نام سب کی زبان پر جاری ہو گیا۔ اب شکنتلا کا نام گھر ہی کے لوگوں کے زبان پر نہیں تھا دور دور تک شکنتلا کے نام کی شہرت پہنچ گئی تھی۔

ٹھیک انہی دنوں میں حضرت اورنگ زیب کی حکومت کی طرف سے ابراہیم خان نامی ایک شخص بنارس کا کوتوال مقرر ہو کر آیا تھا۔ ابھی اسے آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ سارے بنارس میں اس کے خلاف دہشت پھیل گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک نہایت ظالم اور عیاش شخص تھا۔ اتنے دبدبے سے رہتا تھا کہ کوئی اس کے خلاف پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کے جاسوس گلی گلی چلمنوں کے پیچھے مہکتی ہوئی زلفوں کا سراغ لگاتے پھرتے۔ ایک دن جاسوس نے فاتحانہ انداز کوتوال کو یہ اطلاع بہم پہنچائی۔

"حضور ناحق پریشان ہیں۔ اپنے وقت کا سب سے چمکتا ہوا ہیرا تو اسی بنارس میں موجود ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پنڈت لالہ رام کی بیٹی شکنتلا اس کنول کا پھول ہے جو سارے جھیل میں ایک ہے کھلتا ہے۔ شہر کا بہت بڑا حصہ اس کے کاکل ورخ کا اسیر ہو چکا ہے۔ صبح سے شام تک نہ جانے کتنے گھائل اس کی گلی کا چکر کاٹتے ہیں اور اس دیوار سے اپنی آنکھیں سینک کر چلے آتے ہیں۔ وہ چلتی ہے تو قدموں کی آہٹ سے قیامت جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی خمار آلود آنکھوں میں جیسے میخانہ تیر تا رہتا ہے۔ کبھی وہ اپنی زلفیں بکھیر دیتی ہے تو ہر طرف کالی گھٹاؤں کا موسم امنڈنے لگتا ہے۔ اس کا ایک تبسم نہ جانے کتنے ناسوروں کا علاج ہے۔ اس کے روپہلے بدن رنگت اتنی نکھری ہوئی ہے جیسے کسی نے چاندی کا غازہ مل دیا ہے۔"

یہ سن کے کوتوال کے منہ میں پانی آ گیا حرص وہوس کا شیطان اس کی آنکھوں میں ناچنے لگا۔ اس کی فطرت کی درندگی اب بڑھتی ہوتی جارہی تھی۔ ایک بدمست شرابی کی طرح بہکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم اس کے گھر کا صحیح صحیح پتہ معلوم کر کے آؤ اور یہ بھی خبر لے کر آؤ کہ وہ اپنے گھر سے باہر کب نکلتی ہے۔"

دوسرے دن جاسوس نے ساری تفصیلات معلوم کر کے کوتوال کو یہ اطلاع دی۔

"کاشی کے فلاں محلے میں بالکل لب دریا اس کا گھر ہے۔ بالکل صبح سویرے وہ گنگا اشنان کرنے کے لیے اپنے گھر سے باہر نکلتی ہے۔ رات اور دن میں اس کے گھر سے نکلنے کا بس یہی وقت ہے۔"

آج کئی دن سے پنڈت لالہ رام کا چہرا اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ بیوی الگ پریشان تھی۔ شکنتلا الگ متفکر تھی۔

صحیح وجہ کسی کو نہ بتاتے تھے۔ بہت پوچھنے پر بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بیماری کی علامت بھی کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ یہ بہانہ چھپ سکے۔ بالآخر ایک دن ماں بیٹی دونوں بضد ہو گئیں کہ اپنی پریشانیوں کی صحیح صحیح وجہ بتایئے۔ کس نے آپ کو کیا کہا ہے۔ کس فکر میں آپ شب وروز غلطاں رہتے ہیں۔

بہت دیر تک تو پنڈت نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔ جب غم کا دباؤ قابو سے باہر ہو گیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں بیٹی بھی اپنے تئیں ضبط نہ کر سکیں۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

بڑی مشکل سے پنڈت نے اپنے دل پر قابو حاصل کی اور طبیعت تھم جانے کے بعد اصل واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔

"یہاں کے کوتوال کے متعلق ہوس پرستی اور عیاشی مزاجی کی جو داستانیں شہر میں مشہور ہیں وہ تم بھی جانتی ہو۔ اب بہو بیٹی کی آبرو اس کے حرص و آز کی زندگی سے محفوظ نہیں رہ گئی۔ جب تک کہ وہ عفت و عصمت کا کوئی تازہ خون نہیں کر لیتا اس کی رات چین سے نہیں کٹتی۔ آج تک ہمارے بنارس میں کوئی ایسا بدطینت، شقی القلب اور بدمست فرمانروا نہیں آیا تھا۔ آہ! کتنی مظلوم روحیں آج اس کے زخموں کی ٹیس سے بے چین ہیں۔ کسی کو کیا معلوم؟"

ابھی یہیں تک بات پہنچی تھی کہ وہ پھر پھوٹ پڑا اور پھر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ماں بیٹی پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ وہ سخت حیران تھیں کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کس صدمے نے اس طرح گھائل کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھ سکون ہوا تو پھر اس نے سلسلہ بیان کا آغاز کیا۔

آج چھٹا دن ہے کہ اس کے دو سپاہی بنگلے پر آئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ کوتوال صاحب نے بلوایا ہے۔ یہ خبر پا کر میرا کلیجہ سوکھ گیا۔ اس لیے کہ اس سنگدل کی سرشت سے واقف ہوں۔ بہر حال اس کی حکومت ہے۔ چار و ناچار مجھے جانا پڑا۔ لرزتے کانپتے جب میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنی کھڑی کھڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ایک تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے سپاہی جھٹ پٹ گئے تو اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے خبر ہے کہ شکنتلا نام کی تمہاری بیٹی ہے۔ وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو گئی ہے جب کہ کسی کے گھر کی زینت بنے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کی ڈولی سجا کر میرے دروازے پر پہنچا دو۔"

پنڈت نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کی یہ بات سن کر میں بے اختیار رونے لگا۔ بار بار مجھے اپنے خاندان کا ناموس یاد آ رہا تھا۔ بار بار میں سوچتا تھا کہ آبرو سب سے زیادہ قیمتی چیز ہوتی ہے۔ اس کے لٹ جانے کے بعد اب میرے پاس رہ کیا جائے گا؟ روتے روتے میرا حال برا ہو گیا مگر اس ظالم کو ذرا ترس نہ آیا۔ مجھے اسی حال اضطراب میں وہ چھوڑ کر اٹھا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

"ایک ہفتے کی مہلت تمہیں دیتا ہوں۔ اگر اس مدت میں شکنتلا کی ڈولی میرے دروازے پر نہیں لگی تو یاد رکھنا میں اپنے سپاہی بھیج کر اسے اپنے یہاں اٹھا منگواؤں گا۔ کان کھول کر سن لو کہ بنارس کے سب سے بڑے حکمران کی زبان کے الفاظ ہیں۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لوٹ سکتا ہے مگر میری زبان کے الفاظ واپس نہیں لوٹ سکتے۔"

کہانی کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے پنڈت کا حال قابو سے باہر ہو گیا۔ اب اس گریہ و ماتم میں ماں بیٹی بھی پوری طرح شریک ہو گئیں۔ عورت کا دل یونہی نازک ہوتا ہے اور وہ بھی ماں کی ممتا! گنگا کی لہروں کی طرح طوفان کا ایک تلاطم برپا ہو گیا۔

ماں کا دل اس وحشت ناک صدمے کی تاب نہ لا سکا۔ وہیں فرط غم سے بے ہوش ہو گئی۔ شکنتلا اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ جلدی سے اٹھ کر منہ پر پانی کا چھینٹا دینا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد ماں کو ہوش آ گیا۔

پنڈت کی آنکھوں کا آنسو جذب نہیں ہوا تھا کہ اس نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایک دن کی مہلت باقی رہ گئی ہے۔ جتنا رونا ہے رو لو، کل اس کے سپاہی آ کر ہماری بیٹی شکنتلا کو ہمیشہ کے لیے ہم سے چھین لے جائیں گے۔ آہ! کل ہمارے گھر سے شکنتلا کی ارتھی اٹھے گی۔ ہماری آرزوؤں کا چمن تاراج ہو جائے گا۔ کیوں نہ ہم کل سورج طلوع ہونے سے پہلے گنگا کی لہروں میں ڈوب جائیں۔"

یہ کہتے ہوئے عالم وحشت میں اٹھ کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ شکنتلا اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"باپو جی! آشانہ توڑو۔ وقت سے پہلے ہمیں یتیم نہ بناؤ۔ بھگوان کی کرپا ہو گئی تو یہ گرہ کٹ جائے گی۔ اور مان لو اگر وہی وقت آ گیا تو ہم سب کے سب ایک ساتھ ہی گنگا جی کی چرنوں میں اپنا شرن بنائیں گے۔"

بیٹی نے اصرار کر کے پانے باپ کو خودکشی سے روک دیا۔ اس کے بعد بٹھا کر سمجھانے لگی ...... "باپو جی! آپ اتنا نراش نہ ہوں۔ تدبیر کے ہتھیار سے تلوار کی دھار بھی بیکار ہو جاتی ہے۔ آپ کل صبح کو کوتوال کے پاس جائیے اور اس سے کہیے کہ شکنتلا کی ڈولی سجانے کے لیے ہمیں ایک مہینے کی مہلت دو۔ آخر بیٹی کو تن کے کپڑے پر ہم کیسے رخصت کر دیں۔ باپ ہونے کے رشتے سے آخر ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں۔ زیادہ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ تو انتظام ہی ہوگا۔"

باپ نے پوچھا.... "مان لو! اس نے مہلت دے دی تو پھر ایک مہینے کے بعد کیا ہوگا؟ جو کام اس وقت ہمیں کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کر ڈالیں۔"

بیٹی نے آنکھیں نیچی کیے ہوئے جواب دیا..... "ایک مہینے میں حالات بدل جائیں گے باپو جی! وہ شاخ ہی نہ رہے گی جس پر آشیانہ باندھنے کی نوبت آئے۔ بہتر ہے آپ ہم سے اس کی تفصیل نہ پوچھیے۔"

دوسرے دن کوتوالی میں سپاہیوں کا دستہ تیار ہی کھڑا تھا کہ ہانپتے کانپتے پنڈت جی پہنچ گئے۔ کوتوال نے دیکھتے ہی دریافت کیا۔

"شکنتلا کی ڈولی کہاں ہے؟"

پنڈت نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

"حضور! تو آپ کے چرنوں میں آنے کے لئے بالکل تیار ہے۔ مگر ماں باپ اس کو تن کے کپڑوں پر کیسے رخصت کردیں۔ کچھ تو اس کی ڈولی سجانے کے لیے ہمیں کرنا ہی چاہیے۔ اس لیے سرکار ایک مہینے کی مہلت ہمیں پردان کریں تا کہ ہمیں بھی اپنے دل کے ارمان نکالنے کا کچھ موقع مل سکے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر بڈھے کوتوال کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے خوشی کے ترنگ میں جواب دیا۔

"ضرور تمھیں ایک مہینے کی مہلت ملے گی۔ لیکن اس کے بعد اب مدت میں کوئی توسیع نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے تیاری جو کرنی ہے اس مدت میں کرلو۔ اور دیکھو! اس سلسلے میں میری مدد کی بھی کوئی ضرورت ہو تو میں ہر طرح تیار ہوں۔"

پنڈت یہ جواب لیکر خوشی خوشی گھر واپس لوٹا اور اپنی بیٹی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ مہلت کی خبر سن کر شکنتلا کے دل میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ اسے اپنے تئیں اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے کافی موقع مل گیا تھا۔ ویسے باپ کے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا تھا کہ وقتی طور پر ایک بلا ٹل گئی۔

دوسرے دن شکنتلا نے اپنے باپ سے کہا۔

"پتا جی! شہزادے جس طرح کا لباس پہنتے ہیں بالکل ہو بہو اسی طرح میرے لیے بھی دو جوڑے تیار کرا دیجیے۔ چوڑی دار پانجامہ، انگرکھا نما قبا۔ کمر میں زریں پٹکا اور کمخواب کا سفید عمامہ۔"" باپ نے ایک دو روز میں شکنتلا کی یہ فرمائش پوری کردی۔ لیکن باپ سخت حیران تھا کہ آخر مردوں کا پیراہن لیکر وہ کیا کرے گی۔ بیٹی نے تفصیل پوچھنے سے چونکہ منع کر دیا تھا اس لیے اس کی زبان کچھ دریافت کرنے کے لیے نہیں کھل رہی تھی۔

سارا سامان مکمل ہو چکنے کے بعد اس نے تیسرے دن رات کے وقت اپنے ماں باپ کو فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اب میں آج رات کے کسی حصے میں اپنی مہم پر روانہ ہو رہی ہوں۔ ٹھیک ایک مہینے سے دو دن پہلے واپس آجاؤں گی۔ اس کے درمیان میں آپ لوگ کسی قسم کی چنتا نہ کریں گے۔ میں جہاں بھی رہوں گی محفوظ رہوں گی۔ میری گمشدگی کا یہ راز بھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ میرا یہ سفر ضائع نہیں ہوگا۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے ماں باپ کے پاؤں چھوئے اور پانی خواب گاہ میں چلی گئی۔ رات کے پچھلے پہر اس نے چوپال سے اپنا سدھایا ہوا تیز رفتار گھوڑا کھولا۔ سفر کے لوازمات سے اسے آراستہ کیا اور اس پر بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہوگئی۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ بھارت کی راجدھانی دہلی میں عید کی طرح سے چہل پہل مچی ہوئی تھی۔ گلی گلی سے علماء و مشائخ کی پالکیوں کے جلوس جامع مسجد کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ علم و تقدس اور طہارت و عرفان کے نورانی چہرے ستاروں کی طرح جامع مسجد کے فرش پر بکھر گئے تھے۔

لال قلعہ کے کنگور سے پہلی توپ سر ہوتے ہی زریں پوشاک میں نقیبوں کی دستے باہر نکل آئے اور شاہی گیٹ سے جامع مسجد کے زینے تک دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

شاہانہ کروفر کے ساتھ صاحبقراں شہنشاہ ہندوستان سلطان اورنگ زیب کی سواری محل سرائے خاص سے نکل چکی تھی۔ آگے آگے کلغیاں لگائے، ننگی تلواریں لیے ہوئے مصاحبین کا دستہ چل رہا تھا۔ شاہی سواری جدھر سے گذری مبارک، سلامت کی دعاؤں سے فضاء گونج اٹھی۔ جامع مسجد کے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہی سلطان ارنگ زیب کی پیشانی خم ہوگئی۔ یہ بندگی کا پہلا خراج تھا جو دربار خداوندی میں پیش کیا گیا۔

اب خطبے کی اذان ہوئی اور خطیب نے ممبر پر کھڑے ہو کر خطبہ شروع کیا۔

عرفاء عشاق کے ہجوم میں جمعہ کی نماز دوگانہ ختم ہوئی۔ سنتیں ادا کرنے کے بعد لوگ مسجد سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد شور بلند ہوا کہ سلطان اورنگ زیب سنتوں سے فارغ ہو کر باہر تشریف لا رہے ہیں۔ جامع مسجد کے زینوں پر ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے فریادی اپنی اپنی عرضیاں لیے کھڑے تھے۔ سلطان جونی دروازے سے باہر نکلے مملکت کے عرائض نویس قلم دان لیے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔

ایک فریادی نے آگے بڑھ کر سلطان کی خدمت میں اپنی عرضی پیش کی۔ اس پر حکم صادر ہوا۔ عرضی نویس نے قلم بند کرلیا۔ پھر آگے بڑھے پھر عرضی پیش ہوئی، حکم صادر ہوا اور قلم بند کرلیا گیا۔ یہ سلسلہ مسجد کے آخری زینے تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سب کے آخر میں ایک نہایت خوبصورت شہزادہ سر پہ کمخواب کی دستار لپیٹے ہوئے کھڑا تھا۔ جیسے ہی سلطان اس کے قریب پہنچے وہ اپنی عرضی لیے آگے بڑھا۔ سلطان نے جونہی اس کی طرف نگاہ اٹھائی بار حیا سے اس کی پلکیں جھک گئیں۔ ایک روشن ضمیر بادشاہ کو حقیقت تک پہنچنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہوئی۔ نقیب کو حکم دیا۔

"اس نوجوان کو دیوان خاص میں میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

شہنشاہ کی سواری آگے بڑھی اور نقیبوں کے ہمراہ نوجوان قلعہ معلےٰ کی طرف چل پڑا۔ غازی محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسے ہی اپنے دیوان خاص میں تخت شاہی پر فروکش ہوئے نقیب نے اس نوجوان کو فوراً پیش کیا۔ سلطان نے اپنی نظر نیچی کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا "دربار فوراً خالی کردیا

جائے۔" جب سارا دربار خالی ہوگیا تو سلطان نے اپنا شاہی دوشالہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! لو دستار اتار کر یہ چادر اوڑھ لو۔ ایک عورت کو اجنبی مردوں کے سامنے بے نقاب نہیں رہنا چاہیے۔"

یہ الفاظ سن کر نوجوان پر سکتے کی حالت طاری ہوگئی۔

پھر سلطان نے کہا "اپنی نسوانیت کا راز مت چھپاؤ۔ میں تمہاری فریاد سننے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں۔"

بات اب ضبط سے باہر ہوگئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سر اور چہرے کو چادر سے چھپاتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل سکے۔

"دیالو مہاراج! میں اس وقت خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہوں کہ اس وقت جہاں پناہ نے مجھے "بیٹی" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں ایک برہمن ذات کی لڑکی ہوں۔"

سلطان نے جواب دیا..... "جب تو اور بھی تمہاری دلجوئی میرے لیے ضرورہ ہوگی تاکہ یہ بھید تم پر کھل جائے کہ اسلام اپنے فرمانرواؤں کو کتنا فراخ دل بنا دیتا ہے۔ اور جن قوموں کا وہ ذمہ لے لیتے ہیں ان کے ساتھ ان کا سلوک کتنا حیرت انگیز اور روح پرور ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جاننے کے بعد بھی تم ایک برہمن زادی ہو میرا جذبہ شفقت پھر تمہیں "بیٹی" کے ساتھ مخاطب کرتا ہے۔

شکنتلا یہ جواب سن کر حیرت و مسرت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔

سلطان کا اشارہ پاکر اب اس نے اپنی دردناک سرگزشت کو سنانا شروع کیا۔ سماعت کے دوران سلطان کا حال قابل دید تھا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ کبھی پلکیں بھیگ جاتیں کبھی فرط غم سے چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اسی عالم اضطراب میں کہانی تمام ہوئی۔

جب وہ اپنا بیان ختم کر چکی تو سلطان نے اپنا حکم سنایا۔ ایک مہینے کی مہلت میں اب چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ تم فوراً اپنے مستقر پر واپس لوٹ جاؤ اور اپنے والدین سے کہہ دو کہ وہ فوراً تمہارے ڈولے کا انتظام کریں۔"

یہ حکم سن کر شکنتلا کے ارمانوں کا خون ہوگیا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ چادر کے ایک کونے میں اپنی آنکھوں کا آنسو جذب کرتے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہوگئی۔ نقیبوں کا ہجوم دیوان خاص کے باہر کھڑا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ اسے قلعہ معلٰے تک پہنچا دیا۔ سیدے وہ سرائے پہنچی، اپنا گھوڑا لیا اور بنارس کی طرف روانہ ہوگئی۔

راستے بھر ناکامی کی چوٹ اسے ستاتی رہی۔ بار بار وہ یہی سوچتی رہی کہ بادشاہ نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ پھر کبھی خیال آتا کہ بادشاہ کے منہ سے بیٹی کا خطاب معمولی چیز نہیں ہے وہ ضرور اس کا حق ادا کریگا۔

ماں باپ نہایت بیتابی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی اس کے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آئی ماں خوشی سے چیخ اٹھی "شکنتلا آگئی۔"

بیٹی کو بخیر و عافیت دیکھ کر ماں باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہیں یقین تھا کہ شکنتلا کا یہ گمنام کچھ نا کچھ ضرور رنگ لائے گا۔ رات کے وقت ماں نے شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"بیٹی تو اتنے دن کہاں تھی؟ اب تو بتادے کہ مہم سرانجام دے کر لوٹی ہے۔ مدت مقررہ میں اب دو ہی روز کا وقفہ رہ گیا ہے۔ معلوم نہیں ہو لوگوں کا کیا انجام ہوگا۔"

ماں کی آواز میں اتنی دردناک مایوسی تھی کہ شکنتلا کا دل بھر آیا۔ ناکامی کی چوٹ ابھر آئی۔ بے اختیار رونے لگی۔ ماں نے فرط محبت میں بیٹی کو سینے سے لگایا۔ تھوڑی دیر بعد شکنتلا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں دہلی گئی تھی۔ شہنشاہ کے حضور میں اپنی فریاد پیش کی لیکن افسوس کہ وہاں بھی میری فریاد رائیگاں گئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ڈولا سجا کر کوتوال کے دروازے تک پہنچا دیا جائے۔ میں اس حکم کی تعمیل ضرور کروں گی چاہے میری جان چلی جائے۔ کیونکہ شہنشاہ نے مجھے اپنی "بیٹی" کہا ہے۔ ایک برہمن زادی اپنے باپو کا حکم نہیں ٹال سکتی۔

شکنتلا کی یہ بات ابھی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں باپ نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

تیسرے دن سپاہیوں کی حفاظت میں شکنتلا کا ڈولا تیار ہوگیا۔ دن دہاڑے غشی پر غشی آنے لگی۔ سارے محلے پر کوتوال کے مظالم کی ایک بھیانک دہشت طاری ہوگئی۔

بوڑھا کوتوال آج خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ ایک ملکہ حسن آج اس کے گھر دلہن بن کر آرہی تھی۔ بالوں میں خضاب آنکھوں میں سرمہ لگائے سر سے پاتک چھبیلا بنا ہوا تھا۔ جیسے بڑھاپا میں عہد شباب پلٹ کر آگیا ہو۔ شکنتلا کے ڈولے کے ارد گرد شہر کے بھکاریوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا اور انہیں پیسے لٹائے جا رہے تھے۔ ساری راہ گزر پر تماشائیوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے لیکن کوتوال کے قہر کے آگے کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا۔

اب شکنتلا کا ڈولا کوتوالی کے قریب ہی پہنچ رہا تھا۔ ایک سپاہی نے دوڑ کر کوتوال کو اطلاع دی۔

"سرکار! ڈولا بہت قریب آ گیا ہے۔ بس چند قدم کے فاصلے پر ہے۔"

کوتوال نے اپنی کھڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ڈولا اس وقت تک دروازے پر نا لگایا جائے جب تک کہ میں اپنے ہاتھوں سے خیرات نا تقسیم کر لوں۔"

اب ڈولا دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کوتوال شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ باہر نکلا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے بے دریغ پیسے لٹانے لگا۔ بنارس کے بھکاریوں میں ایک لوٹ مچ گئی۔ مبارک سلامت کے شور میں کوتوال کا حاکمانہ غرور وانگڑائے لے کر جاگ اٹھا۔ جیسے ہی وہ پیسے لٹا کر ڈولے کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک بڈھے فقیر نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "سرکار" کا اقبال سلامت مجھے بھی کچھ بخشش ملے۔

کوتوال نے تیور بدل کر جواب دیا .... "زمین پر یہ گرے ہوئے پیسے تجھے نظر نہیں آتے۔ اٹھالے انہیں تیرا دامن بھر جائے گا۔"

بوڑھے نے پھر خوشامد کرتے ہوئے اصرار کیا..... "نہیں سرکار" زمین کے گرے ہوئے پیسے میں نہیں لوں گا۔ میں تو یہ ارمان لیکر آیا ہوں کہ سرکار ہی کے مبارک ہاتھوں سے کچھ خیرات لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر کوتوال نے جھنجھلاتے ہوئے کہا...... "اچھا بے! نہیں مانتا ہے تو لے۔"

یہ کہتے ہوئے جوں ہی اس نے پیسے دینے کے لیے ہاتھ بڑھائے بڈھے فقیر نے اپنا میلا کچیلا لباس اتار کر پھینک دیا۔

اب جو نظر اٹھی تو سامنے شہنشاہ اورنگ زیب کھڑے تھے۔ کوتوال خوف سے کانپنے لگا۔ دہشت کے مارے سارے جسم کا خون سوکھ گیا۔ چہرے پر سیاہی چھا گئی۔ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا کہ غصے سے کانپتے ہوئے شہنشاہ نے کہا۔

کیوں بے ننگ اسلام؟ اسی کرتوت کے لیے تجھے یہاں بنارس بھیجا تھا۔ دن دیہاڑے میری رعایا خون کرتے ہوئے تجھے ذرا شرم نہیں آئی۔ ایک ہولناک قہر و ظلم کا یہ تماشہ رچاتے ہوئے تجھے اس بات کا خیال نہیں آیا کہ حق کے مقابلے میں اورنگ زیب کی تلوار اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ کیا تجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ سارا ہندوستان اسلام کی پناہ میں ہے۔ یہاں کے اقوام کی عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ ایک مسلمان کا سب سے مقدس فریضہ ہے۔

فرط غضب سے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاری پھوٹ رہی تھی اور کوتوال کا خون سوکھا جا رہا تھا۔

اسی درمیان میں دہلی سے چلا ہوا فوجی دستہ بھی آ موجود ہوا۔ کوتوال کی طرف اشارہ کر کے شہنشاہ نے سپہ سالار کو حکم دیا۔

اس سیہ کار کو فوراً کیفر کردار تک پہنچاؤ تا کہ دوسروں کے لیے اس کا انجام تماشائے عبرت ہو۔ اس کے دونوں پاؤں الگ الگ دو خونخوار ہاتھیوں کی ٹانگوں سے باندھ دیے جائیں اور پوری قوت کے ساتھ ہاتھیوں کو مختلف سمت دوڑایا جائے۔ یہاں تک کہ زمین پر اک بدبخت کے ریزے ریزے بکھر جائیں۔

شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے فوجی دستہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ سارا بنارس شہنشاہ اورنگ زیب کے آوازۂ رحم و انصاف سے گونج رہا تھا۔ شہنشاہ کی دانش وری، رعانوازی اور بے لاگ قوت فیصلہ پر ہر شخص مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔

شکنتلا کا ڈولا فتح کی مسرتوں میں ڈولتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ بجلی کی طرح شہنشاہ اورنگ زیب کے فیصلے کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ واقعہ کی اطلاع پاتے ہی شکنتلا کے ماں باپ خوشی سے پاگل ہو گئے۔ شکنتلا اپنے گھر جیسے ہی پہنچی شہنشاہ اپنی "بیٹی" کے گھر تشریف لائے اور فرمایا۔

"پیاس کی شدت سے بے تاب ہوں سب سے پہلے مجھے پانی پلایا جائے۔ میں اس دن سے پیاسا ہوں جس دن شکنتلا نے میرے حضور میں اپنی فریاد پیش کی۔ اسی دن میں نے اپنے خدا سے عہد کر لیا تھا کہ جب تک میں ایک مظلوم برہمن کو اس کا انصاف نہیں دے لوں گا اپنے حلق کے نیچے پانی کا ایک قطرہ نہیں اتاروں گا۔"

شکنتلا نے دوشالے سے اپنا منہ چھپاتے ہوئے کہا.... "بھارت کے سوامی! مجھے پورا وشواس تھا کہ جسے آپ نے بیٹی کہا ہے اس کی لاج بچانے ضرور آویں گے۔ اپنی محبوب رعایا کے ساتھ یہ انیائے تم سے ہرگز دیکھا نہ جائیگا۔ اسی لیے میں نے اپنی زمین میں ایک چبوترا پہلے ہی بنا دیا تھا تا کہ ہمارے شہنشاہ کو نماز پڑھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش نہ کرنی پڑے۔ اسی چبوترے پر پانی اور بھوجن کا بھی انتظام ہے۔"

حضرت اورنگ زیب نے پہلے وضو کر کے شکرانے کی دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد کچھ تناول فرمایا اور پانی کے کچھ گھونٹ پی کر جونہی واپس ہونا چاہتے تھے کہ پنڈت لالہ رام ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"جہاں پناہ! جس بھومی کو آپ نے اپنے سجدوں سے پوتر بنا دیا ہے اب ہم اسے کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم اپنے دل کی اتھاہ گہرائی سے اس زمین کو مسجد کے لیے وقف کرتے ہیں۔"

شہنشاہ نے اس کے اس اعلان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک تانبے کے پتر پر یہ تحریر لکھ کر دے دی کہ "اس مسجد کے متولی ہمیشہ اسی خاندان کے لوگ

رہیں گے۔"

چنانچہ وہ مسجد آج بھی گنگا کے کنارے کھڑی ہے اور اس کا نام "دھریا کی مسجد" ہے۔

سید العلماء حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفےٰ صاحب قادری دامت برکاتہم نے تانبے کے پتر پر حضرت اورنگ زیب کا وہ تاریخی دستاویز بچشم خود ملاحظہ فرمایا ہے۔ آج بھی اسی خاندان کا شخص اس مسجد کا متولی ہے۔

سوداگر کی بیٹی

کہتے ہیں کہ سمرقند میں ایک بڑا ہی ظالم اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ساری رعایا اس کی ہولناک جسارتوں سے تنگ آ گئی تھی۔اس کے جاسوسوں کے خوف سے لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو تہہ خانوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ بھیس بدل کر شہر کے گلی کوچوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک مہ جبیں دوشیزہ پر پڑی جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر رہی تھی۔لڑکی کیا تھی حسن و جمال کا ایک مرقع تھی، چہرہ ایسا تابناک تھا جیسے اس پر کسی نے چاندنی کا غازہ مل دیا ہو۔شباب کی رعنائیوں میں وہ کھلتے ہوئے گلاب کی طرح چمن کی رانی معلوم ہوتی تھی۔نظر پڑتے ہی بادشاہ کے دل پر بجلی گر پڑی۔ایک نشتر تھا جو جگر کے آ پار ہو گیا۔ایک مرتبہ پھر غور سے اس نے اس گھر کو دیکھا اور سلگتی ہوئی آرزوؤں کے ساتھ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کا وزیر اس کی زندگی کے اسرار کا سب سے قریبی محرم تھا۔محل میں قدم رکھتے ہی اس نے وزیر کو خلوت میں بلایا اور اسے اپنے دل کی کیفیت سے باخبر کرتے ہوئے کہا۔

"وزیر! آج پہلی بار میں نے انسانی پیکر میں ایک مہ کامل کو دیکھا ہے۔اس کے رخ کی چاندنی سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔اس کے تصور میں ایک لمحہ دل کو قرار نہیں۔اس کے حسن قیامت خیز نے میری ہستی کا سارا ضبط و شکیب چھین لیا۔زندگی میں ایسا غارت گر ہوش میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔جیسے بھی ممکن ہو میرے سلگتے ہوئے دل کی آگ بجھاؤ۔"

وزیر نے گھر کا پتہ نشان دریافت کرنے کے بعد بادشاہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "جہاں پناہ صبر سے کام لیجیے۔شاہی اقتدار کے لیے یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔غلامان دولت اقبال جہاں پناہ کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے آسمان کی کہکشاں توڑ کر لا سکتے ہیں۔یہ مہ کامل تو زمین ہی کی مخلوق ہے۔"

شام تک وزیر نے اپنے ذہین و شاطر مخبروں کے ذریعے سارا حال دریافت کر لیا۔معلوم ہوا کہ وہ ایک سوداگر کی بیٹی ہے۔باپ کو انتقال کیے ہوئے کچھ عرصہ ہو گیا۔اس وقت وہ اپنے بوڑھے اور غریب چچا کی کفالت میں ہے۔وزیر نے جیسے ہی بادشاہ کو یہ اطلاع دی خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔اس نے فوراً ہی وزیر کو حکم دیا کہ ابھی اس کے چچا کو دربار میں طلب کیا جائے اور جس قیمت پر بھی ہو اسے عقد نکاح کے لیے راضی کر لیا جائے۔آن کی آن میں شاہی کارندوں کا ایک دستہ بوڑھے شخص کے مکان پر پہنچا اور اسے بادشاہ کی طلبی کا فرمان پہنچایا۔

بادشاہ کا حکم سنتے ہی دہشت سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔بھتیجی نے چچا کی پریشانی دیکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔دروازے پر بلا کس نے آپ سے کیا کہہ دیا کہ آپ اس قدر پریشان نظر آتے ہیں۔چچا نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔ شاہی کارندے آئے ہیں۔بادشاہ نے ابھی مجھے دربار میں طلب کیا ہے۔دل دھڑک رہا ہے کہ کوئی بلا تو نہیں نازل ہونے والی ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟بھتیجی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔خدا اپنے حبیب کا صدقہ عطا فرمائے۔بادشاہوں کی طلبی خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔قرین مصلحت یہی ہے کہ آپ خدا کا نام لیکر تشریف لے جایئے ورنہ اس کے بعد حکومت کا قہر و جبر حرکت میں آ جائے گا اور وہ صورت حال افسوس ناک اور ہتک آمیز ہو گی۔

کارندے دروازے پر کھڑے تھے۔دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بوڑھا چچا ان کے ہمراہ ہو گیا۔بھتیجی دروازے تک رخصت کرنے آئی اور خیر و عافیت کی دعا کرتے ہوئے واپس چلی گئی۔

انتہائی اعزاز و اکرام کے ساتھ بادشاہ اور وزیر نے بوڑھے شخص کا خیر مقدم کیا۔شاہی نشست گاہ کے قریب ایک مکلف اور زرنگار تخت پر اسے جگہ دی گئی۔بغیر کسی وجہ ظاہر کے یہ اکرام خسروانہ دیکھ کر وہ دریائے حیرت میں ڈوبتا جا رہا تھا۔جب اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی تو وزیر نے اسے مخاطب کیا۔

"اس وقت آپ کی قسمت کا ستارہ اوج پر ہے کہ بادشاہ معظم نے ملکہ سلطنت بنانے کے لیے آپ کی بھتیجی کو منتخب فرمایا ہے۔آپ بطیب خاطر اس پیغام کو قبول کر کے تاج شاہی کا احترام بجا لایئے۔"

یہ پیغام سن کر فرط حیرت سے بوڑھے کی آواز حلق میں پھنس گئی۔اپنے شعور کی بکھری ہوئی توانائیوں کو سمیٹ کر بڑی مشکل سے یہ جواب دیا۔"جہاں پناہ کے احسان سے ہماری گردن ہمیشہ خم رہے گی کہ ان کی چشم، التفات نے ہمیں فخر و اعزاز کا ایک زریں موقعہ مرحمت فرمایا۔لیکن ایک زیردست کی طرف سے یہ معذرت قبول کی جائے کہ ہم اپنے آپ کو اس شاہی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتے۔"

یہ جواب سن کر شدت غیظ میں وزیر کی آنکھوں سے چنگاری پھوٹنے لگی۔گرجتی ہوئی آواز میں اس نے کہا...... "عزت و وقار کے ساتھ اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے تم تیار نہیں ہو تو یاد رکھو کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے تمہاری بھتیجی حرم سرائے شاہی کی زینت بنا لی جائے گی۔" وزیر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بوڑھا شخص کانپ اٹھا۔لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا...... وہ میرے ضمیر کی آواز تھی جس کا میں نے اظہار کیا ہے۔شاہی قہر و جبر کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اغوا کا حکم نہ دیا جائے میں اپنی بھتیجی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے کو تیار ہوں۔وزیر کا غصہ اتر گیا۔بادشاہ کے چہرے کی

شکن بھی مٹ گئی۔
رات گئے تک بوڑھے چچا کے انتظار میں بھتیجی بیٹھی ہوئی تھی۔ قدموں کی آہٹ پاتے ہی دروازہ کھول دیا۔ بے تابی کے ساتھ خیریت دریافت کی۔ چچا نے بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ سارا ماجرا کہہ سنایا۔ صورت حال معلوم کرنے کے بعد لڑکی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا آپ ندامت و پشیمانی محسوس نہ کیجیے۔ آپ کی زبان پر میں زندہ گور ہونے کے لیے تیار ہوں۔
بالآخر چند دنوں کے بعد شاہانہ کروفر کے ساتھ شادی کی تقریب انجام پذیر ہوئی۔ سارا شہر جشن مسرت میں ڈوب گیا۔ دم رخصت محافے میں بیٹھے ہوئے چچا سے کہا دروازے پر بیٹھ کر میرا انتظار کیجیے گا۔ میرا مقدر مجھے جلدی واپس لائے گا۔
دلہن کی پالکی جیسے ہی شاہی محل کے دروازے پر پہنچی، کنیزوں اور خواصوں کے ہجوم نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور پھولوں کی بارش میں اسے حرم سرائے خاص تک لے گئیں۔ شب زفاف سے پہلے دلہن کو ملکہ بنانے کی رسم ادا کی گئی۔ بادشاہ نے اس تقریب میں اپنا وہ تاج شاہی اتار کر دلہن کے سر پر رکھ دیا جس میں کروڑوں روپے کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اب وہ سوداگر کی بیٹی نہیں تھی ایک بہت بڑی سلطنت کی ملکہ تھی۔ سارا محل اس کے رخ کی چاندنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ پروانے کی طرح بادشاہ کی شیفتگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے ملکہ کی جدائی گوارا نہ تھی، نسیم عیش کی موجوں سے کھیلتی رہی۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ شاہی محل کی دیواروں پر چاندنی ڈھلنے لگی۔ بہار کا موسم صحن چمن سے رخصت ہونے لگا۔ لالہ کی طرح عشق و وارفتگی کی دہکتی ہوئی آگ اب آہستہ آہستہ اڑتی ہوئی خاکستر میں تبدیل ہونے لگی۔ بادشاہ کے اضطراب شوق کا چڑھا ہوا دریا اترنے لگا۔ ملکہ بھی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اہی ملکہ جس کے بغیر ایک لمحہ بھی دل کا شاق گزرتا تھا اب کئی کئی دن تک بادشاہ کو اس سے ملاقات کی فرصت نہیں ملتی تھی۔
ایک دن منہ لگی ہوئی کنیز کی زبانی ملکہ کو شاہی محل کے تمام رازہائے سربستہ کی اطلاع مل گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ درجنوں رانیاں محل کے کسی خفیہ مقام پر گمنامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ بادشاہ ہر سال چھ مہینے کے بعد ایک نئی دوشیزہ کو اپنے حرم سرا میں داخل کرتا ہے اور جب ہوس کی پیاس بجھ جاتی ہے تو محل کے کسی تہہ خانے میں اسے قید کر دیتا ہے۔ ملکہ ایک دین دار و پارسا عورت تھی۔ عشق رسول کا سوز و گداز اسے اپنی ماں کے ورثے میں ملا تھا۔ خدا کی غیبی کارسازی پر اسے بھرپور اعتماد تھا۔ نامعلوم طور پر اسے یقین رہنے لگا کہ کسی دن خونخوار عفریتوں کا یہ طلسم ٹوٹ کر رہے گا۔
محل کے خوفناک حالات معلوم کر کے کبھی کبھی اس کا خون جوش انتقام سے ابلنے لگتا۔
ایک دن بادشاہ سیر و شکار کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ سارا محل خالی تھا۔ ایک کنیز جو اس خفیہ مقام سے واقف تھی جہاں رانیوں کو قید رکھا جاتا تھا۔ رات کی تنہائی میں ملکہ کے پاس آئی اور رازدارانہ لہجے میں کہا .... آپ کی عبادت و ریاضت اور خدا پرستی کے تقدس نے ہمیں آپ کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ "آپ کی ذات سارے محل کی مرجع عقیدت بنتی جا رہی ہے۔ آج پہلی بار یہ راز آپ پر منکشف کر رہی ہوں کہ بادشاہ کے اعتماد کے نتیجے میں صرف تنہا مجھ کو یہ منصب عطا کیا گیا ہے کہ میں اس زنداں سے رابطہ رکھتی ہوں جہاں آپ کی طرح رانیاں قید ہیں وہاں ایک لڑکی آپ سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے۔ آپ کا نام و نشاں معلوم کر کے وہ چونک گئی اور بے تحاشہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آپ کی ملاقات کے لیے وہ انتہائی بے چین ہے۔ اگر آپ تیار ہوں تو نصف رات ڈھل جانے کے بعد خفیہ راستے سے آپ کو زنداں کی سیر کرا دوں۔" ملکہ یہ سنسنی خیز خبریں سن کر حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ نامعلوم طور پر اس کے دل میں ان مظلوم عورتوں سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔ دل کی ایک خاموش تحریک پر اس نے کنیز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
مظلوموں سے ہمدردی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ ضرور مجھے اس تہہ خانے میں لے چلو۔ شاید میرا خدا مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے کہ میں انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکوں۔ ملکہ کے اس جواب پر کنیز کی مسرتوں کی انتہا نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بڑی مہم سر کر لی۔ دوسرے دن علی الصبح نماز فجر سے فراغت کے بعد کنیز کی راہنمائی میں اس خوفناک تہہ خانے کی طرف ملکہ روانہ ہوئی۔
کنیز بہت سارے پرپیچ راستوں اور زینوں سے گزارتے ہوئے ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے مؤدب ہو کر ملکہ سے کہا۔
"تہہ خانے کے دروازے پر مسلح سپاہیوں کا ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ملکہ کے چہرے پر کسی اجنبی مرد کی نظر پڑے۔ اس لیے آپ نقاب ڈال لیجیے اور میرے بازو کے سہارے آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھائیے۔"
کنیز کی درخواست پر ملکہ نے اپنا منہ چھپا لیا۔ اب راستے کا نشیب و فراز نگاہوں سے یک لخت اوجھل ہو گیا۔ کنیز کے سہارے اب ملکہ آہستہ آہستہ طے کر رہی تھی۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک زینہ ملا۔ جیسے ہی زینے کی آخری سیڑھی پر ملکہ نے قدم رکھا اچانک اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کچھ دور چل کر کنیز نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی کنیز نے ملکہ سے کہا اب اپنا نقاب الٹ دیجیے۔ ہم لوگ تہہ خانے میں پہنچ گئے ہیں۔
ملکہ نے نقاب الٹ دیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کوٹھریوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کچھ عورتیں مغموم و اداس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ملکہ کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ملکہ کے پاس پہنچ کے اظہار کرتے ہوئے کہا .... "محل میں آئے ہوئے شاید آپ کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔" ملکہ نے حیرت سے دریافت کیا ...... "آپ کے اس سوال کا مطلب میں نہیں سمجھ سکی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چھ مہینے کے بعد یہاں کے دستور کے مطابق نئی ملکہ کو اس قید خانے میں پہنچایا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد تا عمر یہاں سے کوئی نہیں نکل سکتا۔"

ملکہ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا .... "لیکن مجھے تو محل کی ایک کنیز یہاں سیر کرانے کے لیے لائی ہے۔ اور میں خود اس جذبے میں آئی ہوں کہ آپ لوگوں سے مل کر خلاصی کی کوئی راہ نکال سکوں۔"

ادھیڑ عمر کی عورت نے اظہار ہمدردی کے انداز میں کہا .... "وہ حرافہ یہی کہہ کر سب کو یہاں لے آتی ہے اور دروازے تک پہنچا کر غائب ہو جاتی ہے۔ اب آپ اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ کر یہاں رہیے۔ آپ کی واپسی ناممکن ہے۔"

یہ سنتے ہی ملکہ نے پیچھے پلٹ کر کنیز کو آواز دی۔ لیکن کنیز جا چکی تھی۔ دروازہ مقفل ہو گیا تھا۔

اب اپنی زندگی کا انجام سوچ کر ملکہ کا خون سوکھتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک بہت بڑے صدمے کی چوٹ وہ اپنے تئیں سنبھال نہ سکی اور غش کھا کر گر پڑی۔

تہہ خانے کی عورتوں نے منہ پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملکہ کو ہوش آ گیا۔ ایک دو روز تک ملکہ کی بے چینی انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ کسی پہلو اسے قرار نہیں مل رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے دوسرے دن ملکہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا بہن بلاوجہ اپنے آپ کو ہلاکت مت کرو۔ شروع شروع ہر عورت کے دل کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ پھر بعد میں اس تہہ خانے میں طبیعت مانوس ہو جاتی ہے۔ اس تہہ خانے کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ عورتیں مقید ہیں۔ اگر طبیعت قابو میں ہو تو چلو تمہیں سیر کرائیں اس طرح تمہارا جی بہل جائے گا۔

ملکہ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور اس عورت کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ تہہ خانے کی مختلف حصوں کی عورتوں سے اس نے ملکہ کا تعارف کرایا۔ سب نے ایک نیا قیدی سمجھ کر ملکہ کو تسلی دی اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔

تہہ خانے کے آخری حصے سے گزرتے ہوئے ملکہ کی نظر ایک جوان عورت پر پڑی جو سجدے کی حالت میں رو رہی تھی۔ غیر محسوس طور پر ملکہ کا دل اس کی طرف کھنچ گیا۔ اس نے اپنی ساتھ والی عورت سے کہا۔

"تکلیف نہ ہو تو یہاں رک جاؤ! یہ کوئی اللہ والی معلوم ہوتی ہے۔ بیساختہ اس کی طرف دل کھنچ رہا ہے۔ ملکہ کی درخواست پر ساتھ والی عورت رک گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ جیسے ہی دعا مانگ کر فارغ ہوئی ملکہ نے کمرے میں داخل ہو کر اسے سلام کیا۔ نظر کا چار ہونا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے دونوں پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ وقفے کے سکوت میں حیرت زدہ آنکھیں دیر تک ایک دوسرے کا منہ تکتی رہیں۔ اسی عالم میں ملکہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔"

غزالہ! ادھر سے آواز آئی .... "بڑی آپا" اور دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئیں۔ دیر تک دلوں کا طوفان اور اشکوں کا سمندر نہیں تھمتا۔

ادھیڑ عمر عورت کے لیے یہ واقعی ایک معمے سے کم نہیں تھا۔ اس نے اچنبھے کے ساتھ دریافت کیا۔

"ملکہ! اس مظلوم لڑکی سے تمہاری کب سے جان پہچان ہے۔" فرط تاثر سے ملکہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی دردانگیز کہانی سنانا شروع کی۔

"یہ میری حقیقی چھوٹی بہن ہے۔ ہم لوگوں کا آبائی وطن خراسان کے ایک دیہات میں تھا۔ ہمارے والدین کے بہت بڑے فاضل اور نہایت عابد و زاہد شخص تھے۔ عشق رسول ﷺ تو ان کے رگ و پے میں اس درجہ سرایت کر گیا تھا کہ ہر وقت تصور جاناں میں ان کی پلکیں بھیگی رہتی تھیں۔ رات کا پچھلا پہر ان کے گریہ شوق کے لیے تلاطم کا وقت ہوتا تھا۔ ان کے بال بال سے سوز و گداز عشق کی چنگاری پھوٹی پڑتی تھی۔ جہاں ہم دونوں بہنوں نے قصیدہ بردہ شریف کا پہلا مطلع شروع کیا اور ان کے دل کے سمندر میں طوفان اٹھنے لگتا تھا۔ فیضان عشق کی تجلی جب اترنی شروع ہوتی تھی تو خود ہماری آواز رقت انگیز کیفیت میں ڈوب جاتی تھی۔ قصیدہ بردہ شریف تمام ہو جانے کے بعد وہ بارگاہ رسالت کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاتے تھے اور نہایت درد و کرب کے ساتھ صلوٰۃ و سلام کی نذر پیش کرتے تھے۔

بسا اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بحر و بر اور دشت و جبل کے سارے فاصلے مٹ گئے اور حضور جان نور سنہری جالی کے بالکل قریب کھڑے ہو کر ہم عرض مدعا کر رہے ہیں۔ والد بزرگوار چھوٹی بہن سے زیادہ مانوس تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس کی پیشانی میں ابدی سعادتمندوں کا نور دیکھتا ہوں۔ وہ فضل و شرف کے آسمان کی مشتری ہے۔"

ایک سال ایسا ہوا کہ حج کا موسم آتے ہی والد محترم کا جذبہ شوق تاب ضبط سے باہر ہو گیا۔ ذرا سی ہوا لگتے ہی دبی چنگاری دہکنے لگی۔ اچانک انہوں نے دیار حبیب کے مقدس سفر کا ارادہ کر لیا۔ سارے خراسان میں والد صاحب کے سفر کی دھوم مچ گئی۔ گاؤں گاؤں سے زائرین کا ایک تانتا بندھ گیا۔ متوسلین و معتقدین کی ایک بہت بڑی تعداد والد صاحب کے شریک سفر ہو گئی۔

انتظار کرتے کرتے بالآخر شام آ ہی گئی جس کی سحر کو تمناؤں کے ہجوم میں والد بزرگوار کا قافلہ آمادہ سفر ہونے والا تھا رات کو اچانک چھوٹی بہن بضد ہو گئی

کہ وہ بھی حجاز کے مقدس سفر میں والد صاحب کے ساتھ رہے گی۔ اس کا مچلتا ہوا ناز والد صاحب سے نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہوتے والد صاحب نے اسے بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فجر طلوع ہوتے ہی نماز سے فارغ ہو کر عازمین حج کا مقدس قافلہ حجاز کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب تک قافلے کی گرد نظر آتی رہی اشکبار آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ جب قافلہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں حسرتناک مایوسی کے ساتھ دروازے سے واپس لوٹ گئی۔

چونکہ کئی سال بیشتر ہماری والدہ محترمہ خدا کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اس میں والد بزرگوار کی واپسی تک اپنے چچا کے گھر چلی گئی۔ قافلے کی واپسی کے دن قریب آئی تو میری مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ جہاں کے تصور سے ان کی آرزوؤں کی دنیا آباد رہا کرتی تھی۔ شوق کی امنگوں میں ڈوب کر میں نے خیر مقدم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آنگن سے لے کر باہر تک سارا گھر صاف ستھرا کر کے چمن بنا دیا۔ شہ نشیں جو والد صاحب ستھرا کر کے چمن بنا دیا۔ شہ نشیں جو والد کی نشست گاہ تھی اسے دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔

ایک دن یہ خبر موصول ہوئی کہ کل صبح تک قافلہ آبادی میں داخل ہو جائے گا۔ انتظار شوق میں اس دن رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح طلوع ہوتے ہر طرف سے قافلے کی آمد کا شور برپا ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر رہ گزر کی طرف دوڑ پڑے۔ میں بھی اپنے والد بزرگوار اور اپنی بچھڑی ہوئی بہن کی رہ گزر میں اپنی نگاہوں کا فرش بچھانے کے لیے دروازے پر آ کھڑی ہو گئی۔

آہ دیدۂ شوق ادا کیے ہوئے اپنے باپ کے مقدس قدموں کے غبار کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ قافلے کا ایک شخص اپنے سر پر خاک ڈالتا ہوا آیا۔ اور اس نے مجھے یہ لرزہ خیز خبر دی۔

خدا تمہیں صبر کی توفیق کرے۔ آہ! یہ خبر دیتے ہوئے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے کہ تمہارے والد محترم اور تمہاری چھوٹی بہن کو ڈاکوؤں نے ہلاک کر دیا۔

اس کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہوئے غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا دن دھاڑے ہماری آرزوؤں کا خون ہو گیا میں اپنی ماں کی یتیم تو تھی ہی۔ اب اپنی دانست میں باپ کی بھی یتیم ہو گئی۔ اس لیے چچا نے مجھے اپنی کفالت میں لے لیا چچا بھی اس واقعہ سے اتنے شکستہ خاطر ہو گئے تھے کہ انہوں نے آبائی وطن چھوڑا اور سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی۔

ملکہ نے اپنی دردانگیز کہانی ختم کرتے ہوئے کہا کہ یہاں تک تو مجھے معلوم تھا۔ اس کے بعد کا واقعہ مجھے معلوم نہیں کہ والد صاحب کہاں ہیں؟ میری چھوٹی بہن غزالہ اس تہہ خانے میں کیسے پہنچی۔ اسے تو غزالہ ہی بتا سکتی ہے۔

اس ادھیڑ عمر کی عورت کے اصرار پر غزالہ نے بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ بھری کہانی کا یہ باقی حصہ سنایا۔

حجاز کے سفر میں والد بزرگوار کہ یہ معلوم تھا کہ جہاں کہیں بھی قافلہ رکتا تھا۔ وہ اپنے ٹھہرنے کی جگہ عام لوگوں سے ہٹ کر ایک دور گوشے میں پسند کرتے تھے کہ ان کی عبادت و ریاضت اور خیال کی یکسوئی میں کوئی خلل نہ ہو۔ ایک دن ایسا ہوا کہ قافلہ ایک گھنے جنگل کو عبور کر رہا تھا۔ شب و روز چلتے چلتے کئی دن بیت گئے۔ لیکن جنگل کی مسافت ختم ہونے کو نہ آئی پیہم تگ و دو کی وجہ سے قافلہ کافی تھک چکا تھا۔ اس لیے تیسرے دن شام کے وقت ایک پہاڑ کے دامن میں رک گیا۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ سوائے چند مہمانوں کے سارا قافلہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کنارے کے نزدیک والد بزرگوار نے اپنا خیمہ نصب کرایا تھا۔ وہ تہجد کی نماز میں مصروف تھے۔ میں ایک گوشہ میں لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز میرے کان میں آئی۔ میں فوراً جاگ گئی اور خیمہ کے باہر ایک شخص کو یہ کہتے ہوئی سنا کہ جلدی کرو یہی وہ خیمہ ہے۔

ابھی یہ جملہ ختم نہ ہو پایا تھا کہ چند بھاری بھرکم جسم والے سپاہی خیمے کے اندر گھس آئے اور انہوں نے کمند پھینک کر مجھے اور والد کو گرفتار کر لیا۔ شکنجوں کی طرح میرے ہاتھ اور پاؤں کس دیئے گئے اور بالکل بے بس سے ہو گئی۔ اس کے بعد ظالموں نے مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک تیز رفتار گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا۔ جس وقت سپاہی نے گھوڑے کو دوڑایا میں نے دیکھا کہ والد بزرگوار بھی اسی گھوڑی کی پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہیں کہاں لے جایا گیا۔ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کہ وہ آج تک بقید حیات ہیں یا وہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے ہیں۔

رات بھر پوری قوت رفتار کے ساتھ گھوڑا چلتا رہا صبح کو جب پو پھٹے تو مجھے گھنی پہاڑوں کے بیچ میں ایک چشمے کے کنارے اتارا گیا میرے ساتھ دو گھوڑ سوار اور بھی تھے جو دائیں بائیں دونوں طرف سینے تان کر چل رہے تھے۔ اب میرا کمند کھول دیا گیا تھا۔ لیکن تکلیف شدت سے سارا جسم چور چور ہو رہا تھا بڑی مشکل سے چل کر چشمے کے کنارے پہنچی وضو کر کے صبح کی نماز ادا کی۔

ہنوز میرے اوپر سکتے کی کیفیت طاری تھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آ گیا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنا منہ ڈھانپتے ہوئے ایک کنارے بیٹھ گئی۔ فرط تحیر سے مجھ سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

اداس کیوں بیٹھی ہو آج شام تم سمرقند کے بادشاہ کی ملکہ بنا دی جاؤ گی۔ شاہی محل پہنچ کر تمہارے دن پلٹ آئیں گے۔

یہ سنتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ میری ہچکیوں کے گداز سے چٹانوں کے جگر میں شگاف ہو گیا۔ ایک بھیانک انجام کے خوف سے میں لرز گئی خدائے کردگار اور رسول کونین کی جناب میں دل کی خاموش فریاد کے سوا اب میرے لیے نجات کی کوئی سبیل نہیں رہ گئی تھی۔ والد کا غم الگ سوہان روح تھا اور خود اپنا حال یہ تھا کہ مارے شرم و غیرت کے زمین میں دفن ہونے کو جی چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خادموں نے گھوڑی کی پشت پر مجھے سوار کرا دیا اور گٹھڑی کی طرح باندھ دیا۔ جسم کی اذیت کے علاوہ روح کا کرب سب سے زیادہ جاں گسل تھا۔ گھوڑے کی پشت سے بندھی ہوئی نیم بے ہوشی کی حالت میں چلی جا رہی تھی۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔ شام کو ایک وادی کے قریب پہنچی تو سامنے ایک نہایت عظیم ایوان نظر آیا۔ سپاہی نے پھر مجھے طنز کرتے ہوئے کہا۔

دیکھ لو یہی وہ شاہی محل ہے جہاں تم نے ملکہ بن کر رہنا ہے۔

پھر زخموں پر نمک کی ٹیس محسوس ہوئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کسی پہرہ دینے والے سپاہی نے آواز دی "محل کے عقبی دروازے پر یہ گھوڑا لے جا کر کھڑا کر دو۔"

باگ پکڑتے ہوئے ایک شخص گھوڑے کو آہستہ آہستہ لے کر آگے بڑھا۔ محل کے عقبی دروازے پر گھوڑا کھڑا کر دیا گیا۔

چند ہی لمحے کے بعد دروازہ کھلا اور اندر سے چند نوجوان عورتیں باہر نکلیں اور مجھے گھوڑے پر سے اتار کر اندر کی طرف لے چلیں۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور حیرت زدہ ہو کر میں اپنے مقدر کا تماشہ دیکھ رہی تھی معلوم ہوا کہ یہ شاہی محل کی کنیزیں ہیں جنہیں میرے خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ ان کنیزوں نے لے جا کر مجھے ایک آراستہ مکان میں اتارا۔ انتہائی بے چینی کی عالم میں میں نے وضو کیا اور مغرب کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔"

جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو فرط غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی والد بزرگوار کے فیضان عشق کے صدمے میں مدینہ ہماری روحوں سے بہت قریب ہو گیا تھا تصور کے سہارے میں سنہری جالی کے قریب پہنچ گئی اور ایک بے قرار فریادی کی طرف اپنے آقا کو آواز دی"۔ چوکھٹ کی کنیز اپنی آبرو کی بھیک مانگتی ہے "سرکار" میرے بوڑھے باپ کے آنسوؤں کا بھرم رکھ لیجیے۔ ظالموں کے چنگل سے میرے ناموس کو بچایئے۔"

یہ کہتے کہتے شدت کرب سے میرے اوپر غشی طاری ہو گئی۔ کافی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کنیزیں میرے سرہانے کھڑی پنکھا جھل رہی ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں کی۔ انہوں نے مجھ سے ہم کلام ہونے کی ہزار کوشش کی لیکن میں نے یک لخت خاموشی اختیار کر لی تھی۔ رات جب تھوڑی سی ڈھل گئی تو میں نے دیکھا کہ چند کنیزیں اس گھر میں داخل ہوئیں ان کے ہمراہ چند صندوق بھی تھے۔ انہوں نے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔

مبارک ہو کہ تمہاری قسمت کا ستارہ آج اوج ثریا پر چمکنے والا ہے۔ خراسان کا یہ شہرہ آفاق حسن آج اپنے صحیح قدردان کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہوش میں آؤ یہ موقع آنسو بہانے کا نہیں خوشی سے مچل جانے کا ہے۔ سامان آرائش لیے ہوئے یہ مشاطائیں کھڑی ہیں۔ تم انہیں اجازت دو کہ وہ تمہیں دلہن بنائیں بادشاہ نے جب سے تمہارے خداداد حسن کا شہرہ سنا ہے اس کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ بارے آج شاہی محل کے چند وفادار سپاہی کی بدولت بادشاہ کی زندگی کا قرار واپس لوٹ آیا"۔

یہاں پہنچ کر غزالہ آبدیدہ ہو گئی۔ بولتے بولتے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی بڑی مشکل سے اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی کہ ان کی کنیزوں کی زبانی یہ بات سن کر میرے دل پر جیسے بجلی گر پڑی۔ میں سخت حیران تھی کہ چارہ سازی کے لیے آخر دینے کے آسمان سے کوئی قافلہ کیوں نہیں اترتا۔

میں یہ وحشت ناک خبر سنتے ہی رنج و غم سے نڈھال ہو گئی۔ مشاطائیں میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور مجھے سمجھانے لگیں ہر چند انہوں نے مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن میں یک لخت خاموش رہی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو بادشاہ کی ایک منہ لگی کنیز دوڑتی ہوئی آئی اور اچانک ان پر برسنے لگی۔

جہاں پناہ حجلہ عروسی میں کب سے منتظر بیٹھے ہیں اور تم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے جھک مار رہی ہو چلو جلدی کرو ورنہ شاہی عتاب نازل ہوا تو کسی کی خیر نہیں ہے۔"

مشاطاؤں نے دبی زبان میں جواب دیا کہ ہم کیا کریں؟ جوڑے کے تھال لیے کب سے خوشامد کر رہی ہیں لیکن ان کا دماغ تو آسمان پر ہے تو یہ بات تک کرنے کی روادار نہیں ہیں۔ دلہن بنانے کا تو کیا موقع دیں گی۔ آخر ضد کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

یہ جواب سن کر کنیز نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

اچھا ٹھہرو۔ ان کا علاج بھی دریافت کر کے آتی ہوں" یہ کہہ کر وہ واپس لوٹی اور بجلی کی طرح نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ کہ نا معلوم اب کون سی قیامت توڑے گی۔ دل ڈوبنے کا یہی عالم تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کنیزوں کا ایک دستہ لیے چلی آ رہی ہے میرے قریب پہنچ کر اس نے ساتھ آنے والی کنیزوں کو للکارتے ہوئے کہا۔ اس لاڈلی کی ذرہ خبر تو لینا۔ ابھی تک یہ سمجھ رہی ہیں کہ آغوش مادر میں ہی ہیں۔ کب سے ان کا ٹسوا بہہ رہا ہے۔ ہزار سمجھانے کے بعد بھی یہاں کے ماحول میں ڈھلنے کے لیے تیار نہیں ہیں جیسے بھی ہو آج اس کی تریاہٹ توڑ دو۔ حجلہ عروسی میں پہنچ جانے کے بعد خود ہی ان کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔"

اس بدبخت کی للکار پر ساتھ آئی ہوئی کنیزیں آگے بڑھیں اور چاروں طرف سے بے تحاشہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے اپنے شکنجے میں کس لیا اور دوسری طرف مشاطاؤں سے کہا کہ جلدی کرو۔

مجھے اپنی بے بسی پر بے ساختہ رونا آگیا۔ رہ رہ کر یہی دل میں ہوک اٹھتی تھی کہ خدا کا کوئی غیبی ہاتھ کیوں نہیں نمودار ہوتا۔ مدینے سے رحمت و امداد کا قافلہ اترنے کیلئے اب کس گھڑی کا انتظار ہے؟ ناموس کا خرمن جل جانے کے بعد کوئی آ کر بھی کیا کرے گا مایوسیوں کے گرداب میں غوطہ لگاتے ہوئے اب میرے ایمان و یقین کی بنیاد ہلنے لگی ایک ایک کر کے اعتماد امید کے وہ شیزارے بکھرنے لگے جو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ مربوط تھے زیست کی طہارت و سلامتی کا یہی ایک آخری سہارا تھا سو وہ بھی اب دم توڑ رہا تھا۔ اب میں مشکوک ہو کر سوچنے لگی کہ غیبی کارسازیوں کی جو روایتیں مجھ سے والد صاحب نے بیان کی تھی کیا وہ فرضی کہانیوں کی طرح سراسر جھوٹی ہیں۔"

اسی امید و بیم کی کشمکش میں بھیانک انجام سوچ کر مجھ پر اچانک غشی طاری ہوگئی۔ بہت دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ دلہن کی طرح سجا دیا گیا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میں شدت سے بے قابو ہوگئی۔" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔

یارسول اللہ! اپنی فاطمہ کے صدقے میری آبرو بچائیے۔

ابھی میری یہ چیخ فضا میں تحلیل بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہی آفت نصیب کنیز بدحواسی کے عالم میں دوڑتی ہوئی آئی اور دہشت ناک لہجے میں اطلاع دی۔ ارے غضب ہوگیا "جہاں پناہ کو ایک نہایت مہلک قسم کے بچھونے ڈنگ مار دیا ہے۔ وہ ماہی بے آب کی طرح بستی پر تڑپ رہے ہیں پاسبانوں کو جلدی خبر کر دو وہ فوراً شاہی طبیب کو بلا لائیں جہاں پناہ صرف چند گھڑی مہمان ہیں۔

یہ خبر دے کر وہ پاگلوں کی طرح الٹے پاؤں واپس لوٹ گئی۔ اس واقعہ سے اچانک سارے محل میں کہرام مچ گیا۔ تمام کنیزیں اور مشاطائیں میرے پاس سے فوراً اٹھ گئیں۔ اور ادھر ادھر بدحواسی کے عالم میں دوڑنے بھاگنے لگیں۔

آن کی آن میں محل کا نقشہ بدل گیا میرے یقیں کے بجھتے ہوئے چراغوں کی لو تیز ہوگئی۔ میری امیدوں کا آبگینہ شکست کی زد سے بچ گیا۔ خوشا نصیب کہ میری آتشیں فریاد مدینے کی چوکھٹ سے بامراد واپس آئی۔ میری روح کے معنوی سہاروں کی عمر دراز ہوگئی۔

میرے دل کے تاریک ویرانے اچانک کسی شاداب گلستان کی طرح لہلہا اٹھے۔

اب سجدہ شکر کے اضطراب سے میری پیشانی بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ اچانک سر کے بل میں زمین پر گر پڑی۔ بھرپور تنہائی کے عالم میں میری نیاز بندگی کے مچلنے کا تماشہ قابل دید تھا۔ کئی بار فرط مسرت میں اچھل کر میں عرش الٰہی کے کنگروں کو چھو آئی۔

میری روح کے نہاں خانے میں غیبی چارہ گری کا جو یقین جھاگ اٹھا تھا۔ اب اسے سلا دینا آسان نہیں تھا۔ کئی پہر رات تک جذبات کے تلاطم کا یہی عالم رہا۔ جیسے مجھے تنہائی کا موقع ملا میں نے شیطان کا مہیا کیا ہوا پیراہن فوراً اتار دیا اور اپنے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہوگئی۔

چونکہ میں اپنی زبان پر قفل لگائی تھی۔ اس لیے میں اس واقعہ کے انجام سے متعلق کسی سے کچھ دریافت نا کر سکی لیکن ساری رات محل کے مختلف حصوں میں شور و فغاں کی آواز سے یہ اندازہ ضرور ہو کہ قہر الٰہی کی مار بڑی جاں گسل ہے۔

صبح کو میرے کمرے کے قریب دو کنیزیں باتیں کر رہی تھیں نہ جانے کس قسم کا وہ زہریلا بچھو تھا کہ ابھی تک اس کی زہر نہیں اتری۔ اور سب سے بڑی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ طلسم ہوشربا کی طرح جانے وہ بچھو کہاں غائب ہوگیا کہ محل کا ایک ایک چپہ چھان مارنے کے باوجود اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

دوسری کنیز نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور سب سے لرزہ خیز بات تو یہ ہے کہ دربار کے رومی طبیب نے کہا ہے کہ بادشاہ کا اس مہلک زہر سے جانبر ہونا بہت مشکل ہے۔ بالفرض علاج معالجے وہ اچھے بھی ہوگئے تو یہ زہر زندگی کے آخری لمحے تک ان کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ چونکہ سارے محل کی توجہ اب بادشاہ کے علاج کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

اس لیے ان ایام میں میں نشانے سے ہٹ گئی تھی۔ تسبیح و درود اور تلاوت و نماز کے علاوہ میرا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ نہ میرا کسی سے کوئی واسطہ تھا۔ اور نہ بجز ایک دو کنیزوں کے جو میری ضرورت کی چیز مہیا کرنے پر معمور تھیں نہ کوئی میرے قریب آتا تھا میری زبان بندی نے مجھے بہت سارے مصائب سے بے خطر کر دیا تھا۔ خیالات کی طہارت اور دل کی یکسوئی کے باعث اب میری روح کی لطافت ملکوتی سرشت سے دن بدن قریب ہوتی جارہی تھی۔ مدینے کے آسمان سے سفید بادلوں کے امنڈتے ہوئے قافلے اب میری نظر کے سامنے ہر وقت رواں دواں رہا کرتے تھے۔ اب ماتھے کی آنکھوں سے میں اس حقیقت کا شب و روز نظارہ کرنے لگی تھی کہ مظلوموں کی آہ کس طرح آسمان کے دریچوں سے گزر کر باب رحمت پر دستک دیتی ہے۔

جلوؤں کے اسی عالم رنگارنگ میں میرے کئی مہینے گزر گئے۔ میری روح کی نفاست و تازگی کا وہ خوشگوار موسم حافظے سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ ایک دن میں اشکبار آنکھوں سے قرآن کی تلاوت کر رہی تھی کہ محل کی ایک کنیز آئی اور دوزانو ہو کر میرے سامنے بیٹھ گئی جب میں تلاوت سے فارغ ہوئی تو اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا مجھے آپ کے تقدس میں تاب زندگی سے بے حد عقیدت ہوگئی ہے۔ آپ کے نالہ سحر نے پہاڑوں میں شگاف ڈال دیا ہے۔

اب آپ اپنی بے داغ زندگی کو زیادہ آزردہ نہ کیجیے ظالم کو اپنے کرتوت کی سزا مل گئی۔ طبیبوں نے کہا ہے کہ بچھو کے زخم نے ناسور کی شکل اختیار کرلی ہے اب وہ بہت دنوں تک اچھا نہیں ہوگا مظلوم کی آہ ایک ایسا شرارہ ہے جس کی تپش سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں اب میرا درد کسی درماں کا محتاج نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے کنیز کی باتوں سے میرے دل کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا زندگی کے اسی مدوجزر میں چھ مہینے کی طویل مدت گزر گئی۔

اچانک ایک دن ایسا محسوس ہوا کہ پھر میری حیات کے افق پر مصائب کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ایک شام کو پس دیوار چند ایرانی کنیزیں آپس میں سرگوشیاں کررہی تھیں۔

آخر ایران ہی کا طبیب دست شفا ثابت ہوا۔ اس کے علاج سے جہاں پناہ کو حیرت انگیز طور پر صحت یاب حاصل ہوئی ہے ورنہ مملکت کے تو سارے طبیبوں نے اس زخم کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

دوسری کنیز نے دریافت کرتے ہوئے جواب دیا تمہیں معلوم ہے جہاں پناہ غسل صحت کس دن فرمانے والے ہیں۔

جواب دیا۔ اس کی تاریخ کیا مقرر ہوئی ہے یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا پتہ چلا ہے کہ دارالخلافہ میں جشن صحت کی عظیم تیاریاں ہورہی ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جہاں پناہ غسل صحت کے دن غزالہ نام کی لڑکی اس محل میں مقید ہے وہ ان کے حجلہ عروسی میں داخل کی جائے گی۔

یہ وحشت ناک خبرسن کر میرے دل کی بے قراریوں کا موسم پلٹ آیا پھر سویا ہوا درد جاگ آٹھا اور پھر میں اندر ہی اندر سلگنے لگی لیکن میرا یقین اپنی جگہ پر سلامت تھا کہ اس بار بھی رحمت یزدانی ضرور میری مدد کرے گی۔ میری بے جان لاش کے جنازے سے پہلے میرے ناموس کا جنازہ کبھی نہیں آٹھے گا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد محل کے اندر سے لے کر باہر تک تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس زمانے میں غم کا احساس اتنا نازک ہوگیا کہ شادیانے کی آواز سے رگ جاں پر چوٹ پڑتی تھی۔

ایک دن شام کو وہی شوخ وعیار کنیز میرے پاس یہ پیام مرگ لے کر آئی۔ لاڈلی! محل میں رہتے ہوئے تمہیں کافی عرصہ ہوگیا ہے اب تو یہاں کا ماحول راس آگیا ہوگا۔ آج پھر تمہیں دلہن بنانے کے لیے مشاطائیں آرہی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ بغیر کسی مزاحمت کے تم ان کی پیش کش قبول کرلوگی۔ آج جہاں پناہ کا جشن صحت ہے کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے نہ پائے ان کی مسرتوں میں شریک ہونا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے۔

یہ جاں سوز خبرسنا کر وہ بدبخت چلی گئی اور میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی تھوڑی دیر کے بعد وہی مشاطائیں کنیزوں کا دستہ لیے ہوئے پھر میرے پاس آئیں اور میرے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

پہلے تو انہوں نے نہایت رازدارانہ لہجے میں مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی جب میں نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا تو ساتھ آنے والی کنیزوں نے میرے دونوں بازو تھام لیے اور مجھے اپنے شکنجے میں لے لیا۔ اس کے بعد چاروں طرف سے مشاطائیں ٹوٹ پڑیں اور جس حد تک وہ مجھے بدل سکیں بدل دیا۔ اس کے بعد جیسے ہی کنیزیں مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہوئیں۔ میں نے ساری آرائش نوچ کر پھینک دی۔

اس درمیان میں وہ بدبخت کنیز بھی آگئی۔ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا تو غصے میں بھر گئی اور نہایت سخت سست کہنے لگی۔ اس کے بعد کنیزوں کو حکم دیا۔ یہ نہیں مانتی تو اسی حال میں حجلہ عروسی تک اسے پہنچادو۔ اس کے بعد ظالموں نے زبردستی سے اپنی گود میں اٹھایا اور حجلہ عروسی میں لے جاکر بٹھادیا اور بد نہاد کنیز بھی وہاں موجود تھی میری طرف منہ کرکے کہنے لگی۔

ابھی جہاں پناہ دربار میں عمائدین سلطنت کی مبارکباد قبول کررہے ہیں جیسے ہی توپ سرد ہوگی وہ وہاں سے اٹھ کر حجلہ عروسی میں تشریف لائیں گے۔

دروازے پر کنیزوں کا پہرہ تھا اور میں اندر اپنی تقدیر کا ماتم کررہی تھی سخت اضطراب تھا کہ میں اپنے ناموس کے مدفن میں پہنچ گئی تھی۔ پردۂ غیب سے اب تک کوئی ہاتھ نمودار نہیں ہورہا تھا۔ پھر میرے ایمان ویقین کی دیوار ہلنے لگی پھر مایوسیوں کے گرداب میں میرا دل ڈوبنے لگا امید کا ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ جل رہا تھا تو وہ بھی آندھیوں کی زد پر تھا دل کی امید وبیم کا یہی عالم تھا کہ اچانک توپ سرد ہوئی ایک چنگاری اڑی اور امید کا سارا خرمن جل گیا۔ ہٹو بچو اور مبارک سلامت کا شور سے سارا محل گونج اٹھا۔

اب میں اپنے آپ میں نہیں تھی شدت اضطراب میں زمین پر لوٹنے لگی دہشت سے میری رگوں کا خون منجمد ہوگیا موت کے سوا اب کوئی میرے ناموس کا محافظ نہیں رہ گیا اسی عالم سوگ میں ایک بدبخت کنیز نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔ ادب سے کھڑی ہوجاؤ جہاں پناہ دینے سے گزرتے ہوئے اب ادھر ہی آنا چاہتے ہیں۔

یہ خبر نشتر کی طرح میرے کلیجے میں چبھ گئی میں ایک دم تلملا اٹھی میرا دم گھٹنے لگا۔ اب میرے اعتماد ویقین کا شیرازہ بکھرنا ہی تھا کہ ناگہاں محل کے زیریں حصے میں ایک شور بلند ہوا وہی کنیز غائبانہ طور پر مجھ سے مانوس تھی میرے پاس دوڑی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئی کہا اپنا خون نہ جلایئے مدینے کے آسمانوں سے چارہ گاروں کا قافلہ آگیا ہے بادشاہ زینے سے گرکر بے ہوش ہوگئے ہیں۔

جیسے ہی یہ خبر دے کر واپس لوٹی وہی شوخ وعیار کنیز افتاں وخیزاں میرے پاس آئی اور مجھ سے کہا کہ فوراً! کمرا خالی کردو جہاں پناہ بے ہوش ہوگئے ہیں اٹھا کر یہیں لایا جارہا ہے میں دل ہی دل میں شکر الٰہی بجالاتی ہوئی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

آج میرے ایمان ویقین کے عروج کی انتہا نہیں تھی۔ میں نے دست غیب کی توانائیوں کا بے حجاب تماشا دیکھا تھا۔ یہ راز اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ انسان کی آزمائش میں ثابت قدم رہے تو رحمت کارساز اسے تنہا نہیں چھوڑتی۔ خدا آباد رکھے طیبہ کی نورانی سرزمین کو گیتی کے مظلوموں کی وہ پناہ گاہ ہے کوئی بھی رہے دل مغموم کا نالہ رائیگاں نہیں جاتا۔

اس سیاہ کار اور بد طعنیت بادشاہ کا علاج کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ایک دن مجھے اس قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ جب سے میں یہیں ہوں یہاں پہنچ کر غزالہ اپنی بڑی بہن ملکہ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

قید خانے میں غزالہ سے ملاقات کے بعد اپنی ہی کمرے میں اسے بلا لیا۔ دونوں بہنیں ساتھ ہی رہنے لگیں۔ چند ہی دنوں کے بعد ایک صبح کو غزالہ گھبرائی ہوئی اٹھی اور ملکہ کو بیدار کیا ملکہ نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت کے عالم میں گھبرائی ہوئے دریافت کیا نصیب دشمناں کیا بات ہے جلدی کہو؟

غزالہ نے کہا " گھبرانے کی کوئی خاص بات نہیں ہے آپا! میں نے ابھی ابھی ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے ایسا لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے میں نے ابھی گھوڑوں کی نہ ٹوٹنے والی ایک قطار دیکھی ہے جن پر نہایت جمیل وشکیل نوجوان سوار تھے۔ ان کے ہاتھ میں ننگی تلواریں بجلی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان کی اونچی کلغیوں سے عجیب طرح کی ہیبت ٹپک رہی تھی میرے سینے پر ذرا ہاتھ رکھ کر دیکھو اب تک میرا دل دھڑک رہا ہے۔

ملکہ نے کہا خدا کرے تمہارا خواب مبارک ومسعود ثابت ہو یسے مجھے یقین ہے کہ ظلم کی ٹہنی زیادہ دنوں تک شاداب نہیں رہ سکتی۔ کسی نہ کسی طرف سے قہر الٰہی کا کوئی نا کوئی طوفان ضرور اٹھے گا۔ آواز دو اس رحمت مجسم کو جو روئے زمین پر مظلومون کا بہترین حامی ہے۔ جس نے طاغوت کے قید خانے سے انسانیت کو آزاد کرایا تھا۔ اس کی تیغ ابرو کا ایک ہلکا سا اشارہ آن واحد میں ہماری تمام بیڑیوں کو کاٹ سکتا ہے۔

غزالہ کو اپنے خواب کی تعبیر کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ ہر روز سر بسجود ہو کر گھنٹوں رہتی تھی کہ وہ سسکیوں کی زبان میں اپنے پروردگار سے کیا کہا کرتی تھی۔ پر اتنی بات سب جانتی تھیں کہ اس کے ڈوپٹے کا آنچل نم رہا کرتا تھا۔

چند ہی ہفتوں کے بعد ایک زبردست واقعہ رونما ہوا زندانیوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا اس میں ایک وقت کی کمی واقع ہوگئی دوسرے دن آنے جانے والی ایک کنیز کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی آنے والے خطرے کے پیش نظر مملکت کا غلہ محفوظ کیا جا رہا ہے اس لیے عارضی طور پر اس میں تخفیف کر دی گئی ہے خطرہ ٹل جانے کے بعد پھر اسے دستور کے مطابق بحال کر دیا جائیگا۔

ایک دن صبح سویرے غزالہ سجدے میں سر رکھے ہوئے رو رہی تھی کہ محل میں ایک شور برپا ہوا تہہ خانے کی دیوار ہلنے لگیں گرجتی ہوئی آوازوں کی دھمک سے دلوں کا عالم زیروزبر ہونے لگا۔ سب پر ایک عجیب سی دہشت طاری ہوگئی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ تہہ خانے کے باہر یہ شور کیسا ہے؟ اسی اثنا میں بال نوچتی سر پیٹتی کنیز تہہ خانے میں داخل ہوئی اس نے ہانپتے کانپتے بتایا کہ اچانک شہر پر غنیم نے چڑھائی کر دی ہے۔ دشمن کی فوجیں شہر پناہ کی فصیل توڑ کر قلعہ کے دروازے تک پہنچ گئی ہیں محل میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی بدحواسی کے عالم میں جو جدھر بھاگ رہا ہے مملکت کا تاج خطرے میں ہے نہیں کہا جا سکتا کہ گھنٹے دو گھنٹے میں کیا انقلاب رونما ہو جائے۔

اتنا سننا تھا کہ غزالہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اور دوپٹہ اپنی کمر سے کستے ہوئے کہا۔

آپا جان! مجھے اجازت دیجیے ذرا میں ان کلغیوں کو دیکھ لوں جن کی چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ یقین کیجیے یہ زمین کے غارت گروں کا کوئی لشکر نہیں ہے۔ جس کا مقصد لوٹ مار قتل فساد اور بے گناہ شہریوں کو ایارسانی ہو بلکہ یہ مظلوموں کے حامیوں کا ایک دستہ ہے جو کائنات ارضی کی راجدھانی کے لیے بھیجا گیا ہے۔

مبارک ہو اس تہہ خانے کی زندانیوں کو نجات کا وقت قریب آگیا۔ اتنا کہتا ہوئے وہ بجلی کی طرح اڑی اور نگاہوں سے غائب ہوگئی تہہ خانے کے دروازے پر آج کوئی پہرہ نہیں تھا اس لیے آسانی سے باہر نکل گئی تھی۔ پر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے البتہ اسے تھوڑی سے وقت پیش آئی لیکن شور وہنگامہ کے رخ پر چلتے ہوئے وہ محل کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔

محل کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک عجیب نقشہ اس کے سامنے تھا۔ ہر طرف دہشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کنیزیں سکتے کے عالم حالت میں دیواروں سے لگی کھڑی تھیں قلعہ کے باہر شور وفغان کی قیامت برپا تھی ہمت کر کے آگے بڑھی اور ایک زینے پر جو قلعہ کے دروازے کی برجیوں کی طرف نکل گیا تھا چڑھ گئی۔ کافی دور چلنے کے بعد اسے ایک برجی کے روشندان سے باہر کا کچھ حصہ نظر آیا وہیں چھپ کر یہ کھڑی ہوگئی۔

غنیم کی فوجیں بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی آرہی تھیں یہاں تک کہ بالکل اس کی نگاہوں کی زد میں پہنچ گئیں جیسے ہی اس نے گردن اٹھائی کلغیوں والے نوجوان کو دیکھنے کے اشتیاق پورا ہو گیا بالکل خواب کا منظر آنکھوں کے سامنے تھے وہی بجلیوں کی طرح چمکتی ہوئی تلواریں وہی تیز دوڑ گھوڑون کی نہ ختم ہونے والی قطار نظر کے سامنے گزر رہی تھی۔

محویت کے ایک عجیب عالم میں وہ یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ فضا میں ایک بار نعرہ تکبیر کی آواز گونجی اور قلعہ کی فصلیں ہل گئیں تھوڑی دیر کے بعد ایک دھماکے

کی آواز سنائی پڑی ایسا معلوم ہو جیسے کوئی دیوار ٹوٹ کے گر پڑی ہو۔ اب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز قلعہ کی حدود میں سنائی دینے لگی۔
شاید غنیم کی فوج قلعہ میں داخل ہوگئی تھی اب غزالہ نیچے اتر کر اس برجی میں آ کھڑی ہوگئی جہاں سے محل کا اندرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔
وہ منظر بڑا ہی عبرت ناک تھا جبکہ محل کا دروازہ توڑ کر فوج کے سپاہی اندر داخل ہو رہے تھے ناگہاں قریب سے ہی ایک گرجدار آواز گونجی۔
جور و استبداد کے بانی کو گرفتار کر کے سپہ سالار کے سامنے پیش کیا جائے محل کی مستورات اور کنیزیں کو ہاتھ نہ لگایا جائے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔
پس دیوار یہ آواز سن کر غزالہ چونک گئی اسے یہ جانی پہچانی آواز معلوم ہو رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی آواز اور قریب سے سنائی دی اس مرتبہ غزالہ پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔
بالکل اس کے مرحوم باپ سے ملتی ہوئی آواز تھی غزالہ کے علم و یقین میں چونکہ باپ ڈاکوؤں کے ہاتھوں شہید ہو چکا تھا اس لیے اسے سخت اچنبھا ہوا۔ اب نہایت بے تابی کے ساتھ وہ چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔
اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ چند سپاہی بادشاہ کو گرفتار کر کے کشاں کشاں لیے جا رہے تھے یہ منظر دیکھ کر وہ برجی کے فرش پر سجدہ شکر کے لیے جھک گئی۔ اب اسے اچھی طرح یقین ہوگیا تھا کہ گھڑی دو گھڑی میں زنداں کا دروازہ کھل جائے گا۔
اب ہمت کر کے وہ نیچے اتر آئی۔ اور ایک جگہ چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ امید و بیم کی حالت میں ایک عجیب کیفیت اس پر طاری تھی۔ کبھی دل پر یہ خیال گزرتا کہ اب رہائی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ کا بھی ہی اندیشہ دامن گیر ہوتا کہ کہیں ایک مصیبت سے چھوٹ کر دوسری مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائیں انجام سمجھ میں نہیں آ رہا تھا خیالات کی اسی کشمکش میں وہ گم سم کھڑی تھی کہ سامنے ایک وجیہہ و مقدس چہرہ طلوع ہوا غزالہ کی نگاہ اٹھی پھر جھک گئی پھر دوسری بار اٹھی اور حیرت میں ڈوب گئی۔
کیا سچ مچ ابا جان .... ؟ مگر وہ تو مدت ہوئی ڈاکوؤں کے ہاتھ شہید ہوگئے۔ شہیدوں کو زندگی ضرور ملتی ہے۔ لیکن ایسی زندگی کیسے ملی ہے۔ صرف آواز کا مشابہ حسن اتفاق تو کہا جاسکتا ہے مگر اتنے بڑے حسن اتفاق کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ آواز، چہرے، مہرہ اور قد و قامت ہر چیز ہو بہو مل جائے۔
سکتے کی حالت میں کچھ دیر اسی طرح کے خیالات اس کے ذہن میں گزر رہے تھے پھر اچانک اس کے قدموں میں جنبش پیدا ہوئی دبے پاؤں وہ جانے والے کے پیچھے چل پڑی اچانک اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کے باپ کی سب سے چھوٹی انگلی میں ایک یاقوت سرخ کی انگوٹھی تھی جسے مرنے سے چند گھنٹے پیشتر اس کی ماں نے اپنی انگلی سے اتار کر اس کے باپ کی انگلی میں پہنائی تھی۔ اس سے بات پر سخت حیرت تھی کہ بغیر کسی محافظ دستہ کے وہ اکیلے محل میں گشت کر رہا تھا کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک جگہ کھڑی ہوگئی اور انگوٹھی دیکھنے کی تمنا میں وہ اس شخص کا انتظار کرنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ شخص واپس لوٹا دور ہی سے یاقوت سرخ کی انگوٹھی اس کی سب سے چھوٹی انگلی میں چمک رہی تھی۔
اب غزالہ سے ضبط نہ ہوسکا بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی ابا جان! جانے والے نے پلٹ کر دیکھا اور رک گیا۔ ایک لمحے کے بعد پھر ایک چیخ بلند ہوئی "بیٹی غزالہ "؟ غزالہ کو ارمان آ گیا اور وہ باپ کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ جذبات کا طوفان تھم جانے کے بعد اس نے باپ سے دریافت کیا۔
"ابا جان!" آپ تو ہمارے علم و یقین میں شہید ہو چکے تھے۔ دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں کیسے آ گئے؟
باپ نے جذبہ شفقت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
بیٹی! میری واپسی کی داستان بڑی حیرت انگیز ہے اور انتہائی دردناک یہ قصہ میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔ پھر تم سے تمہاری الم ناک سرگشت سنوں گا۔ لیکن ابھی چند مہم سر کرنا باقی ہیں۔ پہلی مہم تو یہ ہے کہ جب تک تمہاری بڑی بہن کا سراغ نہیں لگا لوں گا۔ چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں تمہیں آسانی سے پالیا۔ اب تمہاری بڑی بہن کی فکر دامن گیر ہے دوسری مہم یہ ہے کہ اس بادشاہ کو جب کیفر کردار تک نہیں پہنچا لوں گا۔ مجھ پر آب و دانہ حرام ہے۔
غزالہ نے خوشی سے مچلتے ہوئے کہا
آپا یہیں ہیں۔ ایک تہہ خانے کے اندر انہیں قید کر دیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ بہت سی عورتیں گرفتار ہیں میں بھی انہیں کے ہمراہ تھی ابھی چند گھنٹے ہوئے تہہ خانے سے چھپ چھپا باہر آئی ہوں
یہ خبر سن کر بوڑھے باپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ بہت مشکل سے جذبات پر قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔
غزالہ! کیا تم نے تہہ خانے کا راستہ دیکھا ہے۔ کیا تم مجھے اکیلی وہاں تک لے جا سکتی ہو"۔ غزالہ نے جواب دیا "۔ تھوڑی سی دقت ضرور پیش آئے گی لیکن پہنچ جاؤں گی۔ ویسے آپ اجازت دیں تو محل کی کنیز کو ساتھ لے لوں۔"
تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز کی رہنمائی میں غزالہ اپنے باپ کو تہہ خانے کی طرف لے کر چلی۔ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچ کر اچانک اس کے جذبات

کے سمندر میں طوفان امنڈنے لگا۔ وہ بے قابو ہوگئی اور پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی دور ہی سے اپنی بہن کو آواز دینے لگی۔ "آپا جان مبارک ہو! ابا ایک بہت بڑی فوج لے کر آئے ہیں ظالم بادشاہ شکست ہوگئی۔ آج سے ابا اس سلطنت کے والی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔

غزالہ کی بڑسن کر ملکہ ہنسنے لگی۔ لیکن چند ہی لمحے کے بعد ملکہ کی نظر اپنے بوڑھے باپ پر پڑی تو خوشی سے پاگل ہوگئی۔ اچانک چیخ اُٹھی۔

ہائے اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں کیا سچ مچ میرے ابا آگئے۔ کیا ہماری نجات کا وقت آگیا۔ اس کے بعد دیر تک باپ کے دامن سے لپٹے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اب غزالہ کے بوڑھے باپ نے ایک فاتح سپہ سالار کی حیثیت سے تہہ خانے کے صحن میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

ہر شخص سن لے کہ ظالم و جابر بادشاہ کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا۔ آج سے میں اس مملکت کا والی ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ تمام گرفتار عورتیں آزاد ہیں اور تمام کنیزیں آزاد ہیں اور تمام غلام آزاد ہیں۔ دروازہ کھول دیا جائے زنجیریں توڑی جائیں آج مظلوموں کی دادرسی کا دن ہے۔ آج زیردستوں کے انتقام کا دن ہے۔

یہ اعلان سننے کے بعد تہہ خانے کی ساری عورتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی غزالہ کے باپ کو سب نے آنچل پھیلا کر دعائیں دیں۔ آج ایک مدت کے بعد زنداں کی تاریک قبر سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تہہ خانہ خالی ہوگیا۔

دوسرے دن شہر کے سب سے بڑے میدان میں ہزاروں تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے آج ظالم و جابر بادشاہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کا دن تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جلادوں کا دستہ تیز رفتار گھوڑے اپنے ہمراہ لیے میدان میں اترا فولاد کی زنجیروں میں گرفتار ظالم و جابر بادشاہ بھی ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔

سارا مجمع بے چینی سے منتظر تھا کہ دیکھنا ہے کہ آج فاتح سپہ سالار کس طرح ظالم سے انتقام لیتا ہے۔ یہی عالم تھا کہ بوڑھے باپ سپہ سالار نے کھڑے ہو کر مجمع کو مخاطب کیا۔

معزز حاضرین! آپ نے دیکھ لیا کہ ظالم و جبر کے خلاف قہر والٰہی کا طوفان کس طرح امنڈتا ہے میں ایک گوشہ نشیں و درویش ہوں۔ میری زندگی کا میدان، میدانِ جنگ نہیں تھا لیکن ہاتف نجیب کے اشارے پر ظلم و جور کی بادشاہت کا تختہ اُلٹنے کے لیے میں نے تلوار اٹھائی اور قدرت نے مجھ گدائے بے نوا سے وہ کام لیا جو بڑے بڑے سورما انجام دیا کرتے ہیں۔

آج کھلی آنکھوں سے لوگ یہ عبرت ناک تماشہ دیکھ لیں کہ کل تک جو فرعون کے تخت پر بیٹھ کر زیردستوں کی آبرو سے کھیلتا تھا آج وہ ذلتوں کی زنجیر میں گرفتار ہے اپنی فرمانروائی کے گھمنڈ میں ل تک جس نے خدا کی بے گناہ مخلوق پر دست درازی کی تھی۔ آج وہ اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ گیا۔ اس سنگدل نابکار کی شقاوت کے نتیجے میں نہ جانے کتنی آنکھوں کے آنسو آنچلوں میں جذب ہوگئے۔ دلوں کے کتنے آبگینے ٹوٹ کر خاک میں مل گئے۔ کتنے گھروں سے آہوں کے دھوئیں اٹھے اور کتنی پاک طینت روحوں نے گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیا۔

زیردستوں، کمزوروں اور بے گناہوں کی مظلومی بالآ کر رنگ لائی غرور سلطانی کا وہ بت آج قدموں کی ٹھوکروں سے پاش پاش ہوگیا۔

مملکت کے مظلوموں کے صدائے عام ہے انہیں اور اس نانہجا کے منہ پر تھوک تھوک کر اپنے انتقام کی آگ بجھالیں۔

مجمع میں آواز آئی ہمارے زخموں کی تسکین کے لیے اتنا بہت ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

یہ جواب سننے کے بعد فاتح سپہ سالاروں نے جلادوں کو حکم دیا کہ دو تیز رفتار گھوڑوں کے پاؤں سے اس سیہ بخت کے دونوں ہاتھ الگ الگ باندھ دیے جائیں اور انہیں پوری قوت کے ساتھ دوڑایا جائے جس وقت اس حکم کی تعمیل کی گئی قہر الٰہی کی ہیبت سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ دم کے دم میں اس سیاہ کی لاش کے پرزے اڑ گئے۔ ظلم کی ناؤ پانی میں نہیں خشکی میں ڈوب گئی۔

اس مہم سے فارغ ہو کر سپہ سالار نے محل کا رُخ کیا۔ اس کے حکم کی ساری کنیزیں ایک جگہ جمع کی گئیں۔ اور انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ان میں سے وہ جو بادشاہ کی دلالہ تھیں انہیں عبرتناک سزا دی گئی ظالم بادشاہ نے جن لوگوں کے مال ضبط کر لیے تھے زبردستی جن کی جائیدادیں چھین لیں تھیں جن کی لڑکیوں کو جبراً اُٹھوا منگوایا تھا ایک اعلان عام کے ذریعہ سب کو دربار میں طلب کیا گیا اور جس کا جو حق تھا اسے واپس کر دیا۔

لوگوں نے فرط عقیدت سے فاتح سالار کے قدم چوم لیے۔

شام ہوتے ہی فاتح سپہ سالار اپنی ساری مہم سے فراغت حاصل کر چکا تھا۔ اب اسے ایک مدت کے بعد اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ سب سے پہلے اس نے غسل کیا کپڑے بدلے اور انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہ ذوالجلال میں شکر ادا کیا۔ رات کے وقت فاتح سپہ سالار کی دونوں لڑکیاں اپنے باپ کی حیرت انگیز سرگزشت سننے کے لیے نہایت بے تابی سے اپنے بوڑھے باپ کے پرسکوں لمحون کا انتظار کر رہی تھیں۔ عشاء کی نماز اور وظاف و اوراد سے فارغ ہونے کے بعد بوڑھے باپ نے اپنی دونوں بچیوں کو اپنے قریب بلایا اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی آپ بیتی سنائی۔

غزالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا بیٹی تمہیں یاد ہوگا۔ رات کے پچھلے پہر جب ڈاکوؤں نے کمند پھینک کر ہمیں گرفتار کیا تو تمہیں ایک گھوڑے کی پشت پر باندھ کر فرار ہوگئے تھے اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا پیش آیا وہ تم بتاؤ گی۔ لیکن ماجرا یہ کہ وہ مجھے گھوڑے پر لاد کر تھوڑی دور لے گئے اور ایک پہاڑی

کی بلندیوں سے مجھے باندھ کر دھکیل دیا۔
جیسے ہی میں نیچے کی طرف لڑھکنے لگا میری آنکھیں از خود بند ہوگئیں اور میں نے انتہائی درد وکرب کے ساتھ اپنے سرکار کو پکارا۔ حضور کے قلب کی راہ سے مدینہ کچھ دور نہیں تھا۔ فوراً سرکار نے میری فریاد سنی اور اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اب میں نے آنکھوں کھول کر جو دیکھا تو ایک گہرے غار کی چٹان پر لٹا دیا گیا تھا۔ یہ بھی میرے سرکار کا کھلا ہوا اعجاز تھا کہ مجھے ذرا بھی کہیں چوٹ نہیں آئی تھی۔ حالانکہ میں جتنی بلندی سے اس گہرے غار میں پہنچا تھا۔ میرے جسم کے ٹکڑے اڑ جانا چاہیے تھا۔ اسی حالت میں صبح ہوگئی اور میں نے تیمم کر کے اس تاریک غار میں نماز فجر ادا کی۔
پہاڑ کی چوٹیوں پر جب دن کا اجالا پھیلا تو میں نے غار سے نکل کر راستہ تلاش کیا لیکن وہ اتنی خوفناک جگہ تھی کہ کسی طرف سے بھی واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مایوس ہو کر پھر میں اسی غار میں لوٹ آیا۔ جیسے جیسے دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ میرے دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ آفتاب ڈوب گیا تارے نکل آیا اب ہر طرف سے توجہ سمیٹ کر اپنے دل کا زاویہ درست کیا اور عالم تصور میں آقا کی چوکھٹ پر حاضری دی"۔
آہ میری زندگی کی کتنی دل کش رات وہ! سارے جہاں میں رگ وجاں کا کوئی رشتہ نا تھا۔ سب سے کٹ کر میں ایک پیکر لطیف بن گیا تھا۔ جب میں عالم ہوش کی طرف واپس لوٹا تو سحر ہو چکی تھی۔ اپنی
بھیگی پلکوں کے ساتھ اٹھ کر تیمم کیا اور نماز فجر ادا کی۔ وہ سجدے بھی تمام عمر یاد رہیں گے کتنا حضور قلب تھا اس رات کی نماز میں جیسے تجلیات الٰہی کی مشعل پلکوں کے نیچے چل رہی تھی ڈاکو اپنے تئیں مجھے زندگی کی زحمت میں ڈال گئے تھے لیکن وہ میرے وجود کے لیے سب سے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔
اسی عالم کیفیت وشہود میں کئی دن گزر گئے نہ بھوک پیاس کا غلبہ تھا نا کسی طرح کا اضمحلال محسوس ہوتا تھا۔ اپنے آقا کے احسانات کی بارش میں بھیگ بھیگ کر شرابور ہو گیا تھا۔
اب دل میں پہلے جیسے تنہائی کی وحشت نہیں تھی۔ انجانے طور پر نہاں خانہ قلب میں اس یقین کی شمع جل اٹھی کہ کسی نہ کسی دن کوئی غیبی ہاتھ ضرور نمودار ہوگا اگر چہ چاروں طرف سر بفلک چٹانوں کی دیوار کھڑی تھیں۔ لیکن دل مطمئن تھا کہ غیبی چارہ گروں کے لیے رہگذر پیدا کر دینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔
جو پروردگار پتھر کے جگر میں کیڑوں مکوڑوں کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کی رحمت متوجہ ہوگئی تو میرے لیے بھی نجات وسلامتی کا کوئی راستہ کھل جائے گا۔
قافلہ رحمت کے انتظار میں ایک مہینے کی مدت گزر گئی لیکن کسی طرف سے بھی امید کی کوئی کرن نہیں پھوٹی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں غار میں مصروف عبادت تھا کہ باہر پہاڑ کی چٹانوں پر آدمیوں کی آواز سنائی دی۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے مسرت اور امید کا چراغ جلا تھا۔ باہر نکل کر میں نے دیکھا تو وہ آدمی کمند کے ذریعے چٹانوں سے اتر رہے ہیں وادی سرزمین پر اترتے ہی میں نے انہیں سلام کیا۔
بجائے اس کے وہ میرے سلام کا جواب دیتے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا میں آدم زاد ہوں۔ بہت دیر کے بعد جب وہ میرے وجود سے مانوس ہوگئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس زندان مرگ میں جہاں سے واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے ان کے دردو مسعود کی غرض وغایت کیا ہے۔
انہوں نے بتایا کہ اس وادی میں ایسا ترق پایا جاتا ہے جسے حلق سے اتار لینے کے بعد مہلک سے مہلک زہر ہلاہل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی تریاق کی تلاش میں ہم یہاں تک آئے ہیں میرے چند ساتھی پہاڑ کی چوٹی پر کمند کا سرا پکڑے کھڑے ہیں۔
پھر میں نے انہیں اپنی سرگزشت سنائی جسے سن کر وہ سخت متحیر ہوئے۔ اس کے بعد چٹانوں کے شگاف سے انہوں نے تریاق کے کچھ اجزاء نکالے۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد انہوں نے کمند کے ذریعے اوپر چڑھنے کی تیاری شروع کر دی۔ چلتے وقت انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اوپر پہنچ کر اس طرح وہ مجھے بھی کھینچ لیں گے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اوپر پہنچ کر انہوں نے نیچے کمند گرائی میں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کمند سے باندھ لیا اس کے بعد رسی کو حرکت دی۔ انہوں نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔
اوپر پہنچ جانے کے بعد میں نے اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا اس کا فضل شریک حال نہ ہوا ہوتا تو ہرگز مجھے اس وادی مرگ سے نجات نہ ملتی۔
اوپر جو لوگ موجود تھے انہوں نے میری بہت خاطر مدارات کی۔ وہ مجھے ہمراہ آبادیوں تک لے گئے۔ وہاں میں نے چند دن قیام کیا۔
کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ حجاز کی طرف جانے والا ایک قافلہ کہیں قریب ہی سے گزر رہا ہے۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور خوبی نصیب کے قافلے کی گرد دور سے نظر آئی میں دوڑ کر شامل ہو گیا۔ اگر چہ حج کا وقت گزر چکا تھا۔ لیکن یہی نعمت کیا کم تھی کہ اپنے آقا کی سرکار میں حاضری کا شرف حاصل ہو گیا۔ جب بھی سنہری جالیوں کے سامنے کھڑا ہوتا تو غزالہ کی خاموش فریاد کا عالم قابو سے باہر ہو جاتا۔ ایک دن میری ارجمندی کا ستارا عروج پر تھا نیند کا ایک جھونکا آیا اور آنکھیں بند ہوگئیں خواب مین آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ میرے آقا ﷺ سامنے جلوہ گر ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ قسطنطنیہ میں ترکی کا بادشاہ تمہارا انتظار کر رہا ہے فوراً وہاں پہنچو۔"
میں دوسرے دن قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہو گیا راستے بھر میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ ترکی کا بادشاہ میرے جیسے گمنام شخص کا کیوں انتظار کر رہا ہے۔ چلتے

چلتے ایک دن میں قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ جونہی میں شہر پناہ کے دروازے پر پہنچا۔ داروغہ نے میرا نام دریافت کیا میرا نام سنتے ہی اس نے تاکید کی فوراً
دارالخلافہ جاؤ جہاں پناہ تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک لشکر جرار میدان میں کھڑا ہے سب سے پہلے بادشاہ
سے میں نے ملاقات کی اور سرکار ﷺ کی بشارت کا ذکر کیا۔ سلطان نے نہایت شفقت کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ کئی دن سے میں تمہارا
انتظار کر رہا ہوں بارگاہ رسالت ﷺ سے حکم صادر ہوا ہے کہ سمرقند کے بادشاہ کا ظلم و طغیان حد سے بڑھ گیا ہے لشکر تیار کھڑا ہے تم اس کی کمان سنبھالو اور سمر
قند پر چڑھائی کر دو۔ فتح تمہارے قدم میں ہو چکی ہے۔ تمہاری بیٹی غزالہ اہیں شاہی محل مین ایک تہہ خانے میں مقید ہے فتح کامرانی کے بعد تم اس ظالم
جابر بادشاہ کو کیفر کردار تک پہنچاؤ اور اس کی جگہ کسی دیندار شخص کو بٹھا کر واپس چلے آؤ۔ یہاں تک فاتح سپہ سالار کا قصہ تمام ہوا۔"
دوسرے دن اس نے لوگوں کو جمع کیا اور ایک عادل دیندار شخص کو تخت شاہی پر بٹھا کر اپنی دونوں بچیوں کے ہمراہ وطن واپس لوٹ آیا۔

امین جواڑی

دارجلنگ میں سونے، چاندی اور جواہرات کی تجارت کے لیے عبدالرحمان جوہری کا گھرانہ تھا۔ شہر کے صدر بازار میں سب سے بڑی دوکان اسی فرم کی تھی بیرونی ممالک سے درآمد برآمد کی کلید بھی ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

محمد امین، عبدالرحمان چودھری کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دولت وامارت کی چھاؤں میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اس لیے انتہائی نازونعم کے ساتھ پرورش ہوئی۔ حد سے زیادہ لاڈپیار نے اس کی زندگی کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ ہاتھ میں پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ جلد ہی اس کے دوستوں کا ایک حلقہ تیار ہوگیا۔ بری صحبتوں کا اثر اس کی زندگی پر بہت تیزی سے پڑنا شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ شہر کے اوباشوں، آواروں اور بدقماش لوگوں کی بھیڑ ہر وقت اس کے گرد جمع رہنے لگی۔ بہت ساری بری عادتوں کے علاوہ جوئے کی منحوس عادت اس کے گلے کا پھندا بن گئی۔ گھر کی دولت اسی نشانے پر صرف ہوتی رہی۔ افلاس کے سائے اس کی زندگی کے قریب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اس مہلک آزار نے اسے تباہی کے دھانے پر پہنچادیا۔ بزرگوں کی فہمائش پر سینکڑوں بار اس نے غور کیا۔ لیکن غارت گر ساتھیوں کی بزم میں پہنچ کر ہر بار اس کی توجہ ٹوٹ گئی۔

بیٹے کی غلط روی اور ہلاکت خیز روش سے باپ کے تمام ارمانوں کا خون ہوگیا۔ کاروبار کی ساری امنگیں سرد پڑ گئیں۔ گھر کا مستقبل تاریک سے تاریک نظر آنے لگا۔ باپ کا بجھا ہوا دل اس صدمے جانکاہ کی تاب نہ لاسکا۔ جگر خون سوکھنے لگا۔ رگوں کی آگ سرد پڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کی نیند، چہرے کی شادابی اور جسم کی توانائی زائل ہوگئی۔ اب باپ کی عالی شان مسند پر نہیں بلکہ علالت پر فریش تھا۔ علاج پر لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیے گئے۔ لیکن کھوئی ہوئی صحت واپس نہ آسکی۔ جسم کا روگ ہو تو علاج ہوسکتا ہے۔ لیکن بیمار دل کا کیا علاج ہو۔ سارے معالجوں نے جواب دے دیا۔

رات ڈھل چکی تھی۔ سارے شہر پر ایک خاموشی کا سناٹا طاری تھا۔ باپ کی حالت آج نہایت غیر تھی۔ منٹ منٹ پر غشی طاری ہورہی تھی۔ سارے خاندان کے لوگ سرہانے جمع تھے۔ امین بھی سرجھکائے ایک کنارے پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باپ کو ذرا سا افاقہ ہوا آنکھ کھول کر اس نے اشارے سے امین کو اپنے قریب بلایا اور آبدیدہ ہوکر بمشکل تمام یہ چند الفاظ کہے۔

بیٹا! اب میری زندگی کا چراغ بجھ رہا ہے۔ چند ہی لمحے بعد میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہوجاؤں گا۔ ہزار ارمانوں کے ساتھ خواجہ ہند کے دربار سے میں نے بھیک مانگی تھی۔ یہ حسرت قبر میں مجھے تڑپاتی رہے گی کہ ایک بار بھی تجھے اجمیر کی سرکار میں حاضر نہ کرسکا۔ زندگی مہلت دے تو خواجہ صاحب کی چوکھٹ پر سلام ضرور کرنا بیٹا! میری شرم عقیدت کا فرض ادا ہوجائے گا۔ تمہاری خراب زندگی کا غم لے کر اب میں ہمیشہ کے لیے تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔"

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہوئے ایک ہچکی آئی اور گیتی کا ایک غم نصب مسافر ابدی نیند سوگیا۔ سارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ رات بھر کہرام بپا رہا۔ بیوہ ماں کی دردانگیز آہ وزاری سے سننے والوں کے کلیجہ پھٹ گئے۔

امین کی حالت قابل رحم تھی، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اب اسے محسوس ہورہا تھا کہ باپ کو کھو کر اس نے کس قدر بھیانک جرم کیا ہے۔

صبح ہوتے ہوئے شہر کے معززین اور احباب واقارب جمع ہوگئے۔ عبدالرحمان جوہری کی وفات پر سارا شہر سوگوار تھا۔ تجہیز وتکفین کے بعد جنازہ جس وقت گھر سے نکالا گیا، اس وقت ایک قیامت برپا تھی۔ شدت کرب سے گھر کا ہر شخص بے حال تھا۔ بیوہ ماں تو منٹ منٹ پر بے ہوش ہورہی تھی۔ امین پاگلوں کی طرح پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شہر کے سب سے وسیع میدان میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ سارا مجمع قبرستان تک ساتھ رہا۔ لحد میں جنازہ اتارتے ہی امین چیخ پڑا۔

"مجھے بھی باپ کے ساتھ قبر میں لٹادو۔ اپنی زندگی سے بیزار ہوچکا ہوں"

لوگوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے الگ کیا اور ایک کنارے پر جاکر بیٹھا دیا۔ تدفین کے بعد قبرستان سے سب لوگ واپس لوٹ گئے۔ امین کو بھی گھر تک پکڑ کر لایا گیا۔ اعزہ واقارب نے گھر والوں کو تسلی دی، صبر کی تلقین کی، تیسرے دن خاندان کے بڑے بوڑھوں نے امین کو بٹھا کر سمجھایا۔

"بیٹا جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ خدا کی مشیت میں کس کا چارہ نہیں۔ اب کشتی کے ناخدا تم ہی ہو۔ اپنے باپ کی روح کو تسکین دینا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو بدل دو۔ غلط صحبتوں سے توبہ کرو اور ایک شریف بیٹے کی طرح اپنے باپ کا کاروبار سنبھالو۔ اب اپنی بیوہ ماں کے لیے اس دکھ بھری دنیا میں تسکین کا سہارا تمہیں ہو۔

امین سرجھکائے اپنے بزرگوں کی باتیں سن رہا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہورہی تھی۔

آج پہلی مرتبہ امین جوہری اپنے باپ کے تنہا اور کاروبار کے مالک کی حیثیت سے فرم کی سند پر بیٹھا تھا۔ اپنے سارے دوستوں اور ساتھیوں سے رشتہ

توڑ کر اس نے پوری توجہ کاروبار پر لگادی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی دنوں میں ماں کا اترا ہوا چہرا بھی کھل اٹھا۔ اپنی ذہانت، نیک روی اور شرافت و سنجیدگی کی وجہ سے امین سارے قبیلے کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

کاروبار کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا اور خاندان کا وقار اپنے آخری نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ خوشحالی کے یہی دن تھے۔ بہار کا یہی موسم تھا۔ بہار مسکراتی ہوئی شام وسحر تھی۔ یہی خورشید اقبال کی عین دوپہر تھی۔ کہ اچانک گردش ایام نے پلٹا کھایا۔ سورج گہنانے باد خزاں دبے پاؤں صحن چمن کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر شام وسحر کے چہرے تاریک ہو گئے۔ پھر خاندان کا وقار مجروح ہو گیا۔ پھر گھر کی پھیلی ہوئی رونقیں سمٹنے لگیں۔ قیامت آ گئی کہ پھر امین جوہری اپنے پرانے ساتھیوں کی محفل میں پہنچ گیا۔ پھر جوئے کی ریس شروع ہو گئی۔ پھر گھر کا سرمایا داؤں پر لگنے لگا بینک کا سارا سرمایہ جوئے کی بھینٹ پر چڑھ گیا ہوس کی آگ بجھانے کے لیے قرض کی طرف ہاتھ بڑھے۔ دل کھول کر ساہوکاروں نے سودی قرضے دیے اور کچھ دنوں کے بعد سننے میں آیا کہ دوکان اور جائیدادیں نیلام پر چڑھ گئیں۔ فرم کا نام ڈوب گیا چند ہی دنوں میں ہرا بھرا چمن فنا کے گھاٹ اتر گیا۔

اب لوگوں کی زبان پر امین جوہری مر چکا تھا۔ اور اس کی جگہ "امین جواڑی" نے لے لی تھی۔ لوگ امین جواڑی کے سائے سے بھاگنے لگے جس راستے سے گزرتا انگلیاں اٹھتیں سارا سرمایہ اور ساری جائیداد لٹا دینے کے بعد ظالم نے گھر کا سامان بھی بیچ ڈالا۔ اب نہ سماج میں کوئی عزت تھی کہ سہارا ملتا اور نہ گھر میں گزر بسر کا کوئی ذریعہ رہ گیا تھا۔ نوبت فاقے تک پہنچ گئی۔ گھر کی جمی ہوئی محفل اکھڑ گئی، سارے رشتہ دار ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اب گھر میں سوائے بوڑھی ماں کے اور کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ امین جواڑی دن بھر شہر کی خاک چھانتا۔ اسی لالچ میں کافی کافی دیر تک اپنے پرانے ساتھیوں کی محفل میں بیٹھا رہتا کہ داؤ جیتنے والوں سے دو چار پیسے مل جائیں اور پیٹ کی آگ بجھے۔ بوڑھی ماں محنت مزدوری کر کے بس شام کو کھانا پکاتی۔ دن کا وقت فاقہ میں گزرتا۔ قسمت کی برگشتگی اور وقت کی آشفتہ حالی پر روتے روتے ماں کی آنکھیں خشک ہو گئیں تھیں۔ امین اب وہ دردمند امین نہ تھا جو باپ کی جدائی کی تاب نہ لا سکا تھا۔ اب سیہ کار زندگی اور لعنت زدہ ماحول نے اس کے دل کی لطافتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اب دل کی جگہ اس کے سینے میں پتھر کا ایک ٹکڑا تھا جس کے اندر زندگی کا کوئی گزارا نہیں تھا۔ ماں کی ممتا بھی عجیب دیوانی ہوتی ہے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی امین اس کے کلیجے کی ٹھنڈک تھا۔ جب تک وہ اسے کھلا نہ لیتی خود نہ کھاتی۔ جب تک اسے دیکھ نہ لیتی رات کو سونا حرام تھا۔

رجب کا مہینہ آ رہا تھا۔ خواجہ کے عرس کا موسم آتے ہی ملک کے کونے کونے میں ہنگامہ عقیدت کا ایک شور برپا ہو گیا تھا۔ شوق ومحبت اور جوش جنوں کے ہزاروں کارواں اجمیر کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

امسال دار جلنگ سے بھی خواجہ کے دیوانوں کا ایک بہت بڑا قافلہ روانہ ہو رہا تھا۔ ہر محلے میں اجمیر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ خواجہ کے پر شوق تذکرے سے مسلمانوں کی آبادیاں گونج اٹھی تھیں۔

امین کی والدہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو تڑپ گئی۔ یکایک شوق کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ بہت دنوں کا سویا ہوا درد جاگ اٹھا۔ غریبی تنگدستی اور زندگی کی بربادیوں نے خواجہ کی یاد کو اور بھی رقت انگیز بنا دیا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے دل ہی میں خواجہ کو آواز دی۔

غریب نواز! ہم غریبوں کو بھی اپنی چوکھٹ پر بلا لیجیے مرنے والے کی روح کو تسکین مل جائے گی یہ کہتے کہتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اسی عالم میں امین بھی کہیں سے آ گیا۔ آج اسی کی حالت بھی دلی ہوئی تھی۔ ماں کو روتا ہوا دیکھ کر بیٹھ گیا۔

ماں! یہاں رو کر اپنے قیمتی آنسو ضائع مت کریں۔ چلو اجمیر چلیں، وہیں خواجہ ہند کی چوکھٹ پر جی کھول کر رو دیں گے۔ ہماری بربادیوں کا ماتم یہاں کون دیکھتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ کے دربار میں زندگی کے ٹوٹے ہوئے آبگینے ایک لمحہ میں جڑ جاتے ہیں چلو وہیں چلیں۔ مرحوم باپ کی وصیت بھی پوری ہو جائے گی اور خواجہ کو ہمارے حال زار پر ترس آ گیا تو عجب نہیں کہ ہمارے گئے ہوئے دن واپس لوٹ آئیں۔

تیار ہو جاؤ: قافلہ جا رہا ہے۔

آج بیٹے کا بدلہ ہوا رنگ دیکھ کر ماں کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں امید کے آنسو چھلکنے لگے پر شوق امنگوں کے عالم میں اٹھی اور گھر کے ٹوٹے پھوٹے برتن بیچ کر زاد سفر کے لیے دس روپے کا انتظام کیا۔ ماں بیٹا دونوں گھر سے نکل پڑے، اور قافلے میں شامل ہو گئے۔

جیسے جیسے اجمیر قریب آتا جا رہا تھا۔ امیدوں کی لگن اور شوق کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب اجمیر تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ قافلے والے اپنا سامان درست کرنے لگے۔ امین اور اس کی بوڑھی ماں کے پاس سامان ہی کیا تھا جسے وہ درست کرتے۔ البتہ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ دار جلنگ کے دو آشفتہ حال مسافروں کا یہی سب سے قیمتی سامان تھا۔ جسے وہ خواجہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے اپنے جگر کی جلتی ہوئی رگوں سے جمع کر رہے تھے۔

جلوۂ جاناں کی طرح پلک جھپکتے اجمیر سامنے آ گیا۔ خدام آستانہ زائرین کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہر طرف کھڑے ہیں۔ عاشقانِ خواجہ کا گروہ اپنے اپنے وکیل کے ہمراہ اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

جب گیٹ سے گزرنے لگے تو ایک خادم نے امین سے دریافت کیا۔ تمہارے وکیل کا کیا نام ہے؟

بوڑھی ماں نے آگے بڑھ کے جواب دیا "غریب نواز" خواجہ کا دیوانہ سمجھ کر خادم نے دوسری طرف رُخ کیا۔
یہاں سے ماں بیٹا دونوں درگاہ مقدس کی طرف پیدل چلنے والے قافلوں کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ بلند دروازہ جوں ہی نظر آیا عظمت خداوندی کی دھمک سے پلکیں جھک گئیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور جوش مسرت کی امید میں چوکھٹ پر جم گئیں۔
مسرتوں اور خوش بختیوں کے راجہ! سنا ہے کہ دنیا کے ٹھکرائے ہوئے کم نصیبوں کو یہاں پناہ ملتی ہے۔ کروڑوں خانہ خراب آپ کے دربار سے شاد آباد واپس لوٹتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی نظر نہ آنے والی چارہ گری کا ایک جلوہ دکھا دیجیے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والے خواجہ ہماری بھی قسمت کا ٹوٹا ہوا آبگینہ جوڑ دیجیے۔
سرکار: ایک بیوہ کی فریاد سن لو! ایک یتیم کو منجدھار سے نکال دو۔ تمہارا بخشا ہوا پھول مرجھا گیا ہے۔ اسے ہرا بھرا کر دو۔"
خدام آستانے سے ماں بیٹوں کا بلک بلک کر رونا دیکھا نہ گیا۔ انہیں اندر لے گئے اور مزار کی پائتی کھڑا کر کے سروں پر چادر ڈال دی۔ دامن رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آجانے کے بعد جگر کی آگ بجھ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا اور انجانے طور پر دل کو سکون مل گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلے تو روحانی فراغت اور زندگی کا سرور چہرے سے آشکار تھا۔
بھوک نے ستایا تو لنگر خانے کی قطار میں کھڑے ہوگئے۔ بھیک لی، آسودہ ہوئے اور پھر چوکھٹ پر آکر جم گئے۔ جب تک اجمیر میں رہے ماں بیٹے کا یہی معمول رہا۔
آج رجب کی 9 تاریخ تھی۔ میلہ ٹوٹ رہا تھا۔ قافلہ روانہ ہو رہے تھے۔ عشاق کے لیے رخصت کی گھڑی قیامت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ عقیدت مندوں کی گریہ وزاری سے ایک شور برپا تھا۔ ماں بیٹا بھی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دربار خواجہ سے رخصت ہوئے۔
بلند دروازے سے باہر نکل کر بیٹے نے ماں سے کہا "خالی ہاتھ آئے تھے خالی ہاتھ واپس ہو رہے ہیں۔ سنا تھا کہ یہاں ایک لمحہ میں تقدیر کی کایا پلٹ جاتی ہے "ماں نے جواب دیا
بیٹا" جو کچھ تم نے سنا تھا غلط نہیں ہے۔ یہاں قسمت کی گرہ کھل جاتی ہے پر ہاتھ نظر نہیں آتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دامن بھر جاتا ہے لیکن دامن والے کو خبر نہیں ہو پاتی بیٹا! عارفوں اور اہل نظر کی یہ دنیا دیوانی نہیں ہے۔ جو ہر سال بھکاریوں کی قطار میں یہاں آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔
ماں بیٹے کو سمجھا رہی تھی اور بیٹا اس خیال میں سرگرداں تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "امین جواڑی" پلٹ کر دیکھا تو ایک فقیر سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔
امین نے ایک سائل سمجھ کر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گیا۔ فقیر نے پھر آواز دی۔ اس دفعہ آواز کے لہجے سے بے نیازی کا شکوہ ٹپک رہا تھا۔
ماں چلتے چلتے رک گئی۔ امین بھی ٹھہر گیا۔ دونوں واپس لوٹے اور فقیر کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ فقیر نے تیور بدل کر کہا۔" لا تیرے پاس جو کچھ ہے خواجہ کے نام پر رکھ دے" امین کو کچھ پس وپیش ہوا۔ لیکن ماں نے بغیر کسی تامل کے پانچ روپے نکال کر رکھ دیے۔ عقیدتیں تیز ہوگئیں۔ دوزانو بیٹھ کو بوڑھی ماں نے پلکوں سے چوکھٹ کا بوسہ لیا ایک رقت انگیز بے خودی کے عالم میں امین کو آواز دی۔
بیٹا! یہی وہ چوکھٹ ہے جہاں کھڑے ہو کر تیرے باپ مرحوم نے بھیک کے طور پر تجھے حاصل کیا تھا۔ خواجہ صاحب کی چوکھٹ کے ساتھ تیری ہستی کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ ماں کی بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ امین نے گھٹنا ٹیک دیا۔ اور نہایت ادب کے ساتھ چوکھٹ کا بوسہ لیا۔
اس کے بعد مختلف دروازوں سے گزرتے ہوئے ماں بیٹے احاطہ نور میں داخل ہوئے۔
اب خواجہ کونین کا وہ حسین روضہ نظر کے سامنے تھا، جس کی زیبائی پر سارا ہندوستان شیفتہ ہے۔
ہر طرف چھما چھم نور کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر آنکھ پرنم تھی۔ ہر دل پیکر فریاد تھا۔ ہر شخص شراب عرفاں کے کیف میں سرشار نظر آرہا تھا۔
شاہانہ کروفر اور شوکت جمال دیکھ کر دونوں حیرانی کے عالم میں گم تھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس عالم میں پہنچ گئے ہیں۔ چوکھٹ کے سامنے کھڑے ہوئے ماں کی حالت غیر ہوگئی۔ آنکھوں کا چشمہ سیال پھوٹ پڑا۔ آلام کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ اس طرح ٹوٹ کے اس نے فریاد کی کہ اس کی آہ وزاری سے لوگوں کے دل دہل گئے۔
یتیموں، بیواؤں اور بے سہاروں کے والی! گردش ایام کے ستائے ہوئے فریادی ایک نگاہ کرم کے طلب گار ہیں۔ یہی اس غریب و مسکین قافلے کی کل کائنات تھی۔ فقیر نے اپنی جھولی سے کوئی چیز نکالی کر ماں کے آنچل میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"اسے چھپا کر رکھ لے "خواجہ کی برکت سے تیری خوشحالی کے دن واپس لوٹ آئیں گے۔ سیدھے گھر چل جا۔
پر امید امنگوں کے عالم میں فقیر کے پاس سے ماں بیٹے اٹھے اور تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے۔ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔
اسٹیشن پر پہنچ کر امین نے نہایت بے چینی کے ساتھ دریافت کیا۔ ذرا دیکھیں ماں! فقیر نے کیا دیا ہے؟ دیکھا تو آنچل میں ایک گول چکنا پتھر پڑا ہوا تھا۔ امین کی ساری امیدوں پر اوس پڑگئی۔ جھنجلا کر ماں سے کہا۔ وہ پانچ روپے بھی پانی میں گئے۔ اب راستہ کاٹنا بھی مشکل ہے افسوس! بڑی امید لے کر

آئے تھے کہ نہایت شکستہ خاطر ہو کر یہاں سے لوٹ رہے ہیں۔ دار جلنگ میں تو ایک ہی وقت کا فاقہ تھا اب تو راستے بھر فاقہ کرنا ہوگا۔ کیا خبر تھی کہ فقیر کا لبادہ اوڑھ کر یہاں راہزن بھی راستوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔

جھنجلاہٹ میں ماں کے ہاتھ سے یہ پتھر لے کر پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ ماں نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے ساتھ رکھنے سے تیرا کیا بگڑتا ہے۔ سونے کی ڈلی نہ سہی، خواجہ کے شہر کی یادگار تو ہے۔ گھر پڑی رہے گی"۔

خدا خدا کر کے کسی طرح یہ قافلہ دار جلنگ پہنچ گیا۔ اس بار بھی راستے میں کہیں روک ٹوک نہیں ہوئی۔ کئی دن کے قافلے سے ماں بیٹے نڈھال تھے۔ گھر پہنچتے ہی محلے پڑوس کے لوگوں نے کھانے کا انتظام کیا۔

دوسرے دن اپنی اپنی عادت کے مطابق صبح سویرے ہی اپنے ساتھیوں کی طرف نکل گیا۔ ساری محفلیں ویران ہو گئیں تھیں جوئے کے تمام مرکزوں پر خاک اڑ رہی تھی۔ امین کو اس نئی صورت حال سے حیرت ہوئی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محکمہ انسداد جرائم کے ایک ہوشیار دستے نے سارے مراکز پر چھاپہ مار کر سب کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ اپنے حق میں بھی اس نے خطرہ محسوس کیا اور فوراً گھر واپس لوٹ آیا۔ آج خلاف معمول دن کے وقت بیٹے کو دیکھ کر ماں کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے دل نے اعتراف کر لیا کہ خواجہ غریب نواز کی پہلی برکت ہے۔

دن کے وقت امین اپنے ساتھیوں میں پہنچ کر کچھ کھا پی لیتا کرتا تھا۔ اب وہ سہارا بھی اجڑ چکا تھا۔ آج سارا دن فاقے سے گزر گیا۔ جھنجلاہٹ میں بات بات پر ماں سے لڑ پڑتا تھا۔ وہ پانچ روپے اس کے ذہن سے نہیں اتر رہے تھے۔ غصے میں بھرا بیٹھا تھا کہ اس کی نظر اس چکنے پتھر پر پڑ گئی۔ جو فقیر کے پاس ماں لے کر آئی تھی۔ عالم غیظ میں اٹھا اور پتھر کو اپنے گھر کی دیوار پر دے مارا۔ پتھر ٹوٹ گیا لیکن زندگی کا ٹوٹا آبگینہ جڑ گیا۔ دیکھا تو بیش قیمت جواہرات کے ہزاروں ٹکڑے صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ امین خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

خواجہ صاحب کی ایک نگاہ کرم سے پھر خوشی کے دن پلٹ آئے "امین جواڑی " پھر امین جوہری ہو گیا۔ اب امین جوہری کسی مقامی فرم کا نہیں بلکہ جواہرات کی بین الاقوامی ایجنسیوں کا مالک تھا۔ خواجہ تیرے ڈھنگ نرالے۔

لحد کی منزل

فیروز مندیوں کی کوئی متعین گھڑی نہیں ہوتی رحمتوں کا دروازہ یک بیک کھلتا ہے اور دل کے ظلمت خانے میں سعادت کا چراغ اچانک روشن ہوتا ہے۔
یہی ماجرا اس یہودی نوجوان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ دیکھنے کے لیے اس نے رسول مجتبیٰ ﷺ کا چہرہ زیبا سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ آنکھیں کھلیں اور بند ہو گئیں نظر پڑی اور بکھر گئی۔ لیکن آج جانے کون سی گھڑی تھی کہ نظر پڑتے ہی دل میں متزلزل ہو گئی بجلی چمکی خرمن جلا اور سارا وجود خاکسترت ہو گیا۔ اب دل اپنے قابو میں نہیں تھا۔ قیامت کی بات یہ ہوئی کہ گھر کی چہار دیواری میں جس رسول عربی ﷺ کا نام لینا گیتی کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اب اس کی محبت کا آشیانہ گھر کے باہر نہیں دل کے نہاں خانے میں بن چکا تھا۔ عشق اور وہ بھی رسول مجتبیٰ کا عشق۔ جس کی خوشبو سے دونوں عالم مہک اٹھتے ہیں، اس کا چھپانا آسان نہیں تھا۔ امید وبیم کی کش مکش میں جان کے لالے پڑ گئے۔ دل کا تقاضا یہ تھا کہ اس محفل نور میں چلیے دیدہ بیتاب کا اصرار یہ تھا کہ چلو جلوۂ شاداب کی ٹھنڈک حاصل کریں۔ ادھر گھر والوں کا خوف "سماج کا خطرہ" کسی نے ان کی محفل میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو آلام کا محشر برپا ہو جائیگا، آہنی دیواروں کے حصار میں دل مبتلا محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ قدم اٹھانے کی کہیں کوئی صاف جگہ نہیں مل رہی تھی۔ آ کر دل نہیں مانا تو غلبۂ شوق میں اٹھے اور مسجد نبوی کے دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھ آئے کبھی دوسری طرف رخ کر کے کسی گزرگاہ پر بیٹھ گئے اور دور ہی سے جلوۂ خدانما کا نظارہ کر لیا۔
اسی طرح دن گزرتے گئے اور دل کے قریب عشق کی چنگاری سلگتی رہی محبت کی تپش سے آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ چہرے کا رنگ اتر گیا جی کھول کر رہ بھی نہیں سکتے تھے کہ دل کی بھڑاس نکلتی اور غم کا بوجھ ہلکا ہوتا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ حالات کے جبر اور جاں گسل ضبط نے بیمار ڈال دیا۔ باپ نے ہر چند علاج کرایا۔ وقت کے بڑے بڑے طبیب آئے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، جسم وتن کی بیماری ہو تو دوا کام بھی کرے عشق کے آزار کا کیا علاج ہے کسی مسیحائے محبت کے مریض کو شفا بخشی ہے جو شفایاب ہوتا؟
ہزار جتن کے باوجود حالت دن بدن گرتی گئی۔ پھول کی طرح شگفتہ نوجوان سوکھ کے کانٹا ہو گیا،، ماں تا کی ماری ہوئی ماں پائیں پکڑ کر روتی رہتی باپ پاگلوں کی طرح سر پٹکتا، خاندان کے افراد کف افسوس ملتے لیکن بیمار کا حال کوئی نہیں سمجھ پاتا اب بیمار عشق حیات کی آخری منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا ناتوانی اور ضعف کی شدت سے آواز مدھم پڑ گئی زبان کی گویائی جواب دینے لگی، کبھی کبھی ٹھنڈی آہوں کا دھواں فضا میں بکھر جاتا اور بس۔
آج ایک عاشق مہجور کی زندگی کی آخری شام تھی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ جسم کے انگ انگ سے موت کے آثار ابھرنے لگے، ہچکیاں لیتے ہوئے اس بھری نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا فرط محبت سے باپ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ منہ کے قریب کان لگا کر کہا۔
"میرے لال! کچھ کہنا چاہتے ہو۔"
زبان کھلتے ہی آواز حلق میں پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے اتنے الفاظ نکل سکے۔
"آپ وعدہ کریں کہ میری زندگی کی آخری خواہش پوری کر دیں گے تو میں کچھ کہوں۔"
باپ نے دردناک اضطراب کے ساتھ جواب دیا میرے جگر کی ٹھنڈک! یہ گھڑی بھی وعدہ لینے کی ہے تمہاری خواہش پر اپنی جان کی قیمتی سرمایہ بھی لٹانے کے لیے تیار ہوں۔ تم بے خطرہ اپنی خواہش کا اظہار کرو۔
وعدہ کرتا ہوں کہ بے دریغ اسے پوری کروں گا۔
بیٹے نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔
"بابا جان! برا نہ مانیں۔ چند برسوں سے میں محمد عربی ﷺ کی عقیدت ومحبت کے اضطراب میں سلگ رہا ہوں۔ آپ کے خوف سے زندگی کا یہ مخفی راز ہم نے کبھی فاش نہیں ہونے دیا ان کی موہنی صورت، ان کا پرنور چہرہ اور ان کی دل آویز شخصیت نگاہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اوجھل نہیں ہوتی، انھی کی یاد میں سوتا ہوں، انھی کے خیال میں جاگتا ہوں۔ جب سے بستر علالت پر پڑا ہوں جلوہ اقدس کی ایک جھلک کے لیے ترس گیا ہوں، اب جب کہ میری زندگی کا چراغ گل ہو رہا ہے۔ دل کی آخری تمنا ہے کہ ایک بار ان کے روئے تاباں کی زیارت کر لوں اور دم نکل جائے۔
زحمت نہ ہو تو انہیں خبر کر دیجیے کا کل درخ کا ایک غلام دنیا سے رخصت ہو رہا ہے بالیں پر کھڑے ہو کر اسے اخروی نجات کا مژدہ سنا دیں۔
بیٹے کی آرزوئے شوق معلوم کر کے غصے سے باپ کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ اکلوتا بیٹا زندگی کی آخری سانس، اب کس طرح کی فہمائش کا بھی موقعہ نہیں تھا چار و نا چار بیٹے کا ناز اٹھانے کے لیے دل کو راضی کرنا پڑا۔
لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے لخت جگر اگر چہ میرے لیے یہ بات سخت ناگواری کی ہے لیکن یہ خیال کر کے کہ تم دنیا سے حسرت زدہ ہو کر نہ جاؤ میں تمہاری خواہش کی تکمیل کے لیے جا رہا ہوں کل صبح سے مجھے اسرائیلی سماج کا مجرم کہا جائے گا۔ لیکن تمہاری بے چین روح کی آسودگی کے لیے یہ ننگ بھی

گوارا ہے۔

باد ل ناخواستہ اٹھا اور کاشانۂ نبوت کی طرف چل پڑا قدم اٹھ نہیں رہے تھے اٹھائے جا رہے تھے۔ مسجد اقدس کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی "میں محمد عربی سے ملنا چاہتا ہوں، کوئی انہیں خبر کر دو"

چند ہی لمحوں کے بعد سرکار رسالت ﷺ سامنے جلوہ گر تھے ارشاد فرمایا "تمہیں کیا کہنا ہے۔ دل کا کشور فتح کر لینے والی یہ آواز سن کر یہودی کے ذہن وخیال کی بنیاد ہل گئی۔

بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میرا اکلوتا بیٹا عین شباب کی منزل میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہے تمہارے جمال کی زیبائش وکشش پر سارا عرب دیوانہ ہے اس نے ہمارے یہودی نژاد بچے کو بھی ایک عرصے سے گھائل کر رکھا ہے اب وہ بستر مرگ پر تڑپ رہا ہے اس کی آخری تمنا ہے کہ تم کی بالیں پر کھڑے ہو کر اپنی خوشنودی اور اخروی نجات کا مژدہ سنا دو۔

یہ سنتے ہی سرکار رسالت مآب ﷺ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا چلو اس فیروز بخت نوجوان کو دیکھ آئیں جس کے خیر مقدم کے لیے آسمانوں میں ہنگامہ شوق برپا ہے۔

انتظار کرتے کرتے بیمار محبت کی آنکھیں بند ہو گئیں تھیں باپ نے سرہانے کھڑے ہو کر آواز دی۔

نور عین؟ آنکھیں کھولو! تمہارے مرکز عقیدت آ گئے یہ دیکھو! سر بالیں محمد عربی ﷺ کھڑے ہیں۔

اس آواز پر جاتی ہوئی روح پلٹ آئی بیمار نے آنکھیں کھول دیں نظر کے سامنے عرش کی قندیل کا نور چمک رہا تھا نحیف وکمزور آواز میں اظہار تمنا کیا۔

"سرکار! دل میں عشق وایمان کی مقدس امانت لیے ہوئے اب عالم جاوید کی طرف جا رہا ہوں کاکل ورخ کے غلاموں میں میرا بھی نام درج کر لیا جائے خدائے لاشریک کا ایک سجدہ بھی نامہ زندگی میں نہیں ہے اس تہہ دستی کے باوجود کیا میں اپنی نجات کی امید رکھوں؟

سرکار دو عالم ﷺ نے تسلی آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا "زبان سے کلمہ توحید کا اقرار کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ تمہاری نجات کا ضامن میں ہوں۔"

نوجوان کا باپ یہ جواب سن کر پھوٹ پڑا جذبات میں بے قابو ہو کر بیٹے کو تلقین کی۔

فرزند سعید! ہزار دشمنی کے باوجود دل کا یہ اعتراف اب نہیں چھپا سکتا کہ ایک سچے پیغمبر کی زبان حق ترجمان سے یہ جملہ صادر ہوا ہے۔ فرش گیتی پر کسی بندے کو اس سے زیادہ کوئی ارجمند گھڑی نہیں میسر آ سکتی کہ مالک کبریا کا حبیب اس کی نجات کے لیے اپنی ضمانت پیش کر رہا ہے تم صاف وصریح لفظوں میں وعدہ لے کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔"

نوجوان نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

سرکار! قبر کی منزل سے لے کر دخول جنت تک آپ کی ضمانت پر اسلام قبول کرتا ہوں اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ ۔ کی مدہم آواز فضا میں گونجی اور کشور محبت کے ایک فیروز بخت نوجوان نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ماتم واندوہ سے سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

نوجوان کے باپ نے ڈبڈباتے ہوئے کہا۔

حضور اب یہ جنازہ میرا نہیں ہے اسلام کی مقدس امانت ہے۔ اب یہ میرے گھر کی بجائے آپ کے در رحمت سے اٹھے گا۔ تجہیز وتکفین کی ساری ذمہ داری آپ ہی کے سپرد ہے۔

باپ کی درخواست قبول فرما لی گئی۔ صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

عشق وایمان کا یہ گنج گرانمایہ اپنے دوش پر اٹھا لو۔ عروس نوبہار کی طرح یہ جنازہ مدینے کی گلیوں سے گزرے گا۔

مرگ عاشق کی سارے مدینے میں دھوم مچ گئی۔ جنازے میں شرکت کے لیے آس پاس آبادیاں سمٹ آئیں آخری دیدار کے لیے چہرے سے جونہی کفن اٹھایا گیا آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی عارض تاباں سے نور کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ ہونٹوں پر تبسم رقصاں تھا۔ جانے والا خالی ہاتھ نہیں تھا کونین کی خلعتیں کفن کے پردوں میں چھپائے ہوئے تھا۔

عاشق کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے اٹھا کثرت اژدہام سے مدینے کی گلیوں میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ پتھروں کے سینے پر کف پا کا نقش بٹھانے والے سرکار آج جنازہ کے ہمرہ پنجوں کے بل چل رہے تھے اس ادائے رحمت کی کہنہ معلوم کرنے کے لیے لوگ تصویر شوق بنے ہوئے تھے نہیں رہا گیا تو آخر ایک صحابی نے پوچھ ہی لیا۔

ارشاد فرمایا۔ آج عالم بالا سے رحمت کے فرشتے اتنی کثرت سے جنازے میں شریک ہیں کہ ان کے ہجوم میں بھرپور قدم رکھنے کی کوئی جگہ نہیں مل رہی ہے۔

جنت البقیع میں پہنچ کر جنازہ فرش خاک پر رکھ دیا گیا لحد میں اتارنے کے لیے سرکار خود اندر تشریف لے گئے۔ داخل ہونے سے پہلے ہی عاشق کی قبر رحمت و نور سے جگمگا اٹھی اپنے دست کرم کا سہارا دے کر سرکار رسالت نے جنازہ لحد میں اتارا۔ کافی دیر کے بعد لحد سے جب باہر تشریف لائے تو پسینے میں شرابور تھے چہرے پر خوشی کا انبساط لہرا رہا تھا۔

تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد حلقہ بگوشوں نے دریافت کیا۔

حضور! چہرہ زیبا پر پسینے کے قطرے کیوں چمک رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ سرکار کو کسی بات کی مشقت اٹھانی پڑی ہے۔

حضور نے مسکراتے ہوئے جواب مرحمت فرمایا۔

اس عاشق جواں سال نے دم واپسیں مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ لحد کی منزل سے لے کر دخول جنت تک میری رحمتوں کی ضمانت اسے حاصل رہے گی۔ میرے اشارہ ابرو کی شہ پا کر حوران خلد کا بہت بڑا اژدہام اس کی لحد کے قریب پہلے ہی جمع ہو گیا تھا۔ جوں ہی اسے لحد میں اتارا گیا چہرے کی بلائیں لینے کیلیے وہ ہر طرف سے بے تحاشا ٹوٹ پڑیں ہجوم شوق کا امنڈتا ہوا سیلاب میرے ہی قدموں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ اسی عالم وارفتہ حال میں مجھے تھوڑی سی مشقت اٹھانی پڑی اور میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور ایسا ہونا بھی رحمت کا تقاضا تھا۔ کہ پسینے کے چند قطرے کفن کی چادر پہ ٹپک گئے اب اس کی خواب گاہ صبح محشر تک مہکتی رہے گی۔"

بندہ نوازی کی یہ روداد جاں افروز معلوم کر کے صحابہ کرام کی روحیں اپنے اپنے قلب میں جھوم اٹھیں۔ عشق مصطفی کی سرفرازی نے ایک ایسے نوجوان کو اخروی اعزاز کے منصب پر پہنچا دیا تھا جس کے نامہ حیات میں ایک سجدہ بندگی کا بھی اندراج نہیں تھا۔

سچ کہا ہے کہنے والوں نے کہ "جسے پیا چاہے وہی سہاگن"

نور کا ساگر

عرب کی دھوپ، تپتا ہوا ریگستان اور دوپہر کا وقت ۔ ساری قیامتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں ۔ قافلے والے پیاس کی شدت سے جاں بلب تھے۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ چند گھڑی کے مہمان ہیں۔ اسی عالم یاس میں انہیں بہت دور ایک پہاڑ کے دامن سے گزرتے ہوئے چند ناقہ سوار نظر آئے ۔
سردار قافلہ نے کہا "اونٹوں کی رفتار بتا رہی ہے کہ یہ حجاز کے نخلستان سے آ رہے ہیں۔ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ لوگ ہماری بجھی ہوئی زندگی کی امید گاہ بن کر طلوع ہوئے ہیں۔ اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ کر انہیں آواز دو۔ شاید ہماری چارہ گری انہی کے ہاتھ پر مقدر ہو گئی ہو۔"
اپنے سردار کے حکم کے مطابق قافلے کے تمام چھوٹے بڑے افراد نے ایک ساتھ انہیں بلند آواز سے پکارا۔
خوشا نصیب کہ سلطان حجاز کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچ گئی۔
سردار دوست مدار نے اپنے صحابہ ارشاد فرمایا۔ "یہ عربی قبائل کا کوئی مصیبت زدہ کارواں معلوم ہوتا ہے۔ چلو اس کی اعانت کریں۔
باد صبا کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے قریب پہنچے ۔ پیاس کی شدت سے وہ بے حال ہو رہے تھے۔ ناقہ سواروں میں چمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ چیخ اٹھے۔
"اے رحمت و نور والے! ہم پیاس کی شدت سے جاں بلب ہیں۔ تمہارے چھاگل میں پانی کے چند قطرے ہوں تو ہماری حلق تر کر دو۔"
سرکار نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔
"اس پہاڑ کی دوسری جانب ایک حبشی نژاد غلام اپنی ناقہ پر پانی کا ایک مشک لیے جا رہا ہے اس سے جا کر کہو چل تجھے پیغمبر آخر الزمان بلا رہے ہیں۔
فوراً قافلے سے ایک شخص دوڑتا ہوا پہاڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر اسے ایک حبشی نژاد ناقہ سوار نظر آیا۔ اس نے اسے آواز دے کر روکا اور سرکار نامدار ﷺ کا پیغام پہنچایا۔
سرکار کا نام نامی سنتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور اپنی سواری سے اتر آیا۔ اب اپنے ہاتھ سے اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے وہ پاپیادہ اس کے پیچھے چل پڑا۔
جیسے ہی اس کی نظر سرکار کے چہرۂ انور پر پڑی اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ ایک ہی جلوے میں وہ کاکل و رخ کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔
حضور انور نے اسے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ تیرا پانی کم نہیں ہوگا۔ ان پیاسوں پر اپنی مشک کا منہ کھول دے۔ خدا تجھے روشن کرے۔"
اب وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ سرکار کے حکم کی تعمیل کے لیے بے ساختہ اس کے ہاتھ اٹھے اور اس نے مشک کا منہ کھول دیا۔ آبشار کی طرح پانی کا دھارا گر رہا تھا اور قافلہ والے سیراب ہو رہے تھے جب سارے اہل قافلہ سیراب ہو چکے تو سرکار نے حکم دیا اب مشک کا منہ بند کر لے۔
مشک کا منہ بند کرتے ہوئے اسے سخت حیرت تھی کہ کئی مشک بہہ جانے کے بعد بھی اس کے مشک کا ایک بوند پانی کم نہیں ہوا تھا۔
شیفتہ جمال تو پہلی نظر میں ہو چکا تھا۔ اب یہ کھلا ہوا معجزہ دیکھ کر وہ اپنے جذبہ شوق کو دبا نہیں سکا۔ بیخودی کے عالم میں چیخ اٹھا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔
سرکار نے دعائیں دیتے ہوئے اس کے چہرے پر رحمت و کرم کا ہاتھ پھیرا اور اسے رخصت کر دیا۔
حبشی غلام کا آقا پانی کے مشک کا بہت دیر سے منتظر تھا۔ جوں ہی دور سے اپنی آتی ہوئی اونٹنی پر نظر پڑی خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ لیکن جوں جوں اونٹنی قریب ہوتی جا رہی تھی اس کا استعجاب بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اونٹنی اس کی ہے مشک بھی اسی کا ہے۔ لیکن سوار اجنبی ہے۔ آخر اس کا اپنا غلام کہاں گیا۔
جب اونٹنی بالکل قریب آ گئی تو آقا دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس اجنبی شخص سے دریافت کیا تو کون ہے؟ میرا وہ حبشی غلام کہاں گیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے اسے قتل کر کے میری اونٹنی پر قبضہ کر لیا ہے۔
سوار نے اظہار حیرت کرتے ہوئے جواب دیا۔
ہائے افسوس! آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اپنے قدیم غلام کو بھی آپ نہیں پہچانتے آپ کا غلام تو میں ہی ہوں۔ اور آپ کا غلام کون ہے؟
مجھے فریب دیتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ میرا غلام حبشی نژاد تھا۔ اس کے چہرے پر یہ سفید نور کہاں تھا؟
اب جو آئینے میں اس نے چہرہ دیکھا تو عالم بیخودی میں رقص کرنے لگا۔ جذبات کی والہانہ وارفتگی میں سرشار ہو کر اس نے اپنے آقا سے کہا۔
یقین کرو میں ہی تمہارا وہ غلام ہوں۔ اعتبار نہ ہو تو مجھ سے اپنے گھر کے سارے حالات پوچھ لو۔ رہ گئی میرے چہرے کی چاندنی! تو یہ برکت ہے نخلستان عرب کے اس پیغمبر کی جس کے چہرۂ زیبا کا عکس دل ہی کو نہیں چہرے کو بھی روشن کر دیتا ہے۔
آج نور کے اس ساگر نے نہا کر آ رہا ہوں۔ پہاڑ کی وادی میں ان کی زیارت سے شاد کام ہو۔ دم رخصت انہوں نے اپنے نورانی ہاتھ میرے چہرے پر

مس کردیے تھے۔اس کی برکت ہے کہ میرے چہرے کی سیاہی چمکتی ہوئی سفیدی میں بدل گئی۔آقا نے یہ کیفیت معلوم کر کے غلام کی پیشانی چوم لی اور وہ بھی دولت ایمان سے مالا مال ہو گیا۔

قندیل عرش کا نور

"اف یہ کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی رات ۔ ہر طرف خوفناک سیاہی اور ہولناک سناٹا! مگر اس وحشت ناک ویرانے میں انسانوں کی یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔"

ایک مسافر نے آگے بڑھ کر پکارا۔

اے آدم کے فرزند! تم آبادیاں چھوڑ کر یہاں کہاں آ گئے!

کسی نے جواب دیا "خود نہیں آئے ، قسمت برگشتہ لے آئی!

مگر اس گھنی تاریکی میں تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی، تمہارے بچوں کو درندے اٹھا لے جائیں گے۔ کیا تمہیں اپنی سلامتی کی بھی فکر نہیں؟ مسافر نے کہا۔

ٹھوکر تو لگ ہی چکی ہے، کیا دوبارہ ٹھوکر لگے گی؟ ٹھوکر نہ لگی ہوتی تو ہمارا قافلہ یہاں سر کیوں ٹکراتا؟ سلامتی کی فکر ، مت پوچھو! بڑی المناک کہانی ہے یہ " سردار قافلہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا " کیا کہا تم نے؟ ذرا کھل کر کہو۔ تمہاری باتوں سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری گھائل زندگی کا کوئی بہت گہرا راز ہے، جسے تم چھپا رہے ہو، مسافر نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ایسا ہی کچھ سمجھ لو! لیکن تم ہماری نامرادیوں کی غمگین داستان سن کر کیا کرو گے اس وادی میں سینکڑوں برس گزر گئے ، ہمیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔ تم جیسے بہت سے دردمند مسافر ادھر سے گزرے اور کچھ دیر کے لیے ہمارے پاس ٹھہر گئے۔ تمہاری ہی طرح انہوں نے بھی ہمیں اس زندان بلا سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہم نے اپنی مصیبتوں کا دردناک آزاران سے بیان کیا تو وہ یہ کہہ چلے گئے کہ تمہارے زخم کا علاج انسانوں کے پاس نہیں ہے۔ انتظار کرو، شاید آسمان سے تمہارے لیے کوئی مرہم شفا اترے۔

اس لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ضد نہ کرو۔ ہماری تھکا دینے والی حسرت انگیز کہانی سن کر تم بھی وہی کرو گے جو تمہارے پیشرو کر چکے ہیں۔۔

تم ایک مسافر ہو، جاؤ اپنا راستہ پکڑو۔ تمہاری ہمدردیوں کا بہت بہت شکریہ " سردار قافلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اب تو اور بھی تمہاری باتوں نے مجھے سراپا شوق بنا دیا ۔ اب میں تمہاری غم سنے بغیر سے ٹل نہیں سکتا یقین کرو! میں ان راہ گیروں میں سے نہیں ہوں جو تمہاری پرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستیں رکھ کر چلے گئے۔ میں نے خود بھی درد والم کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ اس لیے تمہارے دل کی دھڑکنوں کا راز مجھ پر چھپ نہیں سکتا اب تمہیں اپنا قصہ غم سنانا ہی ہوگا۔" مسافر نے پیار بھرے انداز میں جواب دیا۔

"فطرت انسانی میں کتنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی نقشہ تھا ان راہ گیروں کا بھی جو تمہارے لفظوں میں ہماری پرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستیں رکھ کر چلے گئے۔ وہ بھی ہمارا افسانہ ابتلا سننے کے لیے اسی طرح بے تاب تھے جس طرح تم ہو۔ اظہار شوق کے مرحلے میں تم اور وہ بالکل یکساں نظر آتے ہو۔ اس کے بعد کی منزل میں تم ان سے مختلف ہو جاؤ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

بہر حال تم ہماری کہانی سننے پر بضد ہو تو سنو! لیکن اس امید میں نہیں کہ ہماری مشکلات کی گرہ کھول دو گے بلکہ صرف اس لیے کہ ہمارے قافلہ سے تم دل شکستہ ہو کے نہ جاؤ" اتنی گفتگو کے بعد سردار قافلہ نے ایک لمبی سانس لی اور داستان سنانا شروع کیا۔

"دیکھو! بہت دنوں کی بات ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ اس وقت کی جب روئے زمیں پر انسانوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اس وقت کائنات کے خدا نے آسمان پر ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا۔

ایک عرصہ ناپیدا کنار تھا، جس میں ایک طرف بلند قامت پہاڑوں کے لنگر کھڑے تھے دوسری طرف زمین کا گول کرہ رکھا تھا اور ٹھیک پائے گاہ شاہی کے سامنے انسانی روحوں کی بھیڑ جمع تھی۔ جب ساری خلقت آ موجود ہوئی تو خدائے لاشریک نے اپنے سراپردہ جلال و جبروت سے ایک چمکتا ہوا ہیرا نکالا۔ اس کی تابش جمال کا کیا حال بیان کرؤں کہ کسی میں نظر ملانے کی تاب نہ تھی۔ بس نگاہوں پر ایک ترشعاع کی چوٹ پڑی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

خدائے فلک نے تمام حاضرین دربار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "دیکھو! یہ میرے گنجینہ قدرت کی ایک نہایت قیمتی امانت ہے جو اس کی حفاظت کا حق ادا کر سکتا ہے آگے بڑھے یہ ہیرا میں اس کے حوالہ کر دوں گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایک لمبی مدت کے بعد پھر ایک دربار عام منعقد کروں گا۔ اس دن یہ امانت بالکل اسی حالت میں واپس کرنا ہوگی اور یہ بھی سن لو کہ ادائے حق میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو جہاں میری بارگاہ عدل میں محنت وفا کا شاندار حوصلہ ہے ۔ وہاں سرکشی کی عبرتناک سزا بھی ہے۔

خدائے برتر کا یہ اعلان سن کر ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں عام طور پر خیال تھا کہ آسمان کا چوڑا چکلا سینہ یہ بار امانت ضرور قبول کر لے گا۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب آسمان پر یہ امانت پیش کی گئی تو دہشت سے اسے زلزلہ آ گیا۔ ہیرے کے لیے پتھر کا جگر مشہور ہے۔ آسمان نے انکار کے بعد اب

خطاب شاہی پہاڑوں کی طرف متوجہ ہوا۔

کرہ خاک کے پہرہ دارو! کہو تو تمہارا سینہ چاک کرکے یہ امانت رکھ دوں؟

یہ سننا تھا کہ پہاڑوں کی مغرور پیشانی پر پسینے آگئے گھٹنے ٹیک کر عرض کیا "ہماری چوٹیوں کو رفعت کا تاب بخشنے والے مالک! تیری امانت کا جلال ہم سے نہیں اٹھ سکتا۔ ہمارا سینہ پھٹ جائے گا، ہماری کمر ٹوٹ جائے گی۔"

اب زمین کی باری تھی۔ فرمان سلطانی اس سے یوں مخاطب ہوا:

"اے آغوش فطرت! تیری دامن پر شاخ گل سے کوئی ننھا سا دانہ بھی گر جاتا ہے تو تو اسے ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تیری ہی دیانت و وفا پر نباتات کی انجمن آباد ہے۔ میرے خزانہ کرم کا یہ ہیرا تو ہی اپنے دل میں رکھ لے نا؟"

یہ سن کر زمین نے اپنے خاک آلودہ چہرہ ایوان شاہی کی دہلیز پر رکھ دیا اور لرزتے ہوئے کہا: "اے جبروت والے بادشاہ! تو خوب جانتا ہے کہ تیری چھوٹی بڑی کائنات کے قدموں سے پامال ہونے والی میں ایک عاجز و کمترین مخلوق ہوں۔ بھلا میرے اندر کہاں اتنا حوصلہ کہ تیری پر جلال امانت کا بار اٹھا سکوں؟"

اس بھرے دربار میں سب کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ سب کی نظر اپنی ہی نجات و سلامتی پر تھی۔ لیکن انسان کھڑا سوچ رہا کہ ایک بندہ وفا شعار کو اس بحث سے کیا سروکار کہ حق امانت ادا کرنے کی اہلیت اس میں ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مالک کی رضا کیا ہے؟

مشیت یہ امانت کسی کے حوالہ کرنا چاہتی ہے تو اسے قبول کرنے میں پس و پیش کیوں کیا جائے؟ جو امانت دے رہا ہے اہی اہلیت بھی بخش دے گا اور بالفرض اگر دوست کی خاطر ہم ہلاک بھی ہوگئے تو اس میں زیاں کیا ہے؟ یہ سوچ کر انسان آگے بڑھا اور اس نے انجام سے بے خبر ہو کر ہیرے کو اٹھا لیا۔ اس مجمع کائنات میں سب کے سب حیرت سے انسان کا منہ تکتے رہ گئے۔ اس کی بے محابہ جرات پر بڑوں کا کلیجہ دہل گیا۔ خود شاہ فلک نے انسان کی جسارت بے خطر دیکھ کر کہہ دیا۔ غضب کا عالم ہے انجام سے بے خبر انسان بھی۔"

اِنَّا عَرَضنَا الاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالعَرضِ وَالجِبَالِ فَاَبَینَ اَن یَّحمِلنَھَا وَاَشفَقنَ مِنھَا وَحَمَلَھَا الاِنسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُومًا جَھُولاً

اس کے بعد دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی نسل ساری زمین پر پھیل گئی۔ ہر عہد میں کچھ خاص قسم کے انسان شہنشاہ کی طرف سے دنیا میں آتے رہے۔ جنہوں نے ہاتھوں ہاتھ اس ہیرے کی حفاظت کی۔ وہ تمام نسل انسان کو اپنی زندگی میں ہدایت کرتے رہے کہ خبردار وہ ہیرا ضائع نہ ہونے پائے ورنہ آئندہ جو دربار منعقد ہونے والا ہے اس میں انسانوں کی بڑی ہی رسوائی ہوگی۔

رَبَّنَا اِنِّی اَسکَنتُ مِن ذُرِّیَّتِی بِوَادٍ غَیرِ ذِی زَرعٍ عِندَ بَیتِکَ المُحَرَّمِ

(پروردگار! تیرے محترم گھر کے قریب، ایک بے آب و گیاہ ریگ زار میں میں نے اپنی نسل کو آباد کیا ہے اب تو ہی ان کا نگہبان ہے)

دنیا سے رحلت کرتے وقت مقدس باپ نے وہ آسمانی ہیرا اپنے اسی ارجمند بیٹے کے حوالہ کر دیا۔ یہ ہمارا قافلہ جو تم دیکھ رہے ہو، اسی کی نسل سے آباد ہے۔ جس وقت ہمارا مورث اعلیٰ دنیائے فانی سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے خاندان کے بڑے بوڑھوں کو اپنے قریب بلایا جب سب آ کر اس کے گرد جمع ہوگئے تو اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ ہیرا نکالا اور ہچکیاں لیتے ہوئے قوم کے سرداروں سے کہا۔

دیکھو! موت میرے سرہانے کھڑی ہے اور عنقریب وہ میرے تمہارے درمیان جدائی کی ایک دیوار حائل کر دے گی۔ اس حالت میں جبکہ میری آنکھیں پتھرا رہی ہیں اور ہمیشہ کے لیے میں تم سے جدا ہو رہا ہوں، نسل انسانی کے آباؤ اجداد سے جو آسمانی ہیرا ہاتھوں ہاتھ مجھ تک پہنچا ہے میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ میری حیات کے یہ آخری جملے تم دل کی تختیوں پر لکھ لو۔ سب کچھ بھول کر بھی اسے نہ بھولنا۔

دیکھو! یہ دنیا اب اپنے آخری مرحلہ سے گزر رہی ہے عنقریب یہ اسی نقطہ پر پہنچنے والی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ لیکن تم سے پہلے مجھ سے انسانوں کے لاکھوں کارواں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

تم چھوٹے بڑے سب گواہ رہنا کہ تم تک یہ امانت پہنچا کر میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔ اب نسل انسانی کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زندگی کے خطرناک گھاٹیوں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ قدم قدم پر رہزنوں کی بھیڑ تمہاری تاک میں ہوگی۔ خدائے قدیر تمہیں سفر کی ارجمندی اور راہ کی سلامتی نصیب کرے۔

اتنا کہہ کر ہمارے قبیلہ کے بوڑھے باپ نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور ہمیں یتیم بنا گیا۔"

یہاں پہنچ کر سردار قافلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس کی آواز رقت انگیز ہوگئی تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر کہا۔

میرے غمگسار مسافر! اس حادثہ کے بعد کئی سو برس تک ہمارے قافلہ میں ہاتھوں ہاتھ وہ ہیرا منتقل ہوتا رہا اور ہم خوشی خوشی زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ لیکن ایک دن ہم اسی وادی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ ہیرا گر پڑا۔ اندھیری رات تھی ہر چند ہم نے تلاش کیا، وہ نہ ملا۔

اس وقت سے لیکر آج تک ہم اسی ہیرے کی تلاش میں یہاں رکے ہوئے ہیں اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہمارا سارا قافلہ گھائل ہو چکا ہے کتنی مرتبہ ہم سو کر جاگے اور جاگ کر سوئے، لیکن نہ جانے کتنی لمبی رات ہے کہ اب تک سحر نہ ہوئی۔

آہ! اب کس منہ سے ہم آسمانی دربار کا رخ کریں گے۔ جو لوگ ہم سے پہلے جا چکے ہیں وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے مگر انہیں کیا خبر کہ درمیان راہ میں ہماری متاع حیات لٹ گئی؟

وائے حسرت ناشکیب! کل کے منعقد ہونے والے آسمانی دربار میں نسل انسانی کے تمام افراد ہمیں کیا کہیں گے۔ فرزندان آدم میں ہم لوگ کس قدر ننگ پیدا ہوئے تھے۔

سردار قافلہ! اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری سرگزشت زندگی رنج و محن کا ایک عبرتناک مجموعہ ہے۔ تمہارا قافلہ اس وقت جس وادی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے متعلق ایک تاریخی راز میرے سینے میں محفوظ ہے۔ موقعہ سے بات نکل آئی تو سن لو:-

بہت دنوں کی بات ہے۔ ہمارے قبیلے کا ایک سیاح اس وادی سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک نوکیلے پتھر سے اس کے عبا کا دامن الجھ گیا۔ وہ جھک کر اپنا دامن چھڑا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک چکنے اور چوکور ترشے ہوئے پتھر پر پڑا۔ اس نے وہ پتھر اٹھا لیا۔ جب طے کر کے وہ اجالے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ یاقوت سرخ کی ایک تختی ہے، جس پر خط سبز لکھا ہوا ہے۔

"یہ کیرو ضلالت کی وادی ظلمات ہے۔ یہاں تاریکیوں کی راجدھانی ہے۔ اس وادی میں سورج کی کرنوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ یہاں کسی نے آج تک صبح کا چہرہ نہیں دیکھا۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے لیے کرب والم کا یہ بڑا ہی دردناک حادثہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مطمئن ہوں کہ امید کا چراغ گل نہیں ہوا ہے۔ تم اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں تو ہو۔ بس گھبراؤ نہیں۔ شہنشاہ فلک کی بارگاہ بڑی عاجز نواز بارگاہ ہے۔ "اس ظلمت کدہ بلا میں تمہارے لیے وہاں سے ضرور کوئی روشنی اترے گی اور تم اپنا گم شدہ ہیرا پا لو گے" مسافر نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

لیکن ہم بدبختوں کی آخری حدوں پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے کہاں ایسے نصیب کہ شہنشاہ کی رحمت کنگرہ فلک سے ہماری چارہ سازی کے لیے آئے اگرچہ اس کے کرم کا سمندر ناپیدا کنار ہے۔ مگر ہم تو ایک قطرہ آب کے لیے ترس رہے ہیں کاش! اس کی موجوں کا ہچکولہ ہی بن جاتا۔ "اتنا کہتے کہتے سردار قافلہ کی آواز گلو گیر ہو گئی اور بے ساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی "ہائے میرا ہیرا" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شہنشاہ فلک کی رحمت مجسم تمہارے سامنے کھڑی ہے اور تم نے بدبختیوں کا ماتم کر رہے ہو؟ یہ کہتے ہوئے فوراً اس نے اپنے چہرے کا نقاب الٹ دیا۔ نقاب الٹنا ہی تھا کہ اچانک فضا روشنی سے بھر گئی اور وادی ظلمات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا اس کے بعد اس نے ریت کے ڈھیر پر اپنی نگاہ برہم کی ایک تیز شعاع ڈالی اور انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔

اور دیکھو تمہارا ہیرا چمک رہا ہے۔"

سردار قافلہ نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔

اس حیرت انگیز واقعہ پر قافلہ والے دم بخود ہو کے رہ گئے جو جہاں تھا وہیں دیوار حیرت بنا کر کھڑا رہا۔ انہیں اتنی بھی مہلت نہ مل سکی کہ اپنے گمشدہ ہیرے کی بازیافت پر خوشی کا مظاہرہ کریں۔

سردار قافلہ نے ادھر ہیرا اٹھا اور ادھر مسافر نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالی اور یہ کہتا ہوا رخصت ہونا چاہا۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔ اب میری ملاقات وہیں ہو گی جہاں تمہیں یہ امانت واپس کرنی ہے، میں خداوند فلک کی آخری روشنی ہوں، بالکل آخری!"

مسافر اتنا کہہ کر قدم اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ سردار قافلہ نے آگے بڑھ کر اس کے عبا کا دامن تھام لیا۔

"میرے چارہ ساز! ابھی کہاں تم جا سکتے ہو! دیکھو ہماری پلکوں پر ستارے چمک رہے ہیں، ابھی انہیں تمہارے قدموں پر نچھاور ہونا ہے۔ تم ہمارے قافلہ میں ایک اجنبی مسافر کی طرح آئے مگر ہمارے دلوں کی سرزمین فتح کر لی۔ پیارے! تم اپنی راجدھانی چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ ابھی تو ہم یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو" سردار قافلہ نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔

ویسے دامن جھٹکنے کی میری عادت نہیں! لیکن تم یہ جاننے کی کوشش نہ کرو کہ میں کون ہوں؟ تمہارا گوہر مقصود تمہیں مل گیا۔ تم خوشی خوشی اپنی راہ لو۔ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے وہ میرا فریضہ تھا۔ میں تم سے جزا و شکر کا طلب گار نہیں۔"

(لا نطلب منکم جزاء ولا شکورا) بھرپور شان بے نیازی کے ساتھ مسافر نے جواب دیا۔

لیکن کسی شخص کا تعارف تو انسان کی پیدائشی حق ہے اور پھر تم جیسا پیکر حیرت انسان جسے دیکھ کر جاننے کی کوشش نہ کرنا ہی اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ تم دامن نہ جھٹکو میں دامن نہ چھوڑوں۔ اس سے بڑھ کر ارجمند گھڑی اور کیا ہو سکتی ہے؟ گزرتے ہوئے عرصہ غم کی طرح تم اسے بھی دراز کر دو۔ کفارہ ہو جائے گا" سردار قافلہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تم ایک مسافر ہو۔ غیر متعلق باتوں کا پیچھا کرنا مسافروں کا کام نہیں ہوتا۔ میں کون ہوں یہ سوال تقاجائے فطرت ضرور ہے، لیکن ہر سوال کا جواب

دینا فطرت کے نزدیک ضروری کب ہے؟ دیکھو! میرے دامن سے شکستہ حال انسانوں کی لاکھوں امیدیں وابستہ ہیں، تم مجھے اجازت دے دو۔ کتنی پرنم آنکھیں میرے انتظار میں ہونگی۔ تمہاری لایعنی باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مسافر نے پروقار لہجہ میں جواب دیا۔

"اچھا، تم نا بتاؤ کہ تم کون ہو۔ لیکن ہمارے دل کے خلجان تو دور کردو کہ تم زیر نقاب تھے تو ہر طرف تاریکیوں کا راج تھے اور تم بے نقاب ہو گئے تو تمہارے چہرے کی شعاعوں سے ہر طرف اجالا ہو گیا۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ ہم تمہیں کیا سمجھیں؟ انسان یا فرشتہ؟ لیکن فرشتوں کا ایسا پیکر نہیں ہوتا اور انسان کا چہرہ سورج نہیں ہوسکتا۔ اب سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ تم حیرتوں کی ایک نئی مخلوق"

"میرے دلنواز! میں بڑی سماجت سے کہہ رہا ہوں کبیدہ خاطر نہ ہونا" سردار قافلہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں میں کون ہوں؟ اس کے پیچھے نہ پڑو۔ لیکن تم اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔

میں " کون" ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا جواب تمہاری عقل وفہم سے بالاتر ہے **لم یعرفنی حقیقتہ غیر ربی** (میرے رب کے سوا مجھے اور کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں)

اب بھی تمہاری تشفی نہ ہوئی ہو تو سنو کہ میرے جمال حقیقت پر بے شمار نقاب پڑے ہوئے ہیں تا کہ تمہارے اندر تاب نظر باقی رہ سکے اور تم میرے چہرے کی برکتیں لوٹ سکو۔

وہ بشریت کا نقاب ہے جسے ڈال کر میں نے تمہاری انجمن میں قدم رکھا ہے تا کہ تم مجھ سے مانوس ہو کر میرے دامن کے قریب آسکو اور میں تمہیں خدائے قیوم کی بارگاہ اقدس تک پہنچادوں۔

دیدہ انسانی میرے چہرے حقیقت کا جمال دیکھنے کی توانائی نہیں رکھتی۔ اس کی رسائی صرف میرے پیکر ظاہر تک ہے اور اسی سرمایہ نظر پر دینا مجھے بشر کہتی ہے سمجھ گئے نا"

"پس تم اپنی نظر بھر دیکھ لو۔ پوچھ مت کہ میں کون ہوں میرے کشور حسن میں آنکھوں کے لیے اجازت نظارہ ضرور ہے پر زبان کے لیے اذن سوال نہیں۔ تم اپنی مقدور سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو" مسافر نے حکیمانہ انداز میں سمجھائے ہوئے کہا۔ لیکن تم سے تو اس عنصر فانوس میں بھی بشریت سے ماوراء نظر آتے ہو اور یہ کچھ ہماری نگاہ کا اعجاز نہیں، تمہارے ہی جلوہ آشکار کا کرشمہ ہے۔ یہی تمہارا پیکر ظاہر جسے تم نے ہمارا سرمایہ نظر ٹھرایا ہے، تمہارے جمال حقیقت کی غمازی کرتا ہے۔ اب ہم نہیں کہ سکتے یہ ہمارا فریب نظر ہے یا فی الحقیقت تم ہی ایسے ہو" سرادار قافلہ نے سمجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

فریب نظر نہیں، ایک موجود حقیقت! لیکن بہت مبہم!! جیسے بادل کے سیاہ پردوں میں چاندنی رات!!! پھر تم ہی سوچو اگر یہ اندیشہ بے بنیاد ہوتا تو خداوند فلک کی بارگاہ جلال سے اس اعلان کی ضرورت کیوں پیش آتی **قل انما انا بشر مثلکم** نظر اپنے نظارہ میں آزادہ کر بھی مجھے بشر ہی سمجھی۔ تو بتاؤ یہ کس خطرے کا دروازہ بند کیا جارہا ہے؟

میں امید کرتا ہوں کہ میری گفتگو کا اصل مدعا تم سمجھ گئے ہو گے، اور اب یہ سلسلہ ختم کردو گے، اچھا اب مجھے اجازت دو " مسافر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

فرط شوق کی یہ ایک بے ارادہ لغزش تھی جو خود رفتگی میں مجھ سے سرزد ہو گئی۔ معاف کرنا میں بے محل سوال کر کے تمہیں زحمت دی۔ لیکن اتنا اور گوارہ کرسکو تو دم رخصت ذرا اپنا نام بتادو۔ کم از کم تمہارے نام کی یاد سے میں اپنے خاطر کو تسکین دیتا رہوں گا۔ سردار قافلہ نے نہایت مودبانہ انداز میں کہا۔

تعجب ہے! زمین وآسمان کے زیروزبر سے لے کر جنت وعرش کے بام و در تک دفتر وجود کے ہر ورق پر میرے نام کی مہر ثبت ہے اور تمہیں نام بتانے کی احتیاج باقی رہ گئی ہے؟ کاش تم پوچھتے کی بجائے پڑھنے کی کوشش کرتے۔

اچھا فرض کرو، ایک ایسی ہستی جو اپنی سرشت میں ہر طرح کی آلودگی سے بالکل معصوم پیدا ہوئی ہو۔ جس کا مزاج فطرت اتنا طیب وطاہر اتنا برتر وعالی ہو کہ مکارم وفضائل اس کے دامن میں جگہ پا کر عزت وشرف حاصل کرتے ہوں اور پھر جو اپنے محاسن وکمالات میں کس سے لیکر کنگرہ وعرش تک ساری کائنات کا مرجع حمد وستائش ہو تو تم ہی بتاؤ، ایسی ہستی کو تم کس نام سے پکارو گے؟ مسافر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

سردار قافلہ نے کہا "اس کا نام سوائے محمد ﷺ کے اور کیا ہوسکتا ہے (چونک کر) تو کیا محمد ﷺ ہو؟ تم آخری نبی الزماں ہو؟ اے خوشا نصیب! تم قدسیوں کے جھرمٹ میں چمکنے والی وہ تجلی فاراں ہو جس کی خبر حضرت مسیح نے دی تھی؟

عالم کیف میں ڈوب کر سردار قافلہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شجر وحجر کی گردنیں جھک گئیں اور دشت وکہسار کے گوشہ گوشہ سے آوازیں آنے لگیں۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ **الصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ**

الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

قافلے والے بھی دست بستہ کھڑے ہو کر عشق وعقیدت کی اس انجمن میں شریک ہو گئے۔

تسلیم و رضا

کہتے ہیں جس کو زخم محبت کچھ اور ہے۔ کہنے کو یوں تو گل کا بھی سینہ فگار ہے۔

ایک دن مناجات سحر کے وقت بڑے ہی رقت انگیز کیف کے ساتھ سیدابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور یہ دعا مانگی۔

پروردگار مجھے نیکوکار فرزند عطا فرما۔ لب ھائے خلیل سے نکلی ہوئی دعا فوراً بارگاہ عزت میں شرف قبول سے سرفراز ہوئی۔ عالم قدس سے آواز آئی۔

ہم نے ایک سمجھدار لڑکے کی انہیں خوشخبری دی۔

کچھ ہی عرصے کے بعد ایک سہانی صبح کو نسیم صبا نے اکناف عالم میں یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر چمنستان قدس کا ایک پھول کھلا یعنی جگر گوشہ خلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام پردہ غیب سے خاکدان گیتی پر جلوہ افروز ہوئے۔

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش　　　شامل کسی کا خون تمنا ضرور تھا

ملک شام کا سرسبز و شاداب علاقہ جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ابھی کچھ ہی دن گزرنے پائے تھے کہ ہاتف غیب کے خاموش اشارہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی رفیقۂ حیات حضرت ہاجرہ اپنے شیر خوار صاحبزادے حضرت اسماعیل کو اپنے ہمراہ لے کر چل پڑے۔ تین افراد پر مشتمل یہ نورانی قافلہ شب و روز چلتا رہا۔ آخر ایک دن پہاڑ کے ایک وسیع دامن میں پہنچا اور وہیں ٹھہر گیا۔

اک ان کی نگاہ آشنا نے　　　سب سے بیگانہ کردیا

کچھ ہی فاصلہ پر ٹوٹی ہوئی دیواروں کے کچھ نشانات نظر آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرط ادب سے اپنا سر جھکا دیا اور اپنی رفیقۂ حیات ہاجرہ سے کہا کہ دیکھو! روئے زمین پر یہی خدائے ذوالجلال کا محترم گھر خانہ خدا ہے۔ یہی کائنات ارضی کا مرکز تعظیم ہے۔ یہی ابن آدم کی معزز پیشانیوں کی سجدہ گاہ ہے اور پھر یہی ہمارے سفر کی آخری منزل ہے۔

آنکھوں میں اک نمی سی ہے ماضی کی یادگار　　　گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوانوں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر بہ رقت دعا مانگی۔

اے پروردگار تیرے محترم گھر کے قریب ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنا کنبہ آباد کر رہا ہوں۔ تاکہ وہ نماز پڑھیں اور تیرے گھر کو سجدوں سے بسائیں۔

پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں اور انہیں پھلوں کا ذوق عطا کر کہ وہ تیرا شکرادا کریں۔

شوق بقائے درد کی ہیں ساری خاطریں　　　ورنہ دعا سے اور کوئی مدعا نہیں

ذرا سوچئے! ایک لق و دق صحرائے، تپتے ہوئے کہسار اور اسباب زندگی سے بے نیاز وادی ایسے سنسان ماحول میں اپنے بچے کو تن تنہا چھوڑ جانا۔ کس کا کردار ہو سکتا ہے جو کوئی آپ سے خدا کی چارہ ساز قدرتوں کا تماشائی ہو۔ خدا پر اعتماد کامل کی ایسی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام بادیدہ پرنم رخصت ہوئے اور ادھر خدائے کارساز نے غیبی تائیدوں کے دروازے کھول دیے۔ ریگ زار کے سینے سے زم زم صافی پھوٹ پڑا اس خاموش وادی کو انسانوں کی چہل پہل سے آباد کرنے کا انتظام ہوا کہ قبیلہ بنی جرہم خانہ بدوش کارواں صحراؤں کی خاک اڑاتا کہیں سے آپہنچا۔ اور اس چشمہ سیال کے کنارے آباد ہو گیا اور چند ہی دنوں میں خدا کے محترم گھر کے قریب غمگسار پروسیوں کا ایک جیتا جاگتا شہر بس گیا۔

ساری رونق ہے یہ دیوانوں کے دم کی آتش　　　طوق و زنجیر سے ہوتا نہیں زنداں آباد

وہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی شفیق ماں کی آغوش میں پران چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ جب عنفوان شباب کی منزل میں قدم رکھا تو ان کے محترم باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک شام سے مکہ چلے آئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔

ایک خوشگوار صبح کو آسمانوں کے دروازے کھل گئے۔ عالم قدم کے فرشتے مکہ کے نورانی فضاؤں میں تیرنے لگے۔ اسی عالم کو اپنے قریب بلایا اور بڑے ہی پیار بھرے انداز میں کہا۔

میرے لاڈلے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

ارجمند بیٹے نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا!

میرے شفیق باپ خواب کے ذریعہ آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ بغیر کسی پس و پیش کے اسے کر گزریے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابرو شاکر پائیں گے۔

غم سلامت تیرے انداز پر مرنے والے　　　موت کا بھی کہیں احسان لیا کرتے ہیں

سرفروش بیٹے کا یہ جواب سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل جوش محبت سے بھر گیا۔ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھے اور کائنات گیتی پر تسلیم ورضا ایک نرالا امتحان دینے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو ہمراہ لے کر منیٰ کی وادی کی طرف چل پڑے۔ قربان گاہ میں پہنچ کر چھری نکالی اور آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ مبادہ شفقت پدری کا ہاتھ کہیں کانپ جائے۔

غیر کا اب گزر نہیں دل تک   عشق عہدہ ہے پاسبانی کا

پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل بچھاڑا تا کہ ذبح کریں۔

ٹھہر جایئے! ذرا کئی برس پیچھے پلٹ کر یہ رقت انگیز منظر نگاہوں کے سامنے لائے کہ سنسان وادی میں ایک نوے سال کا بوڑھا باپ ہے۔ جسے مناجات سحر کے بعد خاندان کا چشم و چراغ عطا ہوا ہے۔ جو ساری دنیا سے بڑھ کر اس کی نگاہوں کا محبوب ہے۔ اب اسی محبوب کے قتل کے لیے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں تیز خنجر ہے۔ دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے۔ جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قتل نظر آتا ہے۔

اے غم دوست تیری عمر دراز

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو   عجب چیز ہے لذت آشنائی

ملائکہ قدم فضائے آسمانی اور عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے تھے کہ دفعتہ شہپر جبرائیل کی جھنکار سے منیٰ کی خاموش وادی کا سکوت ٹوٹا اور عالم قدس سے آواز آئی اور ہم نے انہیں آواز دی کہ اے ابراہیم! بلاشبہ تم نے اپنے خواب سچ کر دکھایا۔

ہم اپنے نیکو کا بندوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اسماعیل کے اوپر سے نثار کر دیا اور آنے والی نسلوں میں ان کی یادگار قائم کر دی۔ سلام ہو ابراہیم علیہ السلام جیسے مخلص دوست پر۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیٹے کے حلقوم پر پوری طاقت کے ساتھ چھری چلائی۔ لیکن مشیت یزدانی درمیان میں حائل ہوگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت سرعت کے ساتھ بیٹے کو سرکا کر اس کی جگہ ایک بہشتی دنبہ رکھ دیا۔ خدا کے نام پر یہ پہلا خون تھا۔ جس سے منیٰ کی وادی لالہ زار ہوئی۔

آنسوؤں کی کمی نہیں لیکن   کچھ سبب نہ تھا کہ آنکھ تر نہ ہوئی

فیروز بخت پیمبر زادہ نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا۔ اس کا صلہ یہی تھا کہ رسم قربانی قیامت تک اس کے نام کی یادگار بن جائے۔

اسی حقیقت کی طرف سید عالم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔

یہ رسم قربانی تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔

ذرا سوچئے! اس دردناک واقعہ کو کتنے ہزار سال بیت گئے لیکن اکناف عالم میں اس کی یاد کا ہنگامہ آج بھی کچھ اس طرح برپا ہے۔ جیسے کل ہی کا یہ کوئی تازہ واقعہ ہے۔

اس سرائے فانی میں نقش جاوداں قربانی کی مخصوص ترین جزاء ہے۔ نوشتۂ الٰہی کے مطابق صفحہ خاک پر انہی لوگوں کے لیے سرفرازی ہے۔ جو ایثار و قربانی کو اپنا مقصد حیات بنا لیتے ہیں۔ اور اپنی متاع جسم و جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ہر صاحب استطاعت پر قربانی واجب ہے۔

آج ذرا اپنا حال زار دیکھیے کہ خود غرضی، پست ہمتی اور آخرت فراموشی میں ہمارے قومی وجود کا سارا اعزاز دولتوں کی خاک میں دفن کر دیا ہے۔ ہماری غیرتوں کا جنازہ شاہراؤں پر پامال ہو رہا ہو اور ہمارے چہروں پر ذرا بھی پشیمانی نہیں ہے۔ ہم اپنی ذاتی آسائشوں اور نام و نمود کی خواہش پر انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اپنا سارا اثاثہ لٹا دیتے ہیں۔ لیکن ملت کی آبرو اور خوشنودی حق کے لیے ایک تنکا بھی ہمارے احساس پر گراں بار بن جاتا ہے۔ کیا یہی ایک سرفروش قوم کی زندگی کا نقشہ ہے۔

ہر سال عید قربان کے موسم میں خدا کی زمین کو خون کے دھبوں سے لالہ زار بناتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ قربانی سے مقصود گوشت پوست نہیں بلکہ اس جذبہ اخلاق کو بیدار کرنا ہے جو کائنات گیتی کے دل کی دھڑکن ہے اور انسانیت کا جوہر امتیاز ہے۔

لالہ و گل تو حسیں سے بھی حسیں تر ہیں مگر   دیکھنا یہ ہے کوئی خار حسین ہے یا کہ نہیں

سرور کائنات ﷺ کی عمر شریف کا چالیسواں سال تھا۔ خاکدان گیتی میں رسالت محمدی کے اعلان کا وقت اب بہت قریب آ گیا تھا کائنات کا ذرہ ذرہ فاران کی چوٹی سے نشر ہونے والے پیغام کے لیے گوش برآواز تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مکے کے صرف ایک دیانتدار و فیاض تاجر تھے اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہ تھی اسی درمیان میں انھیں تجارتی مہم پر ملک شام کا ایک سفر درپیش ہوا اور وہ ضروری تیاریوں کے بعد روانہ ہو گئے۔

ان کے ہمراہ ان کا وفادار غلام بھی شریک سفر تھا راستہ طے ہوتا رہا۔ منزلیں بدلتی رہیں ہفتوں شبانہ روز چلتے چلتے اب ملک شام کی سرحد شروع ہو گئی۔ عربی سوداگر کا یہ مختصر سا قافلہ اب ملک شام کی حدود میں داخل ہو چکا تھا ایک دن ایسا ہوا کہ ایک لق و دق صحرا سے گزرتے ہوئے شام ہو گئی۔ سیاہ بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے تیزی کے ساتھ آفاق پر سمٹنے لگے دیکھتے دیکھتے کالی گھٹاؤں کے پردے میں سورج کی لرزتی ہوئی کرن ڈوب گئی۔ اب شام کا وقت گزرتا ہوا موسم اور دامن صحرا میں دو ننھی جانوں کا قافلہ، ہر طرف سے مایوسیوں نے گھیر لیا۔

حیرانی کے عالم میں اونٹنی کے مہار تھامے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے کہ فضا میں رات کی تاریکی جذب ہونے سے پہلے پہلے جنگل کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ رحمت باری شریک حال تھی چند ہی قدم چلنے کے بعد جنگل کی حد ختم ہو گئی اب کھلے میدان کا اجالا نگاہوں کے سامنے تھا۔ ویسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسافر کی شام کتنی اداس و اندوہناک ہوتی ہے بحر ظلمات سے نکل آنے کے بعد بھی یہ فکر دامن گیر تھی کہ رات کہاں بسر کی جائے۔ خدا کی شان کہ تھوڑی ہی دور کے فاصلے پر عیسائیوں کا ایک کلیسا نظر آیا آبادی کا نشان دیکھتے ہی جان میں جان آئی کہ رات گزارنے کیلئے ایک پناہ مل گئی تھی۔

قافلے کی اونٹنی کلیسا کے سامنے پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ سنسان ویرانے میں آدمیوں کی آہٹ پا کر ایک شخص باہر نکلا اور حیرت و تجسس کے ساتھ دریافت کیا۔ آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آ رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ہم عرب کے تاجر ہیں۔ مکہ جہاں خدا کا محترم گھر ہے وہیں ہمارا مسکن ہے۔ ملک شام جاتے ہوئے غالباً راستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔ کلیسا میں ایک رات بسر کرنے کی اجازت چاہتے ہیں؟

اس شخص نے جواب دیا۔ یہ کلیسا کا مذہب کے ایک بہت بڑے راہب کی عبادت گاہ ہے۔ ساری دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر کے سو سال سے یہاں یاد الٰہی میں وہ مصروف ہیں۔ صرف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں ان کے قریب جا سکتا ہوں۔ میرے سوا کسی کو ان کی خلوت گاہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں رہتے ہوئے پچیس سال ہو گئے۔ ٹھیک ایک شیخ طرح انہوں نے ہماری تربیت کی ہے۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اور جہاں تک رات بسر کرنے کی اجازت کا سوال ہے تو اس کے متعلق کلیسا کی ایک نہایت مشکل شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں رات وہی بسر کر سکتا ہے جس کے دامن زندگی پر گناہوں کی آلائش کا کوئی دھبہ نہ ہو کیونکہ آج سے چند سال پہلے ایک بدکار شرابی سرشام یہاں بھٹکتا ہوا کہیں سے آ گیا اور مسافر سمجھ کر اسے رات بسر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

صبح اٹھ کر اس نے اپنی راہ لی لیکن کافی عرصے تک اس کے کردار کی نحوست کا تاریک سایہ ہمارے شیخ کی روحانی لطافت پر اثر انداز رہا اسی وقت سے یہاں رات بسر کرنے والوں کے لیے طہارت قلب کی شرط لگا دی گئی۔

اس کی گفتگو تمام ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا لیکن تمہارے شیخ کے پاس کسی کی اندرونی حالت جاننے کا کیا ذریعہ ہے؟ کیوں کہ کسی بدکار کی پیشانی پر اس کی مجرمانہ زندگی کی فہرست کندہ نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں کلیسا کی اس شرط سے نیکوکار مسافر کی حق تلفی کا امکان بہت زیادہ بڑھ جائے گا اس لیے بہتر ہے کہ اس شرط کو منسوخ کرا دو پھر وہ ذریعہ بتاؤ جس کے بل پر بدکار و نیکوکار کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکے۔

ہزار حسن ظن کے باوجود ایک معقول سوال کی زد سے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ چند ہی جملوں میں ذہن کی بنیاد ہل گئی بے بسی کی کشمکش میں اس نے جواب دیا۔

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب ایک بدکار انسان کے کردار کی نحوست شیخ کے تئیں محسوس ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک نیکوکار کی روحانی لطافت کے جانچنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو۔

اس جواب کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا "تو پھر جاؤ اپنے شیخ سے میرے متعلق دریافت کر لو۔ اگر انہیں میرے قیام پر اعتراض نہ ہو تو میں رات کا کچھ وقت کلیسا کے ایک گوشہ میں گزار لوں۔ بیاض سحر نمودار ہوتے ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں گا ورنہ ایک مسافر کے لیے کھلے میدان کا سایہ بہت کافی ہے۔"

تھوڑی دیر تک پس و پیش کے بعد وہ راہب کے خلوت کدے میں داخل ہوا اور پیکر عجز و نیاز بن کر اسے اطلاع دی۔

ملک عرب کے مکہ نامی ایک شہر سے دو مسافر بھٹکتے ہوئے یہاں آگئے ہیں اور کلیسا میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہتے ہیں ظاہری وجاہت کے لحاظ سے ان میں ایک آقا معلوم پڑتا ہے جبکہ دوسرے کے چہرے سے ایک وفادار غلام کی علامتیں نمایاں ہیں۔"

راہب نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا" کیا وہی مکہ جو پہاڑیوں کے جھرمٹ میں آباد ہے اور جہاں قدم قدم پر کھجوروں کے جھنڈ نظر آتے ہیں؟"

خادم نے جواب دیا" میں نے تفصیل نہیں معلوم کی ہے۔ اگر اجازت ہو تو دوبارہ جا کر دریافت کروں۔"

خادم نے پرتپاک لہجے میں کہا" ضرور دریافت کرو اور جسے آقا کہہ رہے ہو اس کا نام بھی معلوم کرتے آؤ۔"

خادم نے حجرے سے باہر نکلتے ہی دریافت کیا۔ یہ معلوم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ جس مکے کو آپ نے اپنا مسکن بتایا ہے کیا وہ پہاڑیوں کے جھرمٹ میں آباد ہے اور کیا جگہ جگہ وہاں کھجوروں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ہاں! یہ دونوں باتیں واقعہ کے مطابق ہیں۔ پھر وقفے کا سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ سوال کیا۔

زحمت نہ ہو تو اپنے مبارک نام سے روشناس کیجئے۔

"مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔"

"الٹے پاؤں راہب کے سامنے حاضر ہو کر خادم نے اطلاع دی مکے کے بارے میں جو باتیں آپ نے دریافت کی ہیں وہ صحیح ہیں اور وہ اپنا نام ابوبکر رضی اللہ عنہ بتاتا ہے۔"

"ابوبکر کا لفظ سن کر راہب کی پیشانی پر کچھ لکیریں ابھر آئیں۔ جیسے حافظے پر زور کر وہ کوئی بات سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر تک محویت خیال کی یہی کیفیت رہی اس کے بعد اچانک کھڑا ہو گیا اور ایک مقفل صندوق میں سے بوسیدہ کاغذات کا ایک دفتر نکالا اور مضطربانہ کیفیت میں اسے الٹے پلٹنے لگا۔ ورق الٹتے الٹتے صفحہ پر نظر جم گئی اور اچانک چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی گمشدہ حقیقت کا سراغ مل گیا ہو۔

فوراً ہی بیتابی کے ساتھ وفادار خادم کو آواز دی اور کہا" مکے کے اس سوداگر سے اتنی بات اور دریافت کر لو کہ اس کے باپ کا نام کیا ہے؟"

خادم نے پھر آ کر دریافت کیا۔ بار دیگر آپ سے اس امر کی تکلیف دیتے ہوئے شرمندہ ہوں کہ آپ کے والد بزرگوار کا کیا نام ہے؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے متحیر نگاہوں سے اسے دیکھا اور ایک لفظ میں جواب دیا۔

" ابوقحافہ "

واپس لوٹ کر جیسے ہی راہب کو اس نے اس نام کی اطلاع دی اس کی آنکھیں حیرت وانبساط کی ملی جلی کیفیت سے چمک اٹھیں جذبات کی ترنگ میں وہ کھڑا ہو گیا اور خادم کو حکم دیا۔" جاؤ بغیر کسی تاخیر کے اسے میرے خلوت کدے میں بلا لاؤ"

راہب کا یہ حکم سن کر خادم کو انتہائی اچنبھا ہوا۔ سکتے کی کیفیت میں وہ تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ سو برس کی روایات کے خلاف یہ بالکل اجنبی حکم کیا واقعۃً تعمیل کے لیے ہے یا یونہی زبان سے نکل گیا ہے؟

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر راہب نے پھر زور دیتے ہوئے کہا تمہیں پس و پیش کیوں ہو رہا ہے میں جان بوجھ کر اپنے دستور کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ حکم کی تعمیل کرو۔ اظہار حیرت کا یہ موقع نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے تئیں اس امید میں کھڑے تھے کہ پوچھ گچھ کا مرحلے طے ہو جانے کے بعد اب یہاں رات بسر کرنے کی اجازت مل جائیگی جونہی قدموں کی آہٹ ملی وہ راہب کا فیصلہ سننے کے لیے گوش برآواز ہو گئے۔

خادم کے چہرے سے حیرت واستعجاب کی پراسرار خاموشی ٹپک رہی تھی۔ آتے ہی اس نے خبر دی" اب میرے لیے تمہاری شخصیت سرتاسر ایک معمہ بن گئی ہے۔ کلیسا کی ایک صدی کی لمبی تاریخ میں تم پہلے انسان ہو جسے ہمارے تارک الدنیا شیخ نے اپنی خلوت خاص میں باریاب ہونے کی اجازت دی ہے بلکہ تمہاری سحر طراز شخصیت نے انہیں سراپا اشتیاق بنا دیا ہے۔ وہ نہایت بے تابی کے ساتھ اپنے خلوت کدہ میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی چلو ورنہ ایک لمحے کی تاخیر بھی جذبہ شوق کیلیے گراں بار بن جائے گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجسمہ حیرت بنے ہوئے اٹھے اور اس کے پیچھے پیچھے راہب کے حجرہ خاص میں داخل ہوئے۔

کئی سو برس کا بوڑھا راہب جس کی بھنویں سفید ہو کر لٹک گئی تھیں اور ہڈیوں کے ڈھانچہ کے سوا سر سے پا تک جسم انسانی کا کہیں کوئی گداز نظر نہیں آ رہا تھا۔ خیر مقدم کے لیے کھڑا تھا۔

حجرہ میں قدم رکھتے ہی ایک مدھم سی آواز کان میں آئی۔

"اگر تم وہی ہو جس کی چند نشانیاں میرے پاس محفوظ ہیں تو آج تمہارے دیدار کا شرف حاصل کر کے میں ہمیشہ اپنی خوش نصیبی پر فخر کروں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اپنی لٹکی ہوئی پلکوں کو آنکھوں کے روزن سے ہٹایا اور چراغ کی تیز روشنی میں سر سے پا تک ایک بار سارے جسم کا جائزہ لیا۔ کبھی کتاب

کے بوسیدہ ورق پہ انگلی رکھتا۔ کبھی چہرے کے خدوخال کا مطالعہ کرتا نوشتہ کتاب اور صحیفہ رخ کا کافی دیر تک تقابل کرنے کے بعد ایک مرتبہ عالم بیخودی میں آواز دی۔

"زحمت نہ ہو تو اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی ذرا میری آنکھوں کے قریب کر دو"

کلائی پر تجسس کی نگاہ ڈالتے ہی اس کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے اپنے لرزتے ہوئے ہونٹ سے انگلیوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

اجازت دو کہ میں تمہیں (امیر المومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کہہ کر پکاروں) تحیر آمیز لہجے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا" سمجھ میں بات نہیں آئی کہ صرف ایک رات بسر کرنے کے سوال پر کتنا بکھیڑا پھیلا دیا ہے تم نے؟ کبھی ہم سے مکے کا جغرافیہ پوچھتے ہو کبھی میرا اور میرے باپ کا نام دریافت کرتے ہو۔ کبھی کئی برس کا پرانا کاغذ لے کر میرے چہرے اور جسم کے نشانات کا جائزہ لیتے ہو اور اب تم نے مجھے ایسے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی ہے جس نام سے میرے باپ نے موسوم نہیں کیا تھا تم ہی سوچو! آخر یہ کیا تماشہ ہے؟ درماندہ انسانوں کے ساتھ اس طرح کا مذاق ایک تارک الدنیا راہب کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ سیدھے سادھے انداز میں ایک رات بسر کرنے کی اجازت دینی ہو تو دے دو ورنہ آسمان کا شامیانہ ہمارے لیے بہت کافی ہے۔ "

یہ کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس ہی لوٹنا چاہتے تھے کہ راہب نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ہائے افسوس آسمانی بشارت سن کر آزردہ خاطر ہو گئے۔

معاذ اللہ! روئے زمین کی ایک محترم ہستی سے میں کبھی مذاق نہیں کر سکتا۔ تمہارے مقدر کے جو نوشتے میرے پاس محفوظ ہیں میں نے انہیں صرف پڑھ کر سنایا ہے۔

آج میری باتوں کا شاید تم یقین نہ کر سکو۔ لیکن سن لو کہ مکے کے افق سے رسالت کا وہ خورشید انور بہت جلد طلوع ہونے والا ہے جس کے جلو میں ایک روشن سیارہ کی طرح تم قیامت تک درخشاں رہو گے۔

آسمانی صحائف میں گیتی کے آخری پیغمبر کے جلوہ گر ہونے کی جو نشانیاں بتائی گئی ہے اس کی واضح علامتیں میں تمہاری شخصیت کے آئینے میں پڑھ رہا ہوں۔ تمہارے دمکتے ہوئے چہرے کی تو بات ہی کیا ہے کہ تمہارے داہنے ہاتھ کا یہ تل بھی ہماری کتاب میں موجود ہے۔ عبرانی زبان سے واقفیت ہو تو لو سرا پا تم خود ہی ان آسمانی نوشتوں میں پڑھ لو۔

بہرحال اب تم ایک غریب الدیار مسافر نہیں ہو۔ تجلیات قدس کے نگارخانوں کے وارث و نگراں ہو۔ اس خانقاہ کی دیواروں کا سایہ تو کیا چیز ہے۔ تم چاہو تو میری سفید پلکوں میں رات گزار سکتے ہو۔

ایک ہنگامہ خیز تحیر کے ہجوم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راہب کے خلوت کدے سے اٹھا اور کلیسا کے ایک حجرے میں آ کر لیٹ گئے ساری رات راہب کی گفتگو بزم خیال میں گردش کرتی رہی ذہن میں طرح طرح کے تصورات کا طوفان امنڈ تا رہا ایک لمحے کے لیے بھی انہیں نیند نہیں آئی۔

صبح کو جب رخصت ہونے لگے تو راہب کی الوداعی ملاقات کا منظر بڑا ہی دردناک تھا۔ اشکبار آنکھوں سے پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے بوڑھے باپ کا یہ جملہ مکے کی واپسی تک ان کے حافظے پر نقش رہا۔

تمہاری زندگی میں فیضان الٰہی کی جب وہ سحر طلوع ہو تو مجھے بھی فیروز بخت دعاؤں میں یاد رکھنا۔

کئی مہینے کے بعد آج حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی تجارتی مہم سے مکے کو واپس لوٹ رہے تھے۔ شبانہ روز چلتے چلتے اب صرف ایک منزل کی مسافت رہ گئی تھی۔ کھجوروں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے راہب کے سوالات حافظے کی سطح پر ابھرنے لگے۔

ام القریٰ کی پہاڑیوں پر نظر پڑتے ہی ایک معنوی کیف سے دل کا عالم زیروزبر ہونے لگا۔ فطرت الٰہی کی کشش سے اونٹنی کی رفتار تیز ہو گئی۔

تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد مکے کی عمارتیں چمکنے لگیں نظر پڑتے ہی جذبہ شوق کے تلاطم میں سواری سے نیچے اتر پڑے غلام نے اونٹنی کی مہار تھام لی۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی کہیں سے ابوجہل نے دیکھ لیا تھا اور آواز دیتا ہوا دوڑ کر قریب پہنچا۔ ملاقات کے بعد ابوجہل نے فوراً یہ خبر سنائی۔

"تم غالباً ایک عرصے پر اپنے سفر سے واپس لوٹ رہے ہو شاید تمہیں معلوم نہیں ہوگا کہ تمہارے جانے کے بعد یہاں کیا گل کھلا ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ پردیس میں معلومات کا ذریعہ ہی کیا تھا ویسے اپنے بعد یہاں کے واقعات کی مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے۔ کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے تو سناؤ"

ابوجہل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "عبداللہ کے بیٹے محمد ﷺ کے متعلق تم بھی جانتے ہو کہ اپنے قبیلے میں وہ کتنا معزز اور ہر دلعزیز تھا۔ سارا شہر اس کی شرافت اور تقدیس کا لوہا مانتا تھا۔ لیکن تمہیں حیرت ہوگی کہ ادھر چند دنوں سے ایک عجیب و غریب ڈھونگ رچایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں خدا کا آخری پیغمبر ہوں۔ میرے پاس ایک فرشتہ آسمان سے وحی لے کر اترتا ہے۔ اب وہ کھلے بندوں اپنے آباء و اجداد کے خداؤں کی مذمت پر اتر آیا ہے لات و ہبل کے سنگ آستاں سے باغی بنا کر وہ لوگوں کو ایک نادیدہ خدا کی پرستش کی دعوت دے رہا ہے۔ دنیائے عرب کے قدیم مشرب کے خلاف اس باغیانہ اقدام پر سارے مکے میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔"

فی الحال ابوطالب کی ضمانت پر اس کے خلاف ابھی کوئی تعزیری کاروائی عمل میں نہیں لائی جاسکتی ہے۔ لیکن حالات شاہد ہیں کہ جس دن وہ اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستبرداری کا اعلان کردیں گے اس دن مکے کی زمین اپنی وسعت کے باوجود اس پر تنگ ہو جائے گی۔

قوم میں تمہاری ذہانت وسنجیدگی ضرب مثل ہے۔ عام طور پر تمہاری بات کا بہت زیادہ وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس فتنے کی سرکوبی میں تم اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے اپنی قوم کو شکر گزار بناؤ گے۔

ابوجہل کی گفتگو سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نگاہوں کے سامنے ایک نئی زندگی کی مستقبل چمکنے لگا۔ راہب کی پیشن گوئی بظاہر حقیقت کے سانچے میں ڈھلتی ہوئے محسوس ہونے لگی۔ جذبات کے تلاطم پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے جواب دیا "ابھی تو میں ایک طویل سفر سے واپس لوٹا رہا ہوں۔ چہرے کی گرد تک صاف نہیں کرسکا ہوں بطور خاص حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرسکوں گا ابھی سر راہ عجلت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

ابوجہل سے پیچھا چھڑا کر سیدھے اپنے گھر تشریف لائے۔ غلبہ شوق اور جذب طلب نے اتنی بھی مہلت نہیں لینے دی کہ سامان اتار کر گھر میں قدم رکھتے اسی مسافرانہ سج دھج میں بنو ہاشم کے قبیلے کی طرف نکل پڑے۔ سیدھے ابوطالب کے گھر پہنچے اور سرکار اقدس کے بابت دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بوقبیس کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔

ایک نامعلوم وارفتگی شوق کے عالم میں جیسے ہی وہ کوہ بوقبیس کے قریب پہنچے دیکھا کہ دامن کوہ میں سرکار ایک چٹان پر تشریف فرما ہیں۔ عارض تاباں سے رحمت ونور کا آبشار پھوٹ رہا ہے۔ قدموں کی آہٹ پاتے ہی رخ اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

مرحبا اھلا وسھلا مبارک ہو تمہارا آنا مبارک ہو۔ خیر مقدم کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یوں ہی نہیں بیٹھے تھے کسی نئے آنے والے کا انتظار تھا انہیں۔

اعلان نبوت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ بالکل پہلی ملاقات تھی۔ مسرتوں کے انوار سے سرکار کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ کیوں نہ ہو کہ آج امت مرحومہ کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے نوشتہ تقدیر کا انجام دیکھنے کے لیے حیرانی کے عالم میں خاموش کھڑے ہی تھے کہ گل قدس کی پتیوں کو حرکت ہوئی اور کشور دل کو فتح کرنے والی ایک آواز فضا میں بکھر گئی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ! کلمہ حق کی طرف سبقت کرنے میں پیچھے آنے والوں کا انتظار نا کرو خدا کا آخری پیغمبر تمہیں حیات سرمدی کی دعوت دے رہا ہے اسے بغیر کسی پس وپیش کے قبول کرو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا خدا کے رسولوں کے متعلق میں نے سنا ہے کہ جب وہ دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں تو منصب رسالت کی تصدیق کے لیے اپنے ہمراہ کچھ نشانیاں لے کر آتے ہیں۔ میں بھی اپنے تئیں اطمینان قلب کے لیے نشانی کا امیدوار ہوں۔

سرکار رسالت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ نشانیوں سے گزرنے کے بعد بھی تمہیں اب تک نشانی کی احتیاج باقی رہ گئی ہے؟ کلیسا کی اس سنسان رات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ یاد کرو! تمہاری داہنی کلائی کا تل دیکھ کر شام کے راہب نے تم سے کیا کہا تھا؟ میری رسالت کی تصدیق کے لیے کیا آسمانی صحائف کے وہ نوشتے کافی نہیں ہیں۔

جنہیں رات کی تنہائی میں اس بوڑھے راہب نے تمہیں پڑھ کر سنائے تھے؟ پھر تمہاری روح کا وہ اضطراب مسلسل جس نے تمہاری آنکھوں کی نیند اڑادی ہے اور جو تمہیں غبار آلود چہرے کے ساتھ کشاں کشاں کھینچ کر یہاں لایا ہے، کیا میری رسالت کے اقرار کے بغیر بھی اس کی تسکین کا اور کوئی سامان ہوسکتا ہے؟

فرط حیرت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ سارا وجود حقیقت کے بے نقاب جلوؤں میں شرابور ہو کے رہ گیا۔

جذبات کے ہیجان میں بے محابا چیخ اٹھے۔ اب مجھے کسی اور نشانی کا انتظار نہیں ہے۔ اپنی آنکھوں کے روزن سے جو ہزاروں میل کی مسافت پر پیش آنے والے واقعات کا تماشائی ہو یہ شان سوائے رسول برحق کے اور کس کی ہوسکتی ہے؟ کو عالم فانی کے مخفی امور کو بالکل مشاہدات کی طرح جانتا ہے اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنے میں اب کوئی تامل نہیں ہے کہ وہ عالم بالا کی حقیقتوں سے بھی یقیناً باخبر ہے۔

دل تو پہلے ہی مومن ہوچکا تھا اب زبان سے بھی اقرار کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور خدائے واحد کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔

اسلام کی تاریخ میں توحید ورسالت کا یہ پہلا اقرار تھا جو رسول اللہ ﷺ کی غیب دانی کے پس منظر میں منصۂ شہود پر آیا۔ اب ذرہ عقل نانجار کی فتنہ سامانی دیکھیے کہ جس عقیدے کو قبول کر کے تاریخ کا سب سے پہلا مسلمان عالم ظہور میں آیا وہی عقیدہ آج کے بداندیشوں کے تئیں حلقہ اسلام سے اخراج کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اور صرف ایک حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی نہیں تاریخ کے صفحات پر بے شمار ہستیاں ہیں جن کے اسلام کا محرک رسول پاک صاحب لولاک ﷺ کی غیب دانی ہے۔ سرکار ﷺ کا یہ وصف شریف کسی کی ذاتی سرگزشت تک محدود نہ تھا۔ بلکہ دنیائے عرب میں اس کی اتنی عظیم شہرت تھی کہ لوگوں میں اپنی عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں سرکار ﷺ سن نہ لیں۔

حضور ﷺ کی غیب دانی کے بارے میں مکے کے مشرکین کا عام عقیدہ تھا کہ کسی بھی واقعہ پر مطلع ہونے کے لیے انہیں کسی مخبر کی ضرورت نہیں ہے دیواروں کے ذرے اور راہ گزر کے سنگریزے انہیں خبر کر دیتے ہیں۔

اس ابوجہل کے متعلق یہ واقعہ عوام وخواص میں مشہور ہے کہ منصب رسالت کی آزمائش کے لیے وہ چند کنکریاں مٹھی میں چھپائے ہوئے حاضر ہوا اور کہا کہ اگر آپ رسول ہیں اور آسمان زمین کے اسرار کی خبر رکھتے ہیں تو بتایئے کہ میری بند مٹھی میں کیا ہے؟

ابوجہل جیسے شقی ومنکر کو بھی یہ اعتراف تھا کہ رسول کے لیے غیب دانی لازم ہے جو رسول ہوگا اسے زمین وآسمان کے اسرار کی یقیناً خبر ہوگی لیکن یہ آج کے کلمہ گو ہیں جو رسول پاک ﷺ کی غیب دانی کا انکار کرتے ہوئے ابوجہل سے بھی نہیں شرماتے۔

ایک وجود! دو حیرتوں کا مجموعہ

رجب کی 26 ویں تاریخ تھی۔ رات کے گیسو ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مکے کی ساری آبادی محوخواب تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں کائنات کا مرکز آج حضرت ام ہانی کے گھر میں منتقل ہوگیا تھا۔ درو دیوار سے حبیب کبریا ﷺ کے جلوہ کی روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی، رات کا محافظہ دستہ عالم بالا سے فرش گیتی کے لیے چلنا ہی چاہتا تھا۔ حجاب عظمت سے آواز آئی!

عرش کی قندیلوں کی روشنی تیز کردی جائے۔ جنتوں کی کائنات نئے ڈھنگ سے آراستہ کی جائے۔ قدم قدم پر تجلیات کی شمعیں روشن کردی جائیں۔ روش روش پر بہاروں کا خزانہ بکھیر دیا جائے۔ کوثر و تسنیم کی سعید موجوں پر نور کی کرن بچھادی جائے۔ حوران بہشت حسن مجرد کے شفاف آبگینوں سے حجابات کے پیراہن اتار دیں۔ ملکوت اعلیٰ کے تمام فرشتے اپنے اپنے آسمانوں پر قطار اندر کھڑے ہوجائیں۔ افلاک کے تمام سیارے ٹھہر جائیں۔ وقت کا قافلہ رک جائے۔ خیر مقدم کے لیے پیغمبران الوالعزم آسمانوں کی گزرگاہوں پر کھڑے ہوجائیں۔ فرش گیتی سے بہ ہزاراں جاہ و جلال آج میرا حبیب یہاں تشریف لا رہا ہے۔ وہی حبیب جو میرے دست قدرت کا نقش اول ہے۔ جسے میں نے اپنی ساری کائنات کا مختار عام بنادیا۔

فرمان سنتے ہی عالم قدس میں نورانی مسرتوں کا ایک سماں بندھ گیا۔ چشم زدن میں عالم بالا کا نقشہ بدل گیا۔ جنت کی سمٹی ہوئی بہاریں فضائے نور پر چھا گئیں۔ آسمان، صحراؤں پر تجلیات کے آئینے نصب کردیے گئے اور نوری کرنوں کا اعلان عرش کے بام و در پر چڑھا دیا گیا۔ مہتابی کنگروں پر پرچم کبریائی اس شان سے اڑایا گیا کہ سطوت جلال سے عرش کا پایا ہل گیا۔ جنتوں کی سرزمین پر بہاروں نے پھول برسائے، نظاروں نے منہ چوما، گل ریز تبسم نے موتی لٹائے۔ حسن بے نقاب نے چراغاں روشن کیا۔ روش روش نکھر گئی، چمن چمن سنور گیا اور شباب نور کے نئے پیکر میں جگمگاتی ہوئی حوریں قطار باندھ کر ہر طرف کھڑی ہوگئیں۔ دم کے دم میں قدم کا عالم لطیف بن سنور کر آراستہ ہوگیا۔ اتنے میں آسمانی دنیا کا دروازہ کھلا۔ تجلیات کے جلو میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آگے بڑھے۔ فضائے نور میں تیرنے والا براق نام کا ایک سیارہ آج ان کے ہمراہ تھا۔ آسمان کی بلندیوں سے اتر کر سیدھے وہ مکے میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لائے۔ آج ان کے آنے کا انداز ہمیشہ سے نرالا تھا۔ دروازے کے بجائے مکان کی چھت توڑ کر اندر داخل ہوئے۔

حبیب کبریا ﷺ محوخواب تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ دل جاگ رہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد حضرت جبرائیل آگے بڑھے اور اپنے کافوری لب محبوب کے پائے ناز سے مس کردیا۔ ٹھنڈک محسوس ہوتے ہی نشان قدرت کی نرگسی آنکھیں کھل گئیں۔ دریافت فرمایا! جبرائیل کیسے آنا ہوا؟

سفیر غیب نے جواب دیا! خدائے برتر کی طرف سے حریم عظمت پر تشریف ارزانی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ سارا عالم قدم بچھڑے ہوئے محبوب کے لیے چشم براہ ہے۔ وہ سرحد تجلیات جہاں وہم خیال کے پر جلتے ہیں۔ جہاں ملکوت اعلیٰ تک کی رسائی ناممکن ہے۔ آج وہاں آپ کو اسی لباس بشر میں خرام ناز فرمانے کی دعوت دی گئی ہے۔ حضور! تشریف لے چلیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری گزرگاہوں پر امیدوں کا ہجوم ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

چند ہی لمحے کے بعد خاکدان گیتی کا ایک بشر براق پر سوار ہوکر اس شان سے عالم قدس کی طرف روانہ ہوا، کہ ملکوت اعلیٰ کے مرسلین نیاز مند غلاموں کی طرح رکاب تھامے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

مسجد اقصیٰ میں انبیاء علیہم السلام سابقین کی ساری جماعتیں عقیدتوں کا خراج لیے حاضر تھیں، سرکار کی اقتداء میں نماز ادا کرکے سب کی امامت کبریا کے منصب کے ساتھ اپنی نیازمندی کا کھلا ہوا اعلان کیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر حضور آسمان کی طرف چلے۔ گزرگاہوں پر خیر مقدم کے لیے پیغمبران الوالعزم کھڑے تھے۔ ہر جگہ قدسیوں کے بیڑے سلامتی کے لیے جھکے ہوئے تھے۔ عرش الٰہی کی مانوس فضا میں داخل ہوتے ہی بیتے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ قدم پڑتے ہی عرش کا دل خوشی سے جھوم اٹھا پھر وہاں سے آگے بڑھتے، بڑھتے رہے۔ عالم ملکوت بھی پیچھے رہ گیا۔ پھر بڑھے، بڑھتے بڑھتے اب وہاں سے جہاں کی خبر کسی کو نہیں معلوم، ایک محبوب اپنے محب سے، ایک بندہ اپنے معبود سے کس طرح ملا؟ پایگاہ شہنشہی سے محبوب کو کیا خلعتیں عطا ہوئیں۔ یہ ساری تفصیلات صغیہ راز میں ہیں۔ صبح ہوئی تو سارے مکے میں شور برپا تھا۔ اہل یقین و خرد خدا کو دیکھنے والی آنکھوں پر نثار ہوگئے۔ لیکن نادانوں نے کہا۔ ایک بشر کے لیے عالم بالا کا سفر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ساری کہانی بالکل من گھڑت ہے۔ حیرت ہے کہ ایک پیغمبر کی زبان سے اس طرح کی انہونی بات سننے میں آرہی ہے۔ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے چند فرشتے یہ باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا۔

"تمہیں وہ رات یاد ہوگی۔ جس کی صبح کو عبداللہ کے آنگن میں نور کی بارش ہورہی تھی، زمین سے آسمان تک ہر عالم میں رحمت و مسرت کا جشن منایا گیا تھا۔ اور مکے کی ساری فضا فرشتوں کے پیروں سے چھپ گئی تھی۔ اس موقعہ پر جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سارا اہتمام محمد ﷺ کی تشریف آوری پر ہو رہا ہے تو کچھ فرشتوں کو کتنی حیرت ہوئی تھی کہ عالم قدس کا پروردہ ناز اس ظلمت کدہ خراب میں کیونکر تشریف لاسکتا ہے؟ اور آج جب وہ اپنی مانوس دنیا

کی طرف چند لمحے لے لیے واپس تشریف لے گئے تو بنی نوع انسان کے یہ نادان افراد حیرت سے واقعہ کا انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں جہاں اسی واقعہ پر گواہ ہیں۔ محمد ﷺ کی یہ شان بھی عجیب ہے۔ وہ یہاں آئے تو فرشتوں کو حیرت اور یہاں سے جائیں تو انسانوں کو حیرت۔ ان کی ذات حیرتوں کا مجموعہ ہے۔

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں　　　ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

عرش الٰہی کے سایہ میں ملائکہ مقربین سر جھکائے کھڑے تھے۔ حجاب عظمت سے آواز آئی۔

ملاءِ اعلیٰ کے تمام فرشتے آج کی رات میں جمع ہو جائیں۔ وہیں جہاں ہمارے جلال و جبروت کا گھر ہے جو اہل زمین کا قبلہ عبادت ہے۔

آج باعث ایجاد عالم کا ظہور ہونے والا ہے۔ مشرق و مغرب، بحر و بر اور تمام اقطار ارضی میں منادی کر دی جائے۔ کہ کونین کا تاجدار آ رہا ہے۔ اس کے خیر مقدم کے لیے اپنی نگاہوں کا فرش بچھائے رکھئے۔ مکہ کی وادیوں، ام القریٰ کے کہساروں اور حرم کے بام و در پر چمنستان فردوس کی بہاروں کا غلاف چڑھا دیا جائے۔ سیارہ افلاک کے پہرہ داروں سے کہہ دو کہ اس وقت آج آفتاب کے چہرے سے نقاب اٹھائیں جب تک خسرو کائنات کی طلعت زیبا سے خاکدان گیتی کا ذرہ ذرہ منور نہ ہو جائے۔

ستاروں کی انجمن میں اعلان کر دو کہ آج کی رات کے پچھلے پہر اپنی مجلس شبینہ برخاست کر کے فرش زمین پر اترتے رہیں۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے کنگرہ عرش سے لیکر گل کدہ فردوس تک کی ساری زیبائیاں وادی حرم میں سمٹ کر آ گئیں۔

جیسے ہی صبح صادق کا اجالا چمکا۔ مکہ کی فضاء رحمت و انوار سے بھر گئی۔ نقیبوں کی صداؤں سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ گلی گلی حوراں خلد کے آنچلوں کی خوشبو سے معطر ہو گئی۔

جبرائیل امین ایک سبز پرچم لے کر خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور حضور شاہی میں سلامی پیش کی۔

الصلوٰۃ والسلام یا محمد ، الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ،

الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

اس صدائے سلام و تہنیت پر تمام ملائکہ سروقد کھڑے ہو گئے۔ حرم کی جھکی ہوئے دیواریں ایستادہ ہو گئیں۔ امیر کشور نبوت کی سواری اس دھوم سے آئی کہ صدائے مرحبا سے اکناف عالم گونج اٹھے۔

حضرت روح الامین کی زبان سے جائے محمد کا مژدہ سن کر ایک فرشتہ نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔

تم لوگ جانتے ہو۔ محمد ﷺ کون ہیں؟ جس کی آمد پر زمین سے لے کر آسمان تک اتنا کر اہتمام اور شکوہ جلال کا ایک عالم آباد ہو گیا۔

ساتھیوں نے جواب دیا۔ اس کائنات میں کون سی مخلوق ہے جو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہیں جانتے۔ عرش کی چھاؤں میں لاکھوں برس بیت گئے۔ اور تمہیں اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ محمد ﷺ کون ہیں، بڑے تعجب کی بات ہے۔

فرشتہ نے کہا! وہ محمد ﷺ جن کا نام عرش الٰہی کے بام و در پر کندہ ہے اور جس کے نور سے ہماری پیشانیاں تابندہ ہیں۔ بھلا انہیں کون نہیں جانتا، بلکہ وہ تو چراغ انجمن ہیں۔ معاذ اللہ! یہ بات بھی پوچھنے کی تھی۔

فرشتے نے جواب دیا! پوچھنے کی وجہ حیرت ہے، اور وہ محتاج بیان نہیں۔

تم ہی سوچو! وہ محمد ﷺ نور مجرد سے جن کا عنصر تیار ہوا اور کنز مخفی میں جن کی نشو و نما ہوئی اور اب جس کے دم سے نورانیوں کا عالم آباد ہے۔ وہ دیار نور ہے۔ اس جہاں تاریک میں کیونکر آ سکتے ہیں۔ آ کر ہم کیسے باور کر لیں کہ وہ محمد ﷺ کہ جن کے رخ کی روشنی میں ہم لوح محفوظ کے کے نوشتے پاتے ہیں وہ یہاں آ گئے۔ کیا عرش کی قندیلیں بے نور ہو گئیں۔ یا کرہ ارض جو کائنات کا سب سے نچلا طبقہ ہے اور محمد ﷺ جس کے قدم کے قریب عالم امکان کی بلندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ دونوں میں کیا جوڑ ہے۔ عالم نور کا پروردہ ناز اس ظلمت کدہ خراب میں آ کر کسے یقین آ سکتا ہے۔

ساتھیوں نے جواب دیا! ویسے بات تو واقعی حیرت انگیز ہے۔ لیکن غلط نہیں ہے۔ یقین کرو۔ ان کی تشریف آوری امر واقعہ ہے۔ وہ نہ آتے تو اتنا اہتمام کس کے لیے ہوتا؟

حضرت روح الامین کعبہ کی چھت پر کھڑے کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا! آخر اس میں بحث و تکرار کی کونسی بات ہے۔ ہاں وہی محمد ﷺ تشریف لائے ہیں جو مسند نشین عرش ہیں۔ لیکن یقین نہ آنے کی وجہ! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ خدائے ذوالجلال نے عرش و فرش کی مملکت انہیں بخش دی ہے۔

ایوان شاہی کا شکوہ جلال مسلم! مگر مملکت کی سود اگر آبادیوں میں قدم رنجہ فرمانا عظمت شاہی کے خلاف کب ہے؟ اب تک ملاء اعلیٰ مرکز توجہ تھا۔ اب خاکدان گیتی کا طالع قسمت اوج پر ہے۔ اب تک یہ شمع تجلی عرش کی انجمن میں فروزاں تھی۔ اب فرش کا شبستان روشن ہو گیا۔

اور تمہارا یہ استعجاب! کہ عالم نور کا لطیف پیکر ظلمت کدہ میں کیوں کر آ سکتا ہے؟ خود باعث تعجب ہے۔

دور کیوں جاؤ، خود اپنا ہی حال دیکھ لو۔ یہ لطیف پیکر اسی وقت کس عالم میں ہے، عالم گیتی کی عمر کے لحاظ سے ابھی چند ہی صدیوں کی تو بات ہے۔ جب محکمۂ اجل کے فرشتے انسانوں کی روح قبض کرنے بشر کے مثال پیکر میں یہاں آئے تھے۔

میں خود حضرت مسیح علیہ السلام کی رووح پھونکنے جب حضرت مریم کے پاس آیا تھا تو میرا مثال پیکر ایک بشر ہی کا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔ کہ عالم قدس سے کسی نوری مخلوق کا بشری لباس میں آنا یہاں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ بلکہ قطعاً واقع بھی ہے۔

جلوؤں کی وادی

مکے سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ نام کی وادی تاریخی عظمتوں کی ایک بہت بڑی جلوہ گاہ ہے۔ عشق و ایمان کی بہت سی جاں فروز کہانیاں اس کے دامن سے وابستہ ہیں۔

کہتے ہیں کہ سرکار ابد قرار ﷺ 6 ہجری میں اپنے پندرہ جانثارون کے ساتھ طواف کعبہ کی نیت سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے جب مکہ چند میل رہ گیا تو حدیبیہ نام کی ایک وادی میں قافلے کے ٹھرنے کا حکم صادر فرمایا۔ وہیں پر یہ خبر موصول ہوئی کہ کفار مکہ نے طے کرلیا ہے کہ وہ شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

یہ اطلاع پانے کے بعد سرکار نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، کو ہدایت فرمائی کہ وہ مکہ والوں سے جاکر کہیں کہ ہم لوگ جنگ کی نیت سے نہیں آئے ہیں، صرف عمرہ کر کے یعنی صفا و مروہ کی سعی اور خانہ کعبہ کا طواف کر کے لوٹ جائیں گے۔ بے خطر ہمیں حرم میں آنے کی اجازت دیں۔

سرکار ﷺ کا یہ پیغام لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، مکے کے لیے روانہ ہوگئے، شہر پہنچ کر انہوں نے سرادار مکہ سے ملاقات کی، اور انہیں ساری تفصیل بتائی۔ لیکن وہ ضد پر اڑے رہے۔

ابھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مکے ہی میں تھے کہ قافلے میں یہ خبر اڑی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کفار مکہ نے شہید کردیا۔ اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی صحابہ کرام میں سخت اضطراب و ہیجان برپا ہوگیا۔ صحابہ کرام کی بے تابی دیکھ کر سرکار نے ایک درخت کے نیچے سب کو جمع کیا اور اس بات پر ایک شخص سے عہد لیا کہ اگر یہ خبر صحیح ہوئی تو خون عثمان کا انتقام لینے کے لیے جان تک کی بازی لگادی جائے گی۔

ویسے سرکار دو عالم ﷺ سے یہ حقیقت مخفی نہیں تھی کہ یہ خبر غلط ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زندہ سلامت ہیں۔ جیسا کہ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ سرکار دو عالم کے ہاتھ پر جب سب لوگ بیعت کرچکے تو آخیر میں حضور ﷺ نے اپنے ایک دست کریم کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ پر ان کا ہاتھ رکھ کر ان کی طرف سے بیعت لی۔ اگر حضور ﷺ کے علم میں وہ زندہ نہ ہوتے تو ہرگز انہیں بیعت میں شریک نہ فرمایا جاتا۔ کیونکہ وفات یافتہ آدمی سے کسی معاہدہ پر اقرار لینا قطعاً بے معنی ہے۔

اس موقعہ پر بعض صحابہ کرام نے نہایت حسرت کے ساتھ یہ کہا کہ حضرت عثمان ہم سے پہلے مکہ پہنچ گئے یقیناً انہوں نے خانہ کعبہ کا طواف کرلیا ہوگا۔

حضور نور ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عثمان بغیر ہمارے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کریں گے۔

صحابہ کرام نے پھر دریافت کیا کہ آخر کون سی چیز انہیں طواف سے مانع ہوگی جبکہ وہ حرم میں داخل ہوگئے ہیں۔ حضور ﷺ نے جواب دیا۔ ان کا جذبہ اخلاص کبھی انہیں اجازت نہیں دے گا کہ وہ بغیر ہمارے طواف کریں گے۔

چنانچہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ واپس لوٹے تو صحابہ نے ان سے کہا کہ آپ نے تو خدا کے گھر کا طواف کرلیا ہوگا۔ یہ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ عشق و ایمان کا جذبہ اخلاص انگ انگ سے پھوٹ پڑا ابھرے ہوئے جذبات میں یہ جواب دیا۔

میرے ساتھ اس سے زیادہ سخت بدگمانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں بغیر رسول اللہ ﷺ کے خدا کے گھر کا طواف کرلیتا۔ خدا کا گھر تو پہلے سے موجود تھا لیکن گھر کی چوکھٹ پر رہتے ہوئے بھی گھر والے سے ہمارا کا رشتہ تھا؟ عرفان خداوندی کا یہ سارا تقرب تو رسول ہی کا عطا کیا ہوا ہے انہی کے دم قدم سے خدا کے ساتھ ہماری روحوں کا شرشتہ وجود میں آیا۔ بھلا میں انہیں چھوڑ کر کس منہ سے دربار خداوندی کا رخ کرتا۔

قسم خدا کی ایک سال بھی اگر مجھے انتظار کرنا پڑتا تو میں اپنے رسول کے انتظار میں ایک سال تک بھی خانہ کعبہ کا طواف ملتوی رکھتا۔ قریش کے سرداروں نے بار بار مجھے اصرار کیا کہ میں خانہ کعبہ تک آگیا ہوں تو طواف کرلوں، لیکن میں نے ہر بار انکار کیا کہ اپنے رسول کے بغیر میں ہرگز طواف نہیں کروں گا چاہے خانہ کعبہ میرے پیش نظر ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، کے اس جواب نے خانہ خدا اور حبیب خدا ﷺ کا فرق اتنا واضح کردیا ہے کہ مظاہر خداوندی میں رسول کی حیثیت سمجھنے کے لیے اب فکر و نظر کا کوئی حجاب نہیں رہا۔ اب یہ راز پوری طرح واشگاف ہوگیا کہ خداشناسی کی منزل میں رسول عربی ﷺ کا مقام عرفان کیا ہے؟ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا یہ مشرب کچھ ان کی ذات کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے یہ وجہ بتا کر کہ ان کا جذبہ اخلاص کبھی اجازت نہیں دے گا کہ وہ میرے بغیر طواف کرلیں، واضح کردیا کہ عشق و ایمان کا مزاج ہی یہی ہے۔ (صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ وبارک وسلم)

عشق اخلاص کی ارجمندی

کہتے ہیں کہ غزوہ خیبر کے موقعہ پر "اسود راعی" نام کا ایک شخص تھا۔ یہ ایک حبشی غلام تھا جو یہودیوں کے مویشی چرایا کرتا تھا۔ صحرا سے اس قدر مانوس تھا کہ اپنے وقت کا اکثر حصہ وہیں گزارتا تھا۔ ایک دن شام کو آبادی میں پلٹ کر آیا تو دیکھا کہ سارے یہودی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں تلواروں پر پانی چڑھایا جا رہا ہے نیزے اور تیروں کی نوکیں صیقل کی جا رہی ہیں جگہ جگہ سپاہیوں قطار کھڑی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی اس نے متعجبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"یہ کس سے جنگ کی تیاری ہو رہی ہے؟ "

یہود نے جواب دیا۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ عرب کے نخلستان میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو نبوت کا مدعی ہے اپنے ساتھ دیوانوں کی ایک فوج لے کر وہ فلاں مقام پر ٹھرا ہوا ہے اس کے ساتھ ہم مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ امروز فرداد میں اس کی فوجیں ہمارے قلعہ قلعہ کی فصیل تک پہنچنے والی ہیں۔

یہ جواب سن کر چرواہے کے لاشعور میں اچانک جستجوئے شوق کا ایک چراغ جل اٹھا اور وہ حقیقت سے قریب ہو کر سوچنے لگا۔ بلاوجہ کوئی دیوانہ نہیں ہوتا وہ بھی دیوانوں کی ایک فوج جو جان دینے کے لیے ساتھ آئی ہے یہ بادہ قریب کی متوالی نہیں معلوم ہوتی یہ کشش صرف جمال حق کی ہے۔ ہو نہ ہو انہوں نے سچائی کا بے نقاب چہرہ دیکھ لیا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے دفعتاً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ "یقیناً وہ ایک سچا پیغمبر ہے یہ کہتے ہوئے اٹھا اور بکریوں کو ساتھ لیتے ہوئے بیخودی کے عالم میں ایک طرف چل پڑا۔ "

بالآخر وہ سراغ لگاتے مدنی سرکار کے لشکر میں پہنچ گیا۔

حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس نے پہلا سوال یہ کیا۔

" آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟

حضور ﷺ نے اس کے دل کشور کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"اس بات کی کہ اللہ واحد لاشریک ہے اس نے اپنے بندوں کو ہدایت کے لیے نبیوں اور رسولوں کا ایک طویل سلسلہ دنیا میں قائم فرمایا جس کی آخری کڑی میں ہوں۔

اس نے پھر دریافت کیا۔ اگر خدائے ذوالجلال پر ایمان لاؤں اور آپ کی نبوت کا اقرار کر لوں تو اس کا صلہ کیا ملے گا؟

فرمایا "عالم آخرت کی دائمی آسائش"

پھر اس نے جذبہ شوق میں بے قابو ہو کر تیسرا سوال کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! میں حبشی نژاد ہوں میرے جسم کا رنگ سیاہ ہے۔ میرا چہرہ نہایت بدشکل ہے، میں ایک صحرا نورد چرواہا ہوں، میرے بدن سے پسینے کی بدبو نکلتی ہے۔ اگر میں بھی آپ کے دیوانوں کی فوج مین شامل ہو کر راہ خدا میں قتل ہو جاؤں تو کیا مجھے جنت میں داخلے کی اجازت مل سکے گی؟

ارشاد فرمایا۔ "ضرور ملے گی۔"

یہ سنتے ہی وہ بیخود ہو گیا اور اسی عالم میں کلمہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس کے بعد حضور ﷺ سے اس نے بکریوں کی بابت دریافت کیا۔

ارشاد فرمایا۔ "دوسرے کی چیز ہمارے لیے حلال نہیں ہے۔ انہیں قلعہ کی طرف لے جائو اور کنکر مار کر ہنکا دو۔ یہ سب اپنے مالک کے پاس چلی جائیں گی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ولولہ شہادت کے ہیجان سے ایک لمحہ قرار نہیں تھا۔ فوراً الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا اور مجاہدین اسلام کی صفوں میں شامل ہو گیا۔

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے دن جب میدان جنگ میں سپاہیوں کی قطار کھڑی ہوئی تو جذبہ شوق کا اضطراب اس کے سیاہ شہرے شبنم کے سفید قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ طبل جنگ بجتے ہی اس کے ضبط و شکیب کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ایک بیتاب دیوانے کی طرح دشمنوں کی یلغار میں کود پڑا۔

اس کے سیاہ ہاتھوں مین چمکتی ہوئی تلوار کا منظر ایسا دلکش معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلی تڑپ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ نہایت بے جگری کے ساتھ اس نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ زخموں سے سارا جسم لہولہان ہو گیا تھا۔ لیکن شوق شہادت کے نشے میں وہ دشمن کی طرف بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ چاروں طرف سے اس پر تلوار ٹوٹ پڑیں۔ اب وہ نیم جان ہو کر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اور گھائل جسم میں اس کی روح مچل رہی تھی کہ اب جنت کا فاصلہ بہت قریب رہ گیا تھا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب اس کی نعش حضور ﷺ کے سامنے لائی گئی تو اس کے فیروز بخت انجام پر سرکار کی پلکیں بھیگ گئیں۔

فرمایا "اسے جنت کی نہر حیات میں غوطہ دیا گیا۔ اب اسے کے چہرے کی چاندنی سے فردوس کے بام و در جگمگا اٹھے ہیں۔ اس کے پسینے کی خوشبو میں حوران بہشتی اپنے آنچل بسا رہی ہیں۔ جنت کی دو حسین حوریں اسے اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے باغ خلد کی سیر کرا رہی ہیں۔ سبحان اللہ!"

سرکار ﷺ کے اس بیان پر بہت سے صحابہ کرام کے قلوب رشک سے مچل گئے۔ اس کی فیروز بختی پر سب محو حیرت تھے کہ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے اور کوئی عمل خیر نہیں کیا تھا۔ اس کے نامہ عمل میں نہ ایک وقت کی نماز تھی، نہ ایک سجدہ تھا۔ سفید و شفاف کفن کی طرح زندگی کا سادہ ورق لیے ہوئے گیا اور بڑے بڑے زہدان سب زندہ دار کے پیچھے چھوڑ گیا۔

سچ کہا ہے عارفان طریقت نے کہ عشق و اخلاص کی ایک جنون انگیز ادا ہزار برس کی بے ریا عبادتوں اور حسنات کے بے شمار ذخیروں پر بھاری ہے۔ یہی وہ سکہ رائج الوقت ہے جس میں آج تک کہیں بھی کھوٹ نہیں نکلا۔ اور کسی عالم میں بھی اس کے نرخ کے سطح نیچے نہیں اتری۔ جذب عشق کی ایک ہی جست نے عالم اسفل کے خاک زادوں کو بام عرش تک پہنچا دیا۔ اور محبت ہی کا گداز تھا جس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر اپنی شوکتوں کے پرچم لہرائے اور روئے زمین کی بڑی سے بڑی عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا۔

عشق و ایمان کا کردار

اسی وادی میں عقیدت وعشق کا ایک اور نہایت رقت انگیز واقعہ پیش آیا۔ سہل ابن عمرو قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر سرکار ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی جب باتیں طے پا گئیں تو اب انہیں قید تحریر لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سرکار ﷺ نے حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کو صلحنامہ کی عبارت لکھنے کے لئے بلایا۔ وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ کے بعد حضور ﷺ نے صلحنامہ کی عبارت کا یوں افتتاح کیا۔

هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ. یہ وہ نکات ہیں جن پر محمد رسول اللہ ﷺ نے مصالحت فرمائی۔ اتنا ہی فقرہ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ لکھنے پائے تھے کہ سہیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کاغذ ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔ اس پر ایسی کوئی عبارت نہیں لکھی جا سکتی جس سے فریقین میں سے کسی کو اختلاف ہو۔ ہم آپ کو اگر رسول اللہ ہی تسلیم کر لیتے تو اس مصالحت ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ اس لئے آپ معاہدے کی عبارت سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیجئے اور اس جگہ ابن عبداللہ لکھوایئے۔"

حضور نے یہ سوچ کر کہ مصالحت میں کوئی رخنہ نہ واقع ہو حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ رسول اللہ کا لفظ مٹا دو اور اس کی بجائے ابن عبداللہ لکھ دو۔

بارگاہ رسالت ﷺ میں حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کا جذبہ اطاعت شعاری محتاج بیان نہیں ہے مقام صہبا میں آپ کا یہ واقعہ ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ نے سرکا ﷺ کے خواب ناز پر اپنی نماز جیسی متاع گرانمایہ کو نثار کر دیا تھا جب کہ حضور ﷺ آپ کے زانوئے اطہر پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے جس کے احساسِ ادب کی نزاکتوں کا یہ عالم ہو کہ کچی نیند محبوب کا اٹھ جانا بھی اسے گوارا نہ ہو اس کے دل نیاز مند کی فداکاریوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ لیکن حدیبیہ کے چشم دید گواہوں کی زبانی یہ معلوم کر کے سکتہ طاری ہو گیا کہ انہی حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کو جب حجور نے یہ حکم صادر فرمایا کہ "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دو تو ان کا جذبہ عقیدت اس حکم کی تاب نہ لا سکا اور فرط الم سے دل کو ایسی ٹھیس لگی کہ جذبات قابو سے باہر ہو گئے۔

ایک ٹوٹ جانے والے گھائل کی طرح مچلتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

وَاللّٰهِ لَنْ اَمْحُوکَ اَبَدًا۔ قسم خدا کی میں ہرگز آپ کو نہیں مٹاؤں گا مقام صلح وانکسار میں حضور ﷺ اسے گوارا کر لیں تو کر لیں، لیکن گدایاں عشق اسے اپنے جذبہ ایمان کی توہین سمجھتے ہیں قدم قدم پر مرمٹنے والے یہ سننے کی بھی تاب نہیں رکھتے کہ محبوب کے اسم اعظم کا نقش مٹا دیا جائے۔

سہل ابن عمرو کے اصرار پر جب حضور ﷺ نے دوبارہ کہا تو غیرت جلال سے حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور حالت اضطراب میں اپنی تیغ ذوالفقار کے قبضے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتے تھے کہ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا اور خود ہی اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ کا لفظ مٹا کر اس کی جگہ "ابن عبداللہ لکھ دیا"۔

عقل انسانی اس مقام پر حیران و ششدرہ گئی کہ وہ نبی امی جسے کبھی نوشت وخواند کا سابقہ نہ پڑا اس نے کیونکر ایک لفظ کو پڑھ کر مٹایا اور اس کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا۔

حضرت امام قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی توجیہہ یوں فرمائی ہے کہ یہ سب کچھ معجزہ کے طور پر حضور ﷺ سے صادر ہوا۔

حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کا یہ انداز جواب منزل عشق عرفان کے مسافروں کے لئے ایک بہترین مشعل ہے۔ اس کی روشنی میں ہمیں اس کی حقیقت کا سراغ آسانی سے مل جاتا ہے کہ مدنی سرکار ﷺ مقام انکسار میں اپنے لئے جو بات پسند فرمائیں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی اپنے سرکار کے لئے اسی رخ پر سوچیں یہ ان کا مقام تواضع ہے کہ اپنے خاک نشینوں سے ملنے کے لئے وہ فراز عرش سے نیچے اتر آتے ہیں لیکن ہمارا منصب غلامی ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے یہ تو سرتاسر ہمارے ہی محسوس کرنے کی چیز ہے۔

پس سرکار ﷺ کے تواضع پسند ارشادات کو بنیا بنا کر جو لوگ حضور ﷺ کی حقیقی عظمتوں کا انکار کر بیٹھتے ہیں حضور ﷺ کے ساتھ اپنی ہمسری کا خواب دیکھنے لگتے ہیں انہیں حضرت مولائے کائنات سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل میں اسلام و ایمان کا مزاج سمجھنے لے لئے بہت واضح اشارات ہیں۔

یہ شاعری نہیں امر واقع ہے کہ سرکار انور ﷺ کا لعاب دہن رحمت ونور کا ایسا قطرہ سیال تھا جس سے خود زندگی آسودہ ہوئی فیضان الٰہی کے اس آبشار سے جہاں ایک قطرہ ٹپکا ہر طرف رحمت و اعجاز کے جلوے بکھر گئے۔

کہیں جلتے ہوئے زخموں کو گل ولالہ کی ٹھنڈک میسر آئی۔اور کہیں آب شور کا ذخیرہ ایک آن میں چشمہ شیریں بن گیا۔حلق کے نیچے اترا نہیں کہ شیر خوار بچے دن بھر کے لئے ماؤں کے دودھ سے بے نیاز ہو گئے۔

اس اعجاز سراپا کی کس کس خوبی کا ذکر کیجئے گزرنے والا کب کا گزر چکا لیکن راہیں آج تک معطر ہیں۔دیکھنے والے نے جس رخ بھی دیکھنے کی کوشش کی انگشت بدنداں رہ گئے۔

کہتے ہیں سرکار ﷺ کے لعاب دہن کی برکتوں سے مدینے کے بچے تک اتنے مانوس و باخبر تھے کہ ایک بار مجلس اقدس میں کسی نے دودھ کا پیالہ پیش کیا سرکار کی داہنی طرف ایک خورد سالہ بچہ بیٹھا ہوا تھا کہ بائیں طرف سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر مشاہیر صحابہ کرام تشریف فرما تھے۔

حضور ﷺ کی عادت کریمہ تھی کہ ہر کام داہنی طرف سے شروع فرماتے تھے یہاں تک کہ اپنے پس خوردہ تبرکات کی تقسیم کرنا چاہا داہنی طرف بیٹھے ہوئے بچے کی طرف نظر پڑی۔حضور ﷺ نے اس بچے سے دریافت فرمایا۔

"میری مجلس کے دستور کے مطابق حق تو تمہیں کو پہنچتا ہے کہ دودھ کی تقسیم کا سلسلہ تم سے شروع کیا جائے لیکن اگر تم اپنے بزرگوں کے حق میں ایثار کو سکو تو اجازت دو کہ بائیں طرف جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ان سے تقسیم کا آغاز کروں۔"

بچے نے سر جھکا کر انتہائی ادب سے جواب دیا۔یا رسول اللہ ﷺ ! کوئی بات ہوتی تو اپنے حق سے دستبردار ہونے میں مجھے کوئی عذر نہ تھا لیکن یہ ایثار میرے لئے بہت مشکل ہے کہ سرکار کا لعاب دہن پیالے کے جس حصے سے مس ہو گیا ہے اس کی برکتوں سے میں اپنے آپ کو محروم رکھوں۔

حضور ﷺ نے بچے کی اس خوش عقیدگی کو پیار کی نظر سے دیکھا۔اس کا حق بھی اسے عطا کیا اور فضل و برکت کی دعاؤں سے الگ اسے نوازا۔

کہتے ہیں کہ سرکار ﷺ کے لب کی مسیحائی نے بیماروں اور زخمیوں کو شفاخانوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔احادیث و سیرت کی کتابوں میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ عین میدان جنگ میں کسی کی آنکھ نکل آئی،کسی کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہو گیا۔کوئی زخموں کی ٹیس سے تڑپ رہا ہے ناگہاں سرکار کو اطلاع ہوئی آپ تکلیف کے مقام پر لعاب دہن مس کرتے ہی نہ تکلیف رہی نہ زخم کا کوئی نشان موجود تھا۔

چنانچہ جنگ خیبر کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ کئی دن تک لگاتار حملوں کے بعد بھی جب خیبر کا قلعہ فتح نہیں ہوا تو شام کے وقت سرکار انور ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ارشاد فرمایا۔

" کل صبح کو میں اسلامی لشکر کا جھنڈا اس شخص کے حوالے کروں گا جو اللہ کو دوست رکھتا ہو اور کل کی فتح اس کے ہاتھ پر مقدر ہو چکی ہو۔"

یہ مژدہ جانفزا سن کر ہر شخص کا جذبہ شوق میں بھر گیا۔یہ دونوں جہاں کے اعزاز کی سب سے گراں مایہ بشارت تھی۔روحوں کے خوابیدہ ولولے اس طرح جاگ اٹھے کہ صبح کی سعادت کے انتظار میں آنکھوں کی نیند اڑ گئیں۔آرزوئے شوق کی بیقراری میں دل کا کشور تہ وبالا ہونے لگا۔ہر مجاہد اپنے اپنے تئیں اس قابل رشک اعزاز کا امیدوار تھا۔جب صبح امید طلوع ہوئی تو سارے تمنائی بارگاہ رسالت میں سر کے بل حاضر ہوئے۔سارا مجمع گوش بر آواز تھا کہ دیکھنا ہے کہ آج کس کا مقدر جاگتا ہے۔کس کے نصیبے کی ارجمندی آسمان کے کنگروں سے آنکھ لڑاتی ہے۔انتظار شوق کی بے تابیوں کا یہی عالم تھا کہ سرکار نے شمع رسالت کے ان وفا کیش پروانوں کو ایک ایک بار آنکھ اٹھا کر دیکھا اور ارشاد فرمایا۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں" کسی نے جواب دیا وہ آشوب چشم کی تکلیف میں مبتلا ہیں اس لئے حاضر نہیں ہو سکے فرمایا اسی حالت میں اسے بلوایا جائے۔

جیسے ہی وہ دربار میں حاضر ہوا سرکار ﷺ نے انہیں قریب بلایا تکلیف کی شدت سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں حضور ﷺ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں پر لگا کر یہ حکم سنایا۔

اسلامی لشکر کا فرخندہ فال پرچم تمہارے حوالے کرتا ہوں خیبر کی فتح آج تمہارے ہاتھ پر مقدر ہو چکی ہے خدائے قدیر تمہیں میدان جنگ سے فائز المرام واپس لائے۔

واقعات کے راوی بتاتے ہیں کہ لعاب دہن لگاتے ہی دم میں ساری تکلیف رفع ہو گئی۔نہ آنکھوں میں سرخی تھی نہ ورم کا کوئی نشان موجود تھا۔

پھر مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ کیا کہنا۔اس نیستان ہستی میں وہ شیر خدا تھے۔ویسے ہی صحراؤں اور پہاڑوں میں ان کے زور بازو اور سطوت جلالت کا ڈنکا بجتا تھا اور آج تو ان کے حوصلوں کے جبروت کا عالم ہی اندازے سے باہر تھا۔کونین کے سلطان نے خود اپنے فیروزمند ہاتھوں سے اس پیشانی پر فتح

کا سہرا باندھا تھا۔ حملے کی پہلی یلغار میں خیبر کا وہ مایہ ناز قلعہ فتح ہوگیا اور یہودیوں کو ایسی عبرتناک شکست ہوئی کہ ہمیشہ کے لئے وہ ذلتوں کی خاک میں سوگئے۔

اس واقعہ میں ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ رسول اقدس ﷺ کے متعلق جو لوگ کہتے ہیں کہ انہیں غیب کا علم یا آئندہ کی خبر نہیں ہے وہ سخت غلطی پر ہیں سرکار ﷺ کو آئندہ کی خبر نہ تھی تو یہ کیسے فرمایا کل میں ایسے شخص کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ پر قلعہ فتح ہوجائے گا۔
یہی نہیں بلکہ احادیث میں اس طرح کے بے شمار واقعات موجود ہیں جس میں حضور ﷺ نے آئندہ کی خبر دی ہے اور حضور ﷺ کی خبر کے مطابق یہ واقعہ پیش آیا۔ سورج پر کہاں تک کوئی خاک ڈال سکتا ہے۔

لعاب دہن کے اعجاز و برکت کے سلسلہ میں ایک واقعہ بھی منقول ہے کہ ایک صحابیِ رسول ﷺ نابینا ہوگئے تھے یہاں تک کہ آنکھوں کی سیاہ پتلی بالکل سپیدی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

صحابہ کرام کے عام دستور کے مطابق ایک دن وہ بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور اپنی شکایت پیش کی۔ ان کی فریاد سن کر حضور ﷺ کا دریائے جوش کرم میں آگیا اٹھے اور اپنا لعاب دہن اُن کی آنکھوں میں لگا دیا۔ اس کے بعد واقعہ کے راوی بیان کرتے ہیں۔

لعاب دہن کی برکت سے وہ بینا ہوگئے اور یہ بینائی اخیر عمر تک قائم رہی۔ یہاں تک کے میں نے دیکھا کہ اسی برس کے بڑھاپے میں بھی وہ سوئی کے ناکے میں دھاگہ ڈال لیا کرتے تھے۔

ماتم ہے ان حضرات کی عقل و بصیرت پر جو ایسے سراپا اعجاز پیغمبر ﷺ کو اپنی طرح معمولی بشر کہتے ہیں اور انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔
ذہن کا یہ ناپاک تصور تنہا دونوں جہاں کی ذلت و رسوائی کے لئے کافی ہے۔ خدا ان گمراہوں کے شر سے اپنے رسول کی وفادار امت کو بچائے۔

شوکت اقتدار

آج ہجرت کی رات تھی۔ سارے قبیلے کے نمائندہ کفر تیغ بے نیام لئے انتظار میں کھڑے تھے۔ اسی رسول رحمت کے انتظار میں جو انہیں ہلاکت وتباہیہ کے دھانے سے آسائش دوام کی ٹھنڈی چھاؤں میں واپس لانا چاہتا تھا۔ اچانک پچھلے پہر کا شانہ نبوت کا دروازہ کھلا۔ ایک کرن چمکی، اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ خدا کا حبیب مسکراتا ہوا باہر نکلا اور تلواروں کے سائے سے گزر گیا۔ سحر کے اجالے میں صحرائے کفر کے خونخوار درندے جب دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے تو یہ معلوم کر کے حیرت سے وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے کہ پیغمبران کی پلکوں کے نیچے سے گزر گیا اور انہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ ہزار تیاریوں کے باوجود زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کا مصرف حاصل نہیں ہو سکا۔ قبائلی عرب کے مشترک محاذ پر آج شکست فاش سے رہبران کفر تلملا کے رہ گئے۔ فوراً ہی دارالندوہ مین مشاورت کی مجلس منعقد ہوئی اور طے پایا کہ ابھی محمد ﷺ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اگر تعاقب کیا جائے تو آسانی سے انہیں پکڑا جا سکتا ہے، کچھ ہی لمحے کے بعد مکے کی گلیوں میں اعلان ہو رہا تھا کہ محمد ﷺ کو جو بھی گرفتار کر کے لائے گا۔ اسے انعام میں سرخ اونٹ دیئے جائیں گے۔

عرب کے مانے ہوئے شہسوار سراقہ کے کان میں جونہی اس اعلان کی خبر پہنچی وہ انعام کے لالچ میں اس مہم کو سر کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ فوراً ہی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوئے، بھاگ سنبھالی اور دم کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دور چلنے کے بعد انہیں مدینے کے راستے پر دو جھلملاتے ہوئے سائے نظر آئے۔ خوشی سے چہرہ دمک اٹھا۔ سرخ اونٹوں کی قطار تصویر میں رینگنے لگی۔ فرط مسرت میں گھوڑی کی مہمیز لگائی اور ہوا سے باتیں کرتے ہوئے آن کی آن میں قریب پہنچ گئے۔

خدا کی آکری پیغمبر ﷺ اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناقہ پر سوار مدینے کی طرف تیز تیز بڑھتا جا رہا تھا۔

سراقہ نے کمنڈ ڈالنے کے لئے جونہی قدم آگے بڑھایا۔ ایک پر جلال آواز فضا میں گونجی۔ یَا اَرْضُ خُذِیْہِ۔

فرمانروائے کونین کا حکم تھا، گیتی کا کلیجہ ہل گیا۔ فوراً زمین شق ہو گئی اور سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں گھٹنے تک دھنس گیا۔ سراقہ نے ہزار کوشش کی۔ لیکن زمین کی گرفت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ جب عاجز و مجبور ہو گئے تو دو عالم کے تاجدار سے رحم کی درخواست کی۔ سرکار ﷺ نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور زمین سے خطاب فرمایا۔

اُتْرُکِیْہ۔ اچھا اب اسے چھوڑ دو۔

ابھی یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور گھوڑے کا پاؤں باہر نکل آیا۔

مال کا طمع بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ بنی نوع انسان کو دیدہ دانستہ فریب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ رہائی پا کر جب سراقہ واپس لوٹ رہے تھے تو تقصیر کی ندامت کے خوف سے دل ڈوبا جا رہا تھا۔ جیسے ہی میل دو میل کی مسافت طے کی ہو گی کہ حرص کا شیطان پھر دل پر مسلط ہو گیا۔ اور فریب کی راہ سے تلقین شروع کی۔ یہ واقعہ یونہی اتفاقاً پیش آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے محمد ﷺ کی پیغمبرانہ توانائی کا قطعاً کوئی کرشمہ نہیں ہے۔

چلو واپس چلو۔ سرک اونٹوں کے انعام کا زریں موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ محمد ﷺ کی گرفتاری کوئی انہونی چیز نہیں ہے۔

دل کی آواز پر پھر سراقہ نے گھوڑے کی باگ موڑ دی اور پھر تعاقب کرتے ہوئے سرکار کے قریب پہنچ گئے۔ اس بار بھی لبوں کو جنبش ہوئی۔ دھرتی کا کلیجہ شق ہوا اور سراقہ اپنے گھوڑے سمیت گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔

پھر سراقہ نے رحمت اکرم کو آواز دی۔ پھر بخش و درگزر کو پکارا اور پھر رحمت مجسم نے احسان کی بارش کی۔ زمین کو اشارہ کیا اور کائنات گیر اقتدار کی گرفت میں سسکتا ہوا دشمن پھر آزاد ہو گیا۔

اس بار دل کی گہرائی میں پیغمبر کی توانائی کا یقین پیدا ہوا چلا تھا۔ بار بار سراقہ سوچ رہے تھے کہ ایک نیاز مند کی طرح زمین کی فرمانبرداری بلا وجہ نہیں ہے۔ کائنات کے خدا کے ساتھ محمد ﷺ کا کوئی معنوی تعلق ضرور ہے۔ لیکن نفس کا شیطان بڑا ہی چابک دست اور سحر طراز دشمن ہے۔ یہ ظالم ایک ہی لمحے میں دل کی ساری بساط الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سراقہ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ شیطان نے پھر سرگوشی شروع کی۔

محمد ﷺ اتنے ہی بڑے صاحب اقتدار ہوتے تو ایک تھکے ہوئے مجبور کی طرح مکے سے مدینے کی طرف ہجرت نہ کرتے خیالی ہیبت کے آگے ہتھیار ڈال دینا بہادروں کا شیوہ نہیں ہے۔ سرخ اونٹوں کا انعام تمہاری زندگی کا نقشہ بدل دے گا۔ چلو واپس لوٹو۔ اس سے زیادہ زریں لمحہ تمہیں پھر کبھی میسر نہیں آئے گا۔

بالآخر سراقہ پھر شیطان کے فریب کا شکار ہو گئے۔ پھر تیزی کے ساتھ واپس لوٹے۔ پھر پیغمبر کے لبوں کو جنبش ہوئی، پھر زمین کا دھانہ کھلا اور سراقہ ایک گرفتار پنچھی کی طرح سسکنے لگے۔

رحمت یزدانی نے دوبارہ سراقہ کو موقع دیا تھا کہ وہ سنبھل جائیں۔ لیکن جب بار بار کی تنبیہہ کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ تو پیغمبر نے خود حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا اور النواز تبسم کے ساتھ سراقہ کو مخاطب کیا۔

سرخ اونٹوں کے فریب میں اپنے نوشتہ تقدیر سے کیوں جنگ کر رہے ہو تمہارا مستقبل میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ جن کی زلفوں کا اسیر ہونا مقدر ہے اسی کو گرفتار کرنے آئے ہو۔ کیا اب بھی تمہیں کفر کی شب دیجو کا سویرا نظر نہیں آیا۔ میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ کے سونے کے کنگن تمہاری کلائیوں میں چمک رہے ہیں۔ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے کہ نصیبے کی ارجمندی تمہیں ایک وارفتہ حال دیوانے کی طرح میرے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ اور تمہارا سینہ اسلام وایمان کی دولت لازوال کا گنجینہ بن جائے گا۔

پیغمبر صادق ﷺ کی زبان حق ترجمان کے نکلے ہوئے یہ الفاظ سراقہ کے دل میں ترازو ہو گئے۔ تاریخ میں عالمی تسخیر کی یہ پہلی خوشخبری تھی۔ جس کے پیچھے کوئی مادی سامان نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ جیسے جابر و عظیم فرمانبردار کے کنگن دیکھنے والا آج وطن سے بھی شہر بدر کر دیا گیا۔

حضرت سراقہ پر جلد ہی صبح سعادت طلوع ہوئی اور مدینے کے دارالامان میں پہنچ گئے اور پروانے کی طرح شمع رسالت کے جلوؤں میں نہاتے رہے۔ کلائیوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن پہننے کا یقین ان کے دل کی دھڑکنوں سے منسلک ہو گیا تھا۔ جس رسول معظم نے جبرائیل ومیکائیل، عرش و کرسی، لوح و قلم، جنت و دوزخ اور حشر ونشر کی خبر دی تھی۔ اسی رسول نے کنگن پہننے کی خوشخبری بھی عطا کی تھی۔ زندگی کے دن اسی انتظار میں گزرتے گئے یہاں تک کہ خلافت فاروقی کے عہد زریں میں حضرت سراقہ سخت بیمار پڑ گئے۔ علالت سنگین ہو گئی۔ صورت حال شہادت دے رہی تھی کہ اب چند سانسوں کے مہمان رہ گئے ہیں۔ اکبر صحابہ کرام بالیں کے قریب جمع ہو گئے۔ عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے والوں کے نام کچھ لوگ اپنا پیام وسلام کہنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت سراقہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔

آپ حضرات اطمینان رکھیں۔ یہ میرا آخری وقت نہیں ہے۔ اس وقت موت میرے قریب نہیں آئے گی۔ جب تک کہ میں اپنے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن نہ پہن لوں۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ٹل سکتی ہے۔ سرکار رسالت کا فرمان نہیں ٹل سکتا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سراقہ موت کے چنگل سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ دنوں میں بالکل صحت یاب ہو گئے۔

آج مدینے میں ہر طرف مسرتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سجدہ شکر کے اضطراب سے سب کی پیشانی بوجھل ہو گئی تھیں۔ سپیدہ سحر نمودار ہوتے ہی لشکر اسلامی کا قاصد فتح ایران کی خوشخبری لے کر آیا تھا۔ محمد عربی ﷺ کے غلاموں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔ آج تاریخ میں پہلی بار کسریٰ کے ایوانوں پر عظمت اسلامی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ حق کی سطوت وجبروت کے آگے باطل اقتدار کا غرور شکنا چور ہو گیا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ایران سے اموال غنیمت بکھیر دیا گیا۔

امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے سب سے پہلے کسریٰ کے کنگن دریافت کئے۔ تلاش کے بعد وہ مل گئے تو حضرت سراقہ کو آواز دی گئی اس وقت حضرت سراقہ کا عالم قابل دید تھا۔ ناز سے جھوم رہے تھے۔ فرط مسرت سے چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ ارمانوں کے ہجوم میں مچلتے ہوئے اٹھے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

آج حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے لئے زندگی کی محبوب ترین گھڑی آ گئی تھی۔ جس کی آرزو کو ساری عمر ایمان کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ آنکھوں کے سامنے جلوہ گر تھی۔ اہل مدینہ بھی کیفیت ومستی کے عالم میں اپنے آقا کا زندہ معجزہ دیکھ رہے تھے۔ امنڈتے ہوئے خوشی کے آنسوؤں میں حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کی کلائیوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے۔ سر پہ تاج رکھا اور شاہی قبا زیب تن کرائی۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کی شاہانہ سج دھج دیکھ کر اہل مدینہ جذبات سے بے قابو ہو گئے۔ فرط شوق میں منہ سے چیخ نکل گئی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی عشق وایمان کی رقت انگیز کیفیت دیکھ کر بے خود ہو گئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت کی بات ہے، جب اسلام بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔ ایک یزدانی مسافر نے آج کی عظیم الشان فتح کی خبر دی تھی۔ کل میدان قیامت میں آپ حضرات گواہ رہئے گا کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنا کر میں نے اپنے آقا کا فرمان پورا کر دیا۔

سرکار رسالت مآب ﷺ کی شوکت اقتدار کا یہ نظارہ تاریخ فراموش نہیں کرے گی کہ ایک جنبش لب پر کائنات گیتی کا نقشہ بدل گیا۔ اور عشق رسالت کے فیضان نے عرب کے صحرانشینوں کو چشم زدن میں ساری دنیا کا فرمانبردار بنا دیا۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

بارش نور

آج سرکار ﷺ کے ایک چہیتے صحابی کا انتقال ہو گیا تھا ایک پروانہ اس محفل نور سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔ جہاں عرش کی قدیل کا چراغ ہر وقت فروزاں رہتا تھا۔ مدینے کے چمنستان کرم میں اب بھی ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے لیکن عندلیبان چمن کے فروغ محبت کا یہ حال تھا کہ صرف ایک پھول مرجھا گیا تھا تو ہر طرف سوگوار اداسیوں کی شام ہو گئی تھی۔

بھیگی بھیگی پلکوں کے سائے میں جنازہ اٹھا تو غمگساروں کے اژدہام سے گلیوں میں تل رکھنے کی جگہ باقی نہیں تھی۔

خود کائنات ہستی کے سرکار اعظم ﷺ بھی اپنے ایک شیدائی کی مفارقت سے بہت زیادہ غمگین و آبدیدہ تھے۔

مدینے کے مشہور قبرستان، جنت البقیع میں جب لوگ جنازہ لیکر پہنچے تو لحد تیار ہو چکی تھی۔ جنازہ اتارنے کے لئے سرکار خود بنفس نفیس لحد میں تشریف لے گئے اور اپنے نورانی ہاتھوں سے جنازہ کو فرش خاک پر لٹایا۔ سرکار کی اس ادائے رحمت پر ہر شخص مچل کے رہ گیا کہ کاش مرنے والے کی جگہ پر ہم ہوتے اور سرکار کے قدسی ہاتھوں سے ہماری لاش سپرد خاک کی جاتی۔

عالم گیتی کے مسافر کو گلشن جناں کی سیر کے لئے اپنی خوابگاہ سے دو قدم بھی نہیں چلنا پڑتا۔ جنت کی ساری بہاریں مرقد ہی میں سمٹ آئیں۔ جس کی لحد میں جنازہ سے پہلے رحمت یزدانی اتر آئی ہو آخر اس پر رشک نہ کیا جائے تو اس بھری کائنات میں اس سے زیادہ اور کون قسمت کا دھنی ہو سکتا تھا؟ مراسم تدفین سے فارغ ہو کر سرور کائنات کاشانہ اقدس کی طرف واپس ہوئے جونہی دولت سرائے اقبال میں قدم رکھا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حاضر خدمت مقدم کیا۔

رخ زیبا پر نظر پڑتے ہی ارمانوں کا غنچہ کھل اٹھا اور چشمہ نور کی سطح خاموش پر موجوں کی کرن پھیل گئی جس کے گوہر دنداں کی جوت سے حرم سرا کی دیواریں چمک اٹھتی تھیں اسی کے جلوؤں کے سویرے میں سیدہ عائشہ پیکر حیرت بنی کھڑی تھیں۔

زبان خاموش تھی لیکن آنکھوں میں کسی مخفی حقیقت کے تجسس کا اضطراب مچل رہا تھا کبھی سرکار ﷺ کے پیراہن کو دیکھتی تھیں کبھی کاکل و رخ پر نظر ڈالتی تھیں۔ اسی عالم تحیر میں سرکار کے بالکل قریب پہنچ گئیں اور سر سے پا تک سرکار کے پیراہن شریف کا جائزہ لیا۔

آج ان پر حیرت کا کچھ ایسا کیف طاری تھا کہ زبان نہیں کھل رہی تھی اندر ہی اندر دل کا عالم زیر و زبر ہو رہا تھا۔

تلاش و طلب کی حیرانی کا یہی عالم تھا کہ لب ہائے گہر ریز کو جنبش ہوئی اور سرکار نے ارشاد فرمایا۔

عائشہ؟ کیا تلاش کر رہی ہو۔ تمہاری جستجو کا یہ اضطراب بتا رہا ہے کہ کوئی حیرت انگیز واقعہ تمہاری نگاہ سے ضرور گزرا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اپنی آمد کے موقع پر تمہاری مسرت کے ساتھ حیرت کا یہ عالم میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔

اس سوال پر ام المومنین کی آنکھیں چمک اٹھیں فرط شوق نے عرض کیا۔

سرکار؟ آج آپ کے قبرستان تشریف لے جانے کے بعد بڑے زور کی موسلا دھار بارش ہوئی ہے مدینے کے سارے ندی نالے جل تھل ہو گئے ہیں ہر طرف سیلاب امنڈ آیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ نہ تو قبرستان میں چھپنے کی کوئی جگہ ہے نہ آپ کے ساتھ بارش سے محفوظ رہنے کا کوئی سامان ہی تھا آخر موسلا دھار بارش کہاں گئی۔ نہ آپ کے چہرے پر بوند کا کوئی اثر ہے نہ بالوں میں نمی ہے نہ پیراہن ہی تر ہوا ہے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا واقعہ میرے ساتھ پیش آ گیا ہے عالم اسباب کی کڑیاں ملاتی ہوں تو ایک کڑی بھی نہیں مل رہی ہے۔

اسی عالم تحیر میں آج مجھ پر بیخودی کا ایک کیفیت طاری ہے۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ جواب سن کر سرکار ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا۔ واقعہ غلط نہیں ہے ضرور تمہاری آنکھوں نے برستے ہوئے بادل دیکھے ہیں لیکن قبل اس کے میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاؤں، تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد تم نے میرے استعمال کا کوئی کپڑا تو اپنے سر پر نہیں رکھ لیا تھا۔

ام المومنین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ آپ کی وہ یمنی چادر جس کے جھرمٹ میں روح الامین وحی لیکر اترتے ہیں اسے دوپٹے کی طرح البتہ میں نے سر پر ڈال دیا تھا۔ حضور ﷺ کے سوال کا جواب دینے کے بعد ام المومنین گوش بر آواز ہو گئیں۔ نہایت بیتابی کے ساتھ وہ حقیقت کی نقاب کشائی کا انتظار فرما رہی تھیں کہ رحمتوں کے پھول برساتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ عائشہ؟ یہ وہ بارش نہیں تھی جو آسمان کی کالی گھٹاؤں سے برستی ہے جس سے کپڑے بھیگتے ہیں اور زمین نم ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ وہ بارش نور تھی جو عالم غیب میں ہر آن میرے اوپر برستی ہے۔ میرے نورانی جسم سے مس ہونے والے کپڑے کو جونہی تم نے سر پر رکھا عالم غیب کے سارے حجابات اٹھ گئے اور تمہاری آنکھوں نے عالم قدس سے برسنے والی بارش کا مشاہدہ کیا۔ اللہ اکبر؟ سوچنے کا مقام ہے کہ جس رسول انور ﷺ کے جسم پاک سے لگی ہوئی چادر کا یہ فیضان ہے کہ اس کے سائے میں غیب کے دروازے کھلتے ہیں، نظر کے حجابات اٹھ جاتے ہیں خود اس رسول محترم ﷺ کے مشاہدے غیب کا کیا عالم ہوگا۔

نکھرا ہوا سونا

دوپہر کی دھوپ، آگ کی طرح تپتی ہوئی چٹان، اور سل کے نیچے دبی ہوئی ایک زندہ لاش غلاموں کو اتنی دردناک سزا نہیں دی جاتی!

مکہ کے ایک تاجر نے امیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس نے کتنا سنگین جرم کیا ہے۔ سارے صنادید عرب جس رسول کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہ بدبخت اس کا کلمہ پڑھتا ہے۔ شب و روز اسی کا دم بھرتا ہے۔ اس کے تصور و خیال میں ہر وقت شرابور رہتا ہے۔

میں نے اسے بار بار سمجھایا کہ تو ایک حبشی نژاد غلام ہے۔ عرب والے رسول سے تیرا کیا رشتہ ہے؟ اگر کسی کا حق تیرے اوپر ہو سکتا ہے تو آقا ہونے کی حیثیت سے یہ منصب صرف میرا ہے۔"

امیہ نے تیور بدل کر جواب دیا۔

"تمہاری اس فہمائش پر وہ کیا کہتا ہے؟" مکے کے تاجر نے پھر سوال کیا۔

"کہتا ہے کہ تم نے میرا جسم خریدا ہے، دل نہیں خریدا ہے غلامی کے فرائض کا تعلق اعضاو جوارح سے ہے دل سے نہیں۔ میں تمہاری خدمت سے انکار کردوں یا مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی طرح کوتاہی سرزد ہو تو البتہ میں لائق تعزیر ہوں۔"

لیکن ضمیر کی آواز اور دل کی امنگوں پر تمہارا کوئی حق تسلیم کرنے سے میں قطعاً انکار کرتا ہوں کسی دلکش اور زیبا ہستی کے ساتھ روح کی وابستگی کے لئے رنگ و نسل کی ہم آہنگی بالکل ضروری نہیں ہے۔ حبشی نژاد ہونا عرب کے پیغمبر صادق پر ایمان لانے سے مانع نہیں ہے۔"

امیہ نے نہایت تمسخر کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا جواب نقل کیا ہے۔

"اس کی گفتگو کا تیور بتا رہا ہے کہ عرب کی رائے عامہ کے خلاف بغاوت کے بھرپور جذبے سے وہ مسلح ہو چکا ہے۔ رسول کی آوز کی سحر سے اس کا جانبر ہونا اب بہت مشکل ہے۔ ایسے بے وفا سرکش کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے یہ سزا ابھی بہت ناکافی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے مکے کا تاجر آگے بڑھ گیا۔

پھر وہی دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان سے چنگاری برس رہی تھی۔ لالہ کی طرح دہکتے ہوئے انگارون پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو لٹا دیا گیا۔ اوپر سے کئی من پتھر کی ایک چٹان سینے پر رکھ دی گئی تاکہ سلگتا ہوا جسم کروٹ نا بدل سکے۔

ایک زندہ انسان کا خون جل رہا تھا۔ چربی پگھل رہی تھی اور مکے کے اوباش تالیاں بجا بجا کر بدمست شرابیوں کی طرح ناچ رہے تھے۔

چنگاریوں کی طرح جسم کی خاکستر اڑانے لگی لیکن سلگنے والے کی زبان پر ظلم و ستم اور جور و استبداد کا ایک سے ایک لرزا دینے والا واقعہ دنیا کی نگاہوں سے گزر رہا ہے لیکن خوشنودی حق کے لئے تسلیم و رضا اور صبر و ضبط کا یہ حیرت انگیز نظارہ چشم فلک نے کم دیکھا ہوگا۔

تصور جاناں میں آنکھیں بند تھیں اور امیہ ہاتھ میں تازیہ لئے پچھ رہا تھا۔

"بتا! کیا اب بھی تو محمد ﷺ کا کلمہ پڑھے گا؟ تیری ہڈی تک جل گئی اب تو جھوٹے دین سے توبہ کرلے۔ بلاوجہ اپنی جان کو ہلاکت کا نشانہ مت بنا۔ آخری بار سن لے! کہ اب تو اپنی ضد سے باز نہ آیا تو تیرے جسم کو جلا کر راکھ کردوں گا۔ سارا عرب میرے ساتھ ہے۔ کوئی تیری حمایت نہیں کے لئے کھڑا نہ ہوگا۔"

شدت کرز میں لرزتی ہوئی ایک مدھم سی آواز فضا میں گونجی۔

"رسول عربی ﷺ کا کلمہ میں زندگی کی آخری سانس تک پڑھتا رہوں گا۔ اس دین کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں جس کی محبت میرے دل کی دھڑکنوں میں جذب ہو چکی ہے۔ ایک حبشی غلام کی اس سے بڑھ کر اور کیا معراج ہوگی کہ اس کے جسم کی جلی ہوئی راکھ رسول عربی ﷺ کے قدموں کو چھولے میری فتح و سرخروئی کے لئے میرے رسول کی حمایت بہت کافی ہے۔ وفاداری کی موت ہلاکت نہیں حیات جاوید ہے۔

چاندنی رات تھی۔ ایک پیکر نور کے دم قدم سے مکے کی پہاڑیوں پر نور برس رہا تھا۔ آج فضاؤں میں ہو طرف خوشیوں کی ادا بھی بکھیرے نظر آرہی تھی۔

خود رسول اللہ ﷺ کی انس میں بھی ایک حسرتناک خوشی کا عالم طاری تھا۔ اتنے میں چمنستان رسالت کے عندلیب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حاضر بارگاہ ہوئے۔

آج چہرے پر غیر معمولی اندوہ کے آثار تھے۔ سرکار نے نظر اٹھاتے ہی دریافت فرمایا۔ ابوبکر! آج تمہارے چہرے پر دل کے گہرے زخم کے آثار نظر آرہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ ! اب حضرت بلال کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ آج دوپہر کو ظلم و شقاوت کا ایک دلگداز

منظر دیکھ کر آنکھوں سے خون ٹپک پڑا۔ ظالم نے دہکتی ہوئی آگ پر ننگی پیٹھ انہیں سلا دیا تھا۔ آپ کے کاکل ورخ کا غلام انگاروں کے مدفن کا نشان بتانے کے لئے جگہ جگہ پیٹھ میں غار پڑ گئے ہیں۔

جور وستم کی یہ دردانگیز سرگزشت سن کر سرکار کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ارشاد فرمایا۔

"ابوبکر"! مت گھبراؤ۔ حق کا سورج زیادہ دیر تک گہن میں نہیں رہتا۔ آزمائشوں کی انہی بھٹیوں میں عشق وایمان کا سونا نکھرتا ہے۔ وہ دن بہت جلد آرہا ہے جبکہ اہل ایمان کی دنیا بلال کو اپنا آقا کہہ کر پکارے گی۔"

جذبہ غمگسار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے خود ہو گئے۔ عرض کیا!

"یارسول اللہ ﷺ ! امیہ اسی لئے تو انہیں اپنے مظالم کا نشانہ بنا رہا ہے کہ وہ انہیں اپنا زرخرید غلام سمجھتا ہے۔"

"سرکار ﷺ ! مجھے اجازت مرحمت فرمایئے کہ حضرت بلال کو خرید کر آزاد کر دوں۔"

خوشی سے چہرہ زیبا کھل گیا۔ ارشاد فرمایا۔ "اس سے بڑھ کر اور دین کی سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے ایک مظلوم بھائی کو رنج ومحن کے زنداں سے رہا کرایا جائے۔ دین کے رشتے سے مصیبت زدوں کی امداد وچارہ سازی خدا کے تئیں محبوب ترین عمل ہے۔ لیکن ابوبکر! نگارخانہ عشق کے اس شکیل زیبا کی خریداری میں مجھے بھی شریک کر لینا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جذبات کی بے خودی میں اشکبار ہو گئے۔

سرکار! ہم اور بلال دونوں ہی کاکل ورخ کے غلام اور دامن کرم کے پناہ گیر ہیں آپ سے الگ نہ ہماری جان کی کوئی ہستی ہے نا مال کا کوئی وجود! شرکت تو جب ہوتی ہے کہ جب میرا کوئی الگ وجود ہوتا۔ جب سب کچھ حضور ﷺ ہی کا ہے تو اب شرکت کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے آقا!

میری تو صرف اتنی آرزو ہے کہ حضرت بلال کو اس سنگدل یہودی سے چھڑا کر سرکار کے قدم ناز پر نثار کر دوں۔

دوسرے دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیہ سے کہہ رہے تھے۔

"میں تمہارے حبشی غلام کو خریدنا چاہتا ہوں۔ اگر تم ایثار کر سکو تو میرے ہاتھ پر فروخت کر دو"

امیہ نے کہا۔" اگرچہ میں ضرورت مند ہوں۔ لیکن تمہاری بات نہیں کاٹوں گا۔ خریدنا ہے تو مناسب قیمت طے کر لو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں تمہاری منہ مانگی قیمت ادا کر دوں گا۔"

جیسے ہی اس نے زبان ہلائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا پس وپیش منہ مانگی قیمت ادا کر دی۔

جب خوشی میں جھومتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لے کر چلنے لگے تو امیہ نے طعن کرتے ہوئے کہا۔

ابوبکر! ایک ذہین تاجر کی حیثیت سے تم عرب گیر شہرت کے مالک ہو۔ تمہارے متعلق مشہور ہے کہ مال پر رکھنے اور قیمت لگانے میں تمہارا اب تک کوئی بھی حریف نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ لیکن مجھے سخت تعجب ہے کہ آج بلال کی خریداری میں تم مات کھا گئے۔ ایک ناکارہ غلام جس کی نہ صورت ہی دیکھنے کے قابل ہے اور نہ اسے کوئی ہنر ہی آتا ہے تم نے سونے کے مول اسے خرید لیا ہے۔ اتنا بڑا غبی اور بے عقل ہے وہ کہ میں نے سخت سے سخت سزا دی ہے۔ لیکن رحم کی درخواست کرنے کا بھی اسے سلیقہ نہیں معلوم۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا ناکارہ، غبی اور بے ہنر غلام تم نے کس مصرف کے لئے خریدا ہے۔"

معنی خیز تبسم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو لفظوں میں یہ جواب مرحمت فرمایا۔ خوب وناخوب کا معیار ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ تم جسے عیب سمجھ رہے ہو وہی میرے تئیں ہنر ہے۔ بلال کو سونے کے مول خرید کر بھی میں شرمندہ ہوں کہ اس کی واجبی قیمت دونوں جہان سے زیادہ ہے۔"

جس رخ زیبا کی ایک جھلک نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو وارفتہ بنا دیا تھا۔ آج زندگی بھر کے لئے اس کے قدموں میں پہنچ گئے تھے۔ آقائے کونین ﷺ کے دامن میں انہیں دوجہان کا سرمدی سکون مل گیا اب وہ سیاہ فام غلام نہیں تھے۔ عالم اسلام کے خوبرو آقا تھے۔

معراج کی شب تھی۔ سارا عالم بالا سلطان کونین ﷺ کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ تھا۔ ملائکہ مرسلین کی جھرمٹ میں شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ سرکار کی سواری پہنچی۔

سلامی کے لئے قدسیوں کے بیڑے جھک گئے۔ عرش کا پرچم سرنگوں ہو گیا۔ امیدوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے عالم ملکوت کا معائنہ فرمایا۔ اب گل گشت کے لئے باغ فردوس کی طرف بڑھے۔ مرحبا کہنے کے لئے ہر طرف حور وغلمان کی صفیں ایستادہ تھیں۔ حضرت جبریل امین قدم قدم پر ہم رکاب تھے۔

جنت کی سیر کرتے ہوئے ایک مقام سے گزر رہے تھے کہ سرکار کی چشم اقدس ایک غمگین اور ملول حور پر پڑی۔ جو ایک درخت کی ٹہنی تھامے ہوئے رو رہی تھی۔ فردوس کے عالم خوشگوار میں رنج وغم کی پرچھائیں دیکھ کر حضور ﷺ کو بڑا اچنبھا ہوا۔ جبریل امین سے ارشاد فرمایا۔ دریافت کرو یہ حور کیوں رو رہی ہیں۔ جنت کے عیش دوام میں اسے کون سا غم لاحق ہو گیا ہے۔

جبریل امین نے اس کے قریب پہنچ کر اطلاع دی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ آج سلطان کونین نے جنت میں قدم رنجہ فرمایا ہے؟ جواب دیا معلوم ہے جبھی تو غمگین فریادوں کی طرح اپنا حال بنا رکھا ہے کہ ان کی نگاہ رحمت میرے اوپر پڑے اور وہ میرا حال دریافت کرلیں۔

جبریل امین نے ارشاد فرمایا۔ تجھے مبارک ہوا۔ انہوں نے تیرا حال دریافت کرنے کے لیے مجھے بھیجا ہے۔ جواب کے انتظار میں سرکار ﷺ کی سواری رکی ہوئی تھی۔

حور نے اپنی آنکھوں کا آنسو آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ سلطان کونین ﷺ کی سرکار میں اپنے غم کی دردانگیز کہانی میں خود سناؤں گی۔

باریاب ہونے کی اجازت مل گئی۔ جھک کر سلام عرض کیا۔ جلالت شاہانہ کے آداب بجالائی اور اپنی سرگزشت سنانا شروع کیا۔

یارسول اللہ ﷺ! خدائے کردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے جنت کی حوروں میں مجھے حسن و جمال کی ملکہ بنایا ہے۔ آٹھوں جنتوں میں میری طلعت وزیبائی کا کوئی حریف نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرے درخشاں عارض کی جودت فردوس کے بام ودر پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر بے نقاب ہوجاؤں تو دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں اور جنت میں دوپہر کا اجالا پھیل جائے۔

یارسول اللہ ﷺ! ایک دن کا واقعہ ہے کہ اچانک میرے دل میں خیال گزرا کہ قیامت کے دن ساری حوریں کسی نہ کسی بندہ مقبول کے حوالہ کی جائیں گے۔ علم الٰہی میں میرا بھی کوئی نہ کائی جوڑا ضرور مقرر ہوگا۔ جس کی رفاقت میں مجھے دائمی زندگی گزارنی ہے۔ یہ خیال آگے بڑھتے بڑھتے ایک آرزو کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ یہاں تک کہ جنت کی ایک خوشگوار سحر کے وقت میں نے رب العزت کی بارگاہ میں یہ التجا پیش کی۔

الٰہ العالمین۔ تیری نعمت واحسان کے آگے میری پیشانی ہمیشہ خم رہے گی کہ تونے مجھے حسن کی بے مثال خلعتوں سے سرفراز کیا۔

پروردگار! مدت سے ایک آرزو سینے میں مچل رہی ہے کہ فردائے قیامت میں اپنے جس بندہ مقرب کے حوالے تو مجھے کرے گا ذرا اس کی ایک جھلک مجھے دکھلادے۔ کم ازکم یہ تو دیکھ لوں کہ میرا جوڑا کیسا ہے؟

رحمتوں کا دربار جوش پر تھا۔ میری یہ التجا قبول ہوگئی۔ حکم ہوا، سامنے جو آئینہ رکھا ہے اسے ایک نظر دیکھ لے۔ تیرے جوڑے کی جھلک نظر آئے گی۔

یارسول اللہ ﷺ! میں ارمان شوق میں ڈوبی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی۔ میرے قدم خوشی سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے کہ آج عالم جاوید کے محبوب ترین ساتھی کو دیکھنے جارہی تھی۔ میری آنکھوں کے پیمانے سے جلوؤں کی شراب ٹپک رہی تھی۔ جھومتی مچلتی میں آئینے کے سامنے پہنچی۔ جونہی نگاہ اٹھائی دل پر ایک بجلی گری اور آرزوؤں کا سارا خرمن جل گیا۔ اس وقت سے آج تک ارمانوں کی خاکستر سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ دل کو کسی کروٹ چین نہیں ہے۔ ہمیشہ اس غم میں سلگتی رہتی ہوں کہ ایک بدشکل سیاہ فام اور وحشت نام چہرے کے ساتھ میرا کیونکر نباہ ہوسکے گا۔ جبکہ اس کا تصور سے طبیعت کو وحشت ہونے لگتی ہے۔

سرکار نے زیرلب مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا۔ اپنے جوڑے کا جو سراپا تونے آئینے میں دیکھا ہے میرے سامنے بیان تو کر۔

اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ سر سے پا تک مجسم سیاہی۔ خوفناک اندھیرا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے چکلے دانت، چپٹی ناک، بھدا چہرہ اور تنگ وتاریک پیشانی، ہاتھ اور پاؤں بھی نہایت بھونڈے۔ قدوقامت بھی بالکل بے ڈھنگا۔ چشمہ نور میں نکھری ہوئی چاندنی اور گل ولالہ کی بہاروں کے ساتھ اس وحشت مجسم کا پیوند کیونکر جوڑا جاسکتا ہے؟ وہ جب اپنی بات ختم کرچکی تو سرکار نے سر اٹھایا۔ آنکھیں غیرت جلال سے سرخ ہو گئیں تھیں۔ ارشاد فرمایا۔ "تونے جو سراپا بیان کیا ہے وہ تو میرے پیارے بلال کا ہے۔ ایک عاشق سراپا۔ ایک مومن وفاکیش اور نگارخانہ ہستی کے ایک گوہر نایاب کو پاکر تو اپنی غم نصیبی کا شکوہ کررہی۔ کیا تجھے نہیں معلوم ہے کہ بلال میرا عاشق مجسم ہے۔ میں نے اپنی پلکوں کے سائے میں اسے پناہ کی جگہ دی ہے اور سن لے! میرا بلال برگاہ یزدانی میں تقریب کی اس مسند امتیاز پر فائز ہے کہ فردائے قیامت میں اس کے جسم کی سیاہی حوران خلد کے رخساروں پر تل بناکر تقسیم کردی جائے گی۔ آتش کدہ عشق میں نکھرا ہوا سونا جس نے محبت کی شیفتگی میں دونوں جہاں سے منہ پھیر لیا ہے وہ حسن مجرد کا تماشائی ہے۔ فردوس کا حکم وہ کیا خاطر میں لائے گا۔ اپنے جلوؤں کی زیبائی پر تو غرور نہ کر! ہوسکتا ہے۔ جس دن ستر ہزار نقاب الٹ کر تو بلال کے سامنے آئے۔ میرا بلال تجھے ناپسند کردے۔ سرکار ﷺ کا ارشاد سن کر وہ اپنے تئیں جذبات سے بے خود ہوگئی۔ طلعت جمال کا سارا خمار اتر گیا۔ اضطراب شوق کی وارفتگی میں چیخ پڑی۔ سرکار! میری معذرت قبول کی جائے۔ میرے غم کا بوجھ اتر گیا۔ مجھے وہی سیاہ فام بلال پسند ہے۔ میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ سلطان کونین کا پروردہ نظر میرے حصے میں آیا۔ قیامت کا دن اسی سراپا کے ساتھ بلال کو اپنی آنکھوں میں بٹھانا چاہتی ہوں۔ اس کی معذرت قبول فرمائی گئی اور سرکار دوجہاں دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ عشق کارساز! تیری دہائی ایک سیاہ فام غلام کو اتنا بڑھایا کہ کونین کے سر کا تاج بنادیا رحمت ونور کے آبشار میں نکھرانے والے؟ تیرے جسم کی سیاہی پر چراغ کعبہ کی روشنی قربان ہے تیرا نام شوکت اسلام کی سب سے بڑی یادگار ہے! مسلمانوں کے سیدو سرور بلال! اپنے آتش کدہ عشق کی ایک چنگاری ہمارے دلوں کی انجمن تک بھی پہنچادے۔ نبض حیات کی تپش سرد پڑتی جارہی ہے۔ ایمان ویقین کی حرارت کا مزاج اپنے نشان سے نیچے اترتا جارہا ہے۔ یہود کا آتش کدہ پھر سلگنے لگا۔ پھر دنیائے اسلام کو تیرے فیضان عشق کی ضرورت ہے۔

اذان بلالی

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

مدینے کے افق سے بہت دور سورج چلتے چلتے رک گیا۔ سپیدہ سحر کے انتظار میں اہل مدینہ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لوگ حیران و پریشان بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔

یارسول اللہ ﷺ ! آج کی رات کتنی طویل ہوگئی۔ تہجد کی نماز ادا کرنے والے کب سے اپنے معمولات سے فارغ ہو چکے، بچے کئی بار سو کر جاگے اور جاگ جاگ کر سوئے لیکن رات ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی۔

لوگ عرض مدعا کر رہے تھے کہ آسمان کا دروازہ کھلا۔ پروں کی آواز فضا میں گونجی پلک جھپکنے پر جبریل امین سامنے کھڑے تھے۔

یارسول اللہ ﷺ ! عرش کے سب سے اونچے کنگرے پر ایک فرشتہ مقرر ہے۔ جس کے قبضہ میں سورج کی باگ ڈور ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر وہ مدینہ کے افق پر سورج کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتا ہے۔ آج وہ اب تک انتظار میں ہے تاہنوز مدینے سے اذان کی آواز عرش تک نہیں پہنچی ہے۔

ارشاد فرمایا۔ اذان ہوگئی۔ البتہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان نہیں دی ہے۔ کچھ لوگوں کی درخواست پر آج سے ایک خوش الحان موذن مقرر کیا گیا ہے۔

حضرت جبریل نے عرض کیا۔ دل کے عشق واخلاص کی گہرائی میں اتر کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے ہیں۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرش تک پہنچنے کی پرواز سوائے انکی آواز کے اور کسی کو اب تک حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ اس لئے جب تک وہ اذان نہیں دیں گے۔ مدینے کے افق پر سحر کا اجالا نہیں پھیل سکے گا۔

حضرت روح الامین کی درخواست پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا گیا۔ جونہی اذان کے کلمات فضا میں گونجے رات کی سیاہی چھٹنے لگی اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف صبح کا اجالا پھیل گیا۔

اس دن ہر کہہ ومہ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ عشق رسالت نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا مقام کتنا اونچا کر دیا ہے اور فیضان نبوت کے طفیل ایک نحیف ونزار غلام کی آواز میں کس قیامت کی توانائی پیدا ہوگئی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جگر میں عشق کے سوز وگداز کا وہ دردناک منظر تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی جب جان عالم ﷺ نے ظاہری دنیا سے پردہ فرمالیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے شوق کی دنیا اجڑ گئی۔ ہمیشہ کے لئے زندگی کی امنگوں کا خاتمہ ہوگیا۔ دیوانہ وار مدینے کی گلیوں میں راستہ چلنے والوں سے اپنے محبوب کا پتہ پوچھتے پھرتے۔ عہد رسالت کے بیتے ہوئے دن یاد آ جاتے تو آنکھوں سے خون حسرت ٹپکنے لگا۔ کبھی کبھی ان کی رقت انگیز آہ وفغان سے اہل مدینہ کے دل ہل جاتے بالآخر ہجر فراق کا صدمہ تاب ضبط سے باہر ہوگیا۔ ایک دن سوگوار اٹھے اور ملک شام کی طرف چلے گئے اور حلب میں سکونت اختیار کر لی۔

ایک دن ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ قسمت بیدار نے انہیں آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو طلعت زیبائے رسول سے سارا گھر منور تھا۔ چہرہ نور سے تجلیات کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ ارشاد فرمایا۔

بلال ! تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا تمہارے دل میں کبھی ہماری ملاقات کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ خواب سے اٹھے تو ان پر ایک عجیب رقت انگیز کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان لبیک یا سیدی کا نعرہ تھا۔ اسی وقت افتاں وخیزاں مدینے کی طرف چل پڑے۔ جذبہ شوق کے اضطراب میں شب وروز چلتے رہے۔ مدینے جب قریب آگیا تو دل کا حال قابو سے باہر ہوگیا۔ پہاڑوں، صحراؤں اور وادیوں سے پیچھے دور کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ ایک ایک کر کے حافظے میں تازہ ہونے لگیں۔ چند قدم اور کچھ آگے بڑھے تو سامنے مدینہ چمک رہا تھا۔ اچانک سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ شدت غم سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ بیساختہ منہ سے ایک چیخ نکلی اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر کے بعد سکون ہوا تو اٹھے۔ دیوانہ وار زار قطار روتے ہوئے مدینے میں داخل ہوئے انہیں دیکھتے ہی اہل مدینہ میں ایک شور ماتم بلند ہوا۔ چاروں طرف سے جانثاروں میں بھیڑ لگ گئی۔ پھر وہ عالم احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے محبوب کے روضے پر حاضر ہوئے، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ غم سے سینہ دھکنے لگا۔ تربت انور کے سامنے پہنچتے ہی ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ چیخ مار کر زمین پر گرے اور بیہوش ہوگئے۔

اسی عالم میں لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔ کافی دیر کے بعد ہوش آیا تو کئی دن "یا محمد ﷺ" کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ جب تک مدینے میں رہے عشق و محبت کی دنیا اتھل پتھل ہوتی رہی۔ ایک دن لوگوں نے اذان کے لئے اصرار کیا تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں فرمایا! وہ زمانہ پلٹا لاؤ۔ جب میرے سرکار مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور میں شہادت کی انگلیوں سے ان کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

جواب سن کر جب لوگ مایوس ہوگئے تو شہزادہ رسول سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکار میں حاضر ہوئے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ شہزادہ رسول کی بات حضرت بلال رضی اللہ عنہ کبھی نہیں ٹالیں گے بالآخر سیدنا امام عالی مقام کے اصرار پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دینے کے لیے تیار ہوگئے۔

جس وقت مینار پر کھڑے ہوکر انہوں نے اللہ اکبر کہا تو سارے مدینے میں ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں کے دل ہل گئے۔ آہ و فغاں سے ہر گھر میں قیامت کا منظر برپا ہوگیا۔ پردہ نشین عورتیں جذبہ بیخودی میں گھروں سے نکل آئیں۔ کمسن بچے اپنے والدین سے پوچھنے لگے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تو آگئے۔ ہمارے آقا کب تک تشریف لائیں گے؟

اذان دیتے ہوئے حضرت بلال جب کلمہ شہادت پر پہنچے تو حالت غیر ہوگئی۔ حسب عادت انگلیوں کا اشارہ کرنے کے لئے نگاہ صحن مسجد کی طرف اٹھ گئی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی یہ پہلی اذان تھی جب حضور ﷺ کا چہرہ انور سامنے نہیں تھا۔ ایک عاشق دلگیر اس دردناک حالت کی تاب نہ لا سکا۔ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور عشق کی دبی ہوئی چنگاری جاگ اٹھی پھر ہجر رسول کا غم سینوں میں تازہ ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد بہت دنوں تک اہل مدینہ کی پلکیں بھیگی حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب تک مدینہ میں رہے۔ دل کا زخم رستا رہا۔ غم فراق نہیں ضبط ہوسکا تو کچھ دنوں کے بعد پھر ملک شام کی طرف روانہ ہوگئے۔

آہ! کتنی رقت انگیز کہانی ہے ایک حبشی نژاد غلام کی۔ جس کے تن کی سیاہی غلاف کعبہ میں جذب ہوگئی اور جس کے دل کا نور عرش کی قندیل نے مستعار لیا۔ جو اپنے نسب کے اعتبار سے غلام تھا۔ لیکن حسب میں ملت اسلام کا آقا کہلایا۔

اے خوشا نصیب! کہ عشق رسالت کے فیضان نے ایک غبار مشت کو کائنات کے دل کی دھڑکن بنادیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا۔

چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا۔ مدینے کی گلیوں میں ہر طرف نور برس رہا تھا۔ پوری آبادی رحمتوں کی گود میں محو خواب تھی آسمانوں کے دریچے کھل گئے تھے فضائے بسیط میں فرشتوں کے پروں کی آواز دم بدم تیز ہوتی جارہی تھی۔ عالم بالا کا یہ کارواں شاید مدینے کی زمین کا تقدس چومنے آرہا تھا۔

اچانک اس خاموش سناٹے میں بہت دور ایک آواز گونجی۔ فضاؤں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ شبستان وجود کے سارے تار بکھر گئے اور ایمان کی تپش چنگاریوں کی طرح بال بال سے پھوٹنے لگی۔

میخانہ عشق کا دروازہ کھلا، کوثر کی شراب چھلکی اور جذبہ اخلاص کی والہانہ سرمستیوں میں سارا ماحول ڈوب گیا۔

یہ غلامان اسلام کے آقا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز تھی۔ جس نے ہر گھر میں ایک ہنگامہ شوق برپا کردیا تھا۔ اب مدینے کی ساری آبادی جاگ اٹھی تھی۔ سرور کونین کا منادی ایک شکستہ گھر کے سامنے آواز دے رہا تھا۔

" گلشن اسلام کی شادابی کے لئے خون کی جرورت ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مجاہدین کا لشکر ایک عظیم مہم پر روانہ ہورہا ہے۔ مدینے کی ارجمند مائیں اپنے نوجوان شہزادوں کا نذرانہ لے کر فوراً بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوجائیں"

کلمہ حق کی برتری کے لئے تڑپتی ہوئی لاشوں کو خوشنودی حق کی بشارت مبارک ہو! مبارک ہو۔ خون کا آخری قطرہ جو ٹپکتے ہی اسلام کی بنیاد جذب ہوجائے۔

ایک ٹوٹے ہوئے دل کی طرح یہ ٹوٹا ہوا گھر ایک بیوہ عورت کا تھا۔ چھ سال کے یتیم بچے کو گود میں لئے ہوئے وہ سو رہی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر چونک پڑی۔ دروازے پر کھڑی ہوکر پھر غور سے سنا۔ سنتے ہی دل کی چوٹ ابھر آئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہوگئیں۔ چھ سال کا یتیم بچہ سویا ہوا تھا۔ ماں رو رہی تھی۔ فرط محبت میں بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ سسکیوں کی آواز سن کر بچے کی آنکھیں کھول دیں۔ ماں کو روتا ہوا دیکھ کر بے تاب ہوگیا۔

گلے میں باہیں ڈال کر معصوم اداؤں کے ساتھ دریافت کیا!

"ماں کیوں رو رہو، کہاں تکلیف ہے تمہیں؟"

آہ! ایک نا سمجھ بچے کو کیا معلوم کہ حسرتوں کی چوٹ کتنی دردناک ہوتی ہے۔ کہاں چوٹ ہے۔ یہ نہیں بتایا جاسکتا۔ لیکن اس کی کسک سے سارا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔

پھر ایک بیوہ عورت کا دل تو اتنا نازک ہوتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہوجاتا ہے۔

بچے کے سوال پر ماں کا دل اور بھر آیا۔ غم کی چوٹ سے یک بیک جذبات کا دھارا پھوٹ پڑا۔ گرم گرم آنسوؤں سے آنچل کا کونا بھیگ گیا۔

"بچہ بھی ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔"

ماں نے بچے کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ میرے لال مت روؤ۔ یتیموں کا رونا عرش کا دل ہلا دیتا ہے۔ تمہارے گریہ درد سے غم کی چوٹ اور تازہ ہوجائے گی۔ بدر کی وادی میں ابدی نیند سونے والے اپنے شہید باپ کی روح کو مت تڑپاؤ۔ دنیا چھوڑنے کے بعد بھی شہیدوں کے دل رابطہ اپنے خون کے رشتوں سے باقی رہتا ہے۔ چپ ہوجاؤ۔ مت رو میرے لال!

مگر بچہ روتا رہا وہ بضد تھا کہ ماں کیوں رو رہی ہے۔ بالآخر اپنے بچے کے لئے ماں کی آنکھ کا ابلتا ہوا چشمہ سوکھ گیا۔ ماں نے بچے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا ابھی حضرت بلال، وہ بلال جنہیں ہم دہکتی ہوئی آگ کا نکھرا ہوا سنا کہتے ہیں یہ اعلان کرتے ہوئے گزرے ہیں کہ اسلام کے پرچم دشمنوں کی زد پر ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مجاہدین کا ایک لشکر میدان جنگ کی طرف روانہ ہورہا ہے۔ آقائے کونین نے اپنے جانباز وفاداروں کو آواز دی ہے۔ آج غیرت حق کا سمندر ہلکورے لے رہا ہے۔ رحمتوں کے تاجدار آج ایک ایک قطرہ خون پر جنتوں کی بہار لٹا دیں گے۔ ایک لمحے میں آج قسمتوں کی ساری شکن مٹ جائے گی۔

کتنی خوش نصیب ہوں گی وہ مادران ملت جو سپیدہ سحر کی روشنی میں اپنے نوجوان صاحبزادوں کا نذرانہ لئے سرکار رسالت ﷺ میں حاضر ہوں گی۔

آہ! کتنی قابل رشک ہوں گی ان کی یہ التجا یا رسول اللہ ﷺ! ہم اپنے جگر کے ٹکڑے آپ کے قدموں پر نثار کرنے لائی ہیں۔ اسی آرزو میں انہیں دودھ پلا پلا کر جوان کیا تھا کہ ایک دن ان کے لہو سے دین کا چمن سیراب ہوگا۔

یارسول اللہ ﷺ! ہمارے ارمانوں کی یہ حقیر قربانی قبول فرمالیں۔ سرکار عمر بھر کی محنت وصول ہوجائے۔

یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آواز بھر گئی۔ بچہ ماں کو روتا دیکھ کر مچل گیا۔ ماں نے کہا! بیٹا ضد نہ کرو۔ دل کی چوٹ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔

میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں۔ کاش آج میری گود میں بھی کوئی نوجوان بیٹا ہوتا تو میں اپنا نذرانہ شوق لئے رحمت عالم کی بارگاہ میں حاضر ہوتی۔ افسوس! کہ آج آخرت کے سب سے بڑے اعزاز سے محروم ہوگئی۔

یہ کہتے کہتے پھر دل کا درد جاگ اٹھا۔ پھر غم کی تپش بڑھ گئی۔ اور پھر آنکھوں کے چشمے سے آنسو ابلنے لگے۔ بچے نے ماں کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے ماں! تمہاری گود تو خالی نہیں ہے۔ رحمت عالم ﷺ کے حضور میں سب اپنے نوجوان بیٹوں کو لے کر جائیں گی۔ تم مجھے کو لے کر چلو۔

ماں نے چکارتے ہوئے جواب دیا۔ بیٹا! میدان کارزار میں بچوں کو نہیں لے جاتے وہاں تو شمشیر کی نوک سے دشمن کی صفیں الٹنے کے لئے نوجوانوں کے کس بل کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں سروں پر چمکتی ہوئی تلواروں کی بجلیاں گرتی ہیں۔ وہاں نیزوں کی انی سے کفر کے جگر میں شگاف ڈالا جاتا ہے۔ میرے لال وہ قتل وخون کی سرزمین ہے۔ تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔

بچے نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی کمسنی کے باعث ہم میدان کارزار میں جانے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضری کے لئے تو عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہماری قربانی سرکار نے قبول فرمالی تو زہے نصیب! اور اگر بچہ سمجھ کر واپس کر دیا تو کم از کم اس کا تو غم نہیں رہے گا کہ اسلام کے لئے جان کی نذر پیش کرنے سے ہم محروم رہ گئے۔ جان چھوٹی ہو یا بڑی بہر حال جان ہے اور جان ہونے کی حیثیت سے دونوں کی قسمت میں کوئی فرق نہیں۔

ماں نے فرط محبت میں بچے کا منہ چوم لیا اور حیرت سے منہ تکنے لگی۔ اس کمسنی میں داناؤں جیسا شعور صرف اس رحمت خاص کا صدقہ ہے۔ جو یتیموں کا نگران ہے۔

سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ جلوہ زیبا کے پروانے آنکھوں میں خمار شوق لئے مسجد نبوی ﷺ کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ درد آشنا دلوں کے لئے ایک رات کا لمحہ فراق بھی طویل مدت کی طرح بوجھل ہو گیا تھا۔ حجرہ عائشہ کے خورشید کی پہلی کرن کے نظارہ کے لئے ہر نگاہ اشتیاق آرزو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

نماز فجر کے بعد مسجد نبوی ﷺ کے میدان میں مجاہدین کی قطاریں کھڑی ہوگئیں۔ جو نوجوان محاذ جنگ پر جانے کے قابل تھے۔ انہیں لے لیا گیا۔ باقی واپس کر دیے گئے۔ انتخاب کے کام سے فارغ ہو کر سرکار واپس تشریف لا ہی رہے تھے کہ ایک پردہ نشین خاتون پر نظر پڑی جو چھ سال کا بچہ لئے کنارے کھڑی تھی۔ سرکار ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا۔ "اس خاتون سے جا کر دریافت کرو۔ وہ بارگاہ رحمت میں کیا فریاد لے کر آئی ہے۔" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے قریب جا کر نہایت ادب سے پوچھا۔

"دربار رسالت میں آپ کیا فریاد لے کر حاضر ہوئی ہیں۔" خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

آج رات کے پچھلے پہر آپ نے اعلان کرتے ہوئے میرے گھر کے سامنے سے گزرے اعلان سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میرے گھر میں جوان نہیں تھا۔ جس کے خون کی اسلام کی بارگاہ میں نذر پیش کرتی۔ چھ سال کا یہ یتیم بچہ ہے۔ جس کا باپ گزشتہ سال جنگ بدر میں جام شہادت سے سیراب ہو۔ یہی کل میری متاع زندگی ہے۔ جسے سرکار کے قدموں پر نثار کرنے لائے ہوں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور سرکار ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ سرکار ﷺ نے بچے کو آغوش رحمت میں جگہ دی۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا اور نہایت شفقت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

"میری رحمتوں کے محبوب صاحبزادے تم ابھی کمسن ہو۔ محاذ جنگ پر جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تم اپنی ماں کی آغوش میں پلو۔ بڑھو اور گلشن اسلام کی بہار بنو جب تمہارے بازو میں کس بل پیدا ہو جائے گی تو میدان جنگ خود تمہیں آواز دے گا۔"

بچے نے اپنی تتلاتی ہوئی زبان سے کہا۔ یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنی جان کو دیکھا ہے کہ جب وہ چولہا جلاتی ہیں تو پہلے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو سلگاتی ہیں۔ جب آگ دہکنے لگتی ہے تو پھر موٹی موٹی لکڑیاں ڈالتی ہیں۔

یارسول اللہ ﷺ! میں جنگ کرنے کے قابو تو نہیں ہوں لیکن کیا میدان کار زار گرم کرنے کے لئے مجھ سے تنکوں کا بھی کام نہیں لیا جا سکتا۔ اگر آپ مجھے اپنے ہمراہ نہیں لے گئے تو میری امی روتے روتے ہلکان ہو جائیں گی۔ وہ اس غم میں ہر وقت رہوتی رہتی ہے کہ آج میری گود میں بھی کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں بھی اسے اسلام کی نذر کر کے سرکار کی خوشنودی کا اعزاز حاصل کرتی۔

جن معصوم اداؤں کے ساتھ بچے نے زبان میں دل کے حوصلے کا اظہار کیا۔ سارے مجمع پر رقت طاری ہوگئی۔ سرکار بھی فرط اثر سے آبدیدہ ہوگئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ جا کر اس بچے کی ماں سے کہہ دو۔ کہ اس کی ننھی جان کی قربانی قبول کر لی گئی ہے۔ قیامت کے دن وہ غازیان اسلام کی ماؤں کی صفوں میں اٹھائی جائے گی۔

آج سے خدا کی ایک مقدس امانت سمجھ کر وہ بچے کی پرورش کا فرض انجام دے اور خدا کے یہاں بال بال کا اجر محفوظ رہے گا۔

شادی کی پہلی رات

حضرت حنظلہ، ایک شکیل وخوبرو نوجوان، حسن وزیبائی کا ایک گل رعنا اور عشق وایمان کا ایک دہکتا ہوا لالہ اپنے قبیلے میں ہر شخص کا محبوب نظر تھا۔ بار حیا سے پلکیں جھکی رہتی تھیں۔ شوق شہادت میں آنکھوں سے کوثر کی شراب ٹپکتی۔ عالم تنہائی میں بھی بے داغ جوانی کے انگ انگ سے کردار کا تقدس جھلکتا۔ عفیف و پاکباز حسن کی دلکشی بھی کتنی سحر انگیز ہوتی ہے؟ ایک حنظلہ اپنے قبیلے کے جمالستان میں ہزاروں آرزوؤں کی امید گاہ بن گئے تھے۔ انہیں خود خبر نہیں تھی کہ تصورات کی کتنی انجمنوں میں ان کی یادوں کے چراغ جل رہے ہیں۔ اس عالم فانی کی زندگی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے ایک بندہ مومن کے تمام ارمانوں کا مرکز صرف رسول کونین کی ہستی ہے۔ شمع رسالت کے پروانوں کے لئے اس گیتی پر ایمان سے زیادہ کوئی لذیذ چیز نہیں ہے۔ میکدہ عرفان کا بادہ نوش حسن وشراب کی سرمستیوں پر تھوکنا بھی اپنی بے نیازیوں کی توہین سمجھتا ہے۔

یہی وہ لافانی تصورات تھے جن کی لہروں میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی زندگی شرابور رہا کرتی تھی۔ صحبت رسول ﷺ کے فیضان سے ان کے روحانی تقدس کا فروغ اب اس نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا جہاں دامن تر کے ٹپکتے ہوئے قطروں سے گلہائے قدس کے لئے شبنم مہیا کی جاتی ہے۔

اس رنگ ونور کے پاکیزہ ماحول میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے دن گزرتے گئے، عمر کا کرواں آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے حسن و شباب کا خط نصف النہار پر پہنچ گیا تو ماں نے ایک دن بیٹے کے سامنے اس آرزوئے شوق کا اظہار کیا۔

"میرے ارمانوں کے شگفتہ پھول! تمہاری شادی کے لئے قبیلے کے ممتاز گھرانوں سے بہت سے پیغامات آرہے ہیں۔ اجازت دو تو کوئی مناسب پیغام منظور کرلوں۔"

بیٹے نے ماں کے قدموں کا بوسہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ میری زندگی کو اسیر شوق بنانے کے لئے یہی زنجیر بہت کافی ہے۔ جس کا نام اسلام ہے اب دل کا کوئی گوشہ التفات غیر کے لئے خالی نہیں ہے۔ چراغ قدس کے پروانے کو اسی شبستان میں رہنے دو ماں! جہاں دونوں جہان کی فراغت نصیب ہے۔ بے نیام تلواروں اور لالہ کی طرح سرخ میدانوں سے زندگی کی رفاقت کا عہد کرنے والوں کو اب اور کسی پیمان وفا کی طرف مت لے جاؤ۔ شہنشاہ کونین ﷺ کا منادی کب آواز دے دے، کسی کو کیا معلوم؟ ایک کفن بردوش مجاہد کو ہر وقت گوش برآواز ہونا چاہیے۔"

ماں نے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ لیکن بیٹا! رشتہ ازدواج بھی تو اسی شہنشاہ کونین کی سنت ہے جس کے حکم پر گوش برآواز رہنے کے لئے تم زندگی کی فراغت چاہتے ہو۔ شاید تمہیں اس کی خبر نہ ہو کہ تمہارے اسی موسم حیات کی بہار دیکھنے کے لئے میں نے کتنی صعوبتوں کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا ہے اور کتنے ہی آلام کی بھٹی میں سلگ سلگ کر میں نے اپنے محبوب امیدوں کو مرنے سے بچایا ہے۔ اپنی زندگی کی فصل بہار پر میرے مقدس ارمانوں کا کچھ حق تمہیں تسلیم ہو تو اجازت دو کہ میں تمہاری پیشانی پر مسرت وشادمانی کا ایک مہکتا ہوا چمن آباد کروں۔"

"فیروزمند بیٹے نے سپردگی کے انداز میں سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ اب میرے اندر مزید انکار کی جرات نہیں ہے۔ مادر مشفقہ کی خواہش کے احترام میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ آپ کی آنکھیں جس طرح بھی ٹھنڈی ہوسکیں میری طرف سے اجازت ہے۔

چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد قبیلے کے ایک معزز گھرانے کا رشتہ منظور کرلیا گیا۔ حنظلہ جیسے شکیل وخوبرو نوجوان کو پانے کے لئے جہاں بہت سے ارمانوں کا خون ہوا وہاں ایک آرزو پروان چڑھی اور قبیلہ کی سب سے حسین وجمیل دوشیزہ حضرت حنظلہ کے لئے منتخب کرلی گئی۔ بالآخر ایک خوشگوار شام کو نشاط وسرور کی پرنور فضا میں حضرت حنظلہ دولہا بنائے گئے اور نہایت سادگی کے ساتھ عقد نکاح کی رسم ادا کی گئی۔

آج شادی کی پہلی رات تھی۔ دو دھڑکتے ہوئے دل ہنگامہ شوق کے ایک نئے عالم میں داخل ہورہے تھے۔ پہلی بار ایک پارسا نوجوان کی نگاہ حسن و زیبائی کی نکھری ہوئی چاندنی میں خیرہ ہوکر رہ گئی تھی۔ ہر طرف ارمانوں کے ہجوم کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ دو عفت مآب روحوں کی البتہ تاریخ کے حوالہ سے اتنا ضرور سراغ مل سکا کہ رات بھیگ جانے کے بعد پس دیوار اچانک کسی منادی کی آواز فضا میں گونجی اور حضرت حنظلہ چونکہ اٹھے نشاط وطرب کے شوق انگیز لمحوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ چہرے پر ایک گہرے تجسس کا نشان ابھرا اور شدت اضطراب کے عالم میں کھڑے ہوگئے۔ دیوار سے کان لگا کر اعلان کے الفاظ کو دوبارہ غور سے سنا۔ دربار رسالت کا منادی آواز دے رہا تھا۔

کفر کی یلغار اسلام کی فصیل کی طرف بڑھتی آرہی ہے۔ ناموس حق کے پروانے بغیر کسی لمحہ انتظار کے رسالت کی سرکار میں حاضر ہوجائیں۔ مجاہدین اسلام کا صف شکن قافلہ تیار کھڑا ہے۔ سپیدہ سحر کی نمود سے پہلے پہلے میدان جنگ کی طرف روانہ ہوجائے گا۔"

اعلان کے الفاظ سینے میں ترازو ہوئے۔ اب حضرت حنظلہ اپنے آپ میں نہیں تھے۔ جذبات کے تلاطم کا عالم قابو سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ فرض نے انہیں مشکلات کے گھنے اندھیرے سے پکارا تھا۔ بےخودی کی حالت میں ایک بار نظر اٹھا کر اپنی نئی دلہن کو دیکھا۔ حسرتناک کرب کے ساتھ بڑی مشکل سے یہ

الفاظ اپنے منہ سے ادا کر سکے۔

جان آرزو! میدان جنگ سے اسلام نے آواز دی ہے۔ اب ہنگامہ شوق کے یہ خود فراموش لمحے ختم ہوئے۔ اجازت دو کہ مجاہدین کی اس قطار میں بڑھ کر شامل ہو جاؤں جو رسالت کی سرکار میں کھڑی ہے۔ زندگی نے وفا کی اور معرکہ کارزار سے بخیر و سلامت واپس لوٹ آیا تو پھر تمہاری زلفوں کی مہکتی ہوئی رات کا خیر مقدم کروں گا اور اگر خوش بختی سے میری زندگی کام آ گئی اور میرے جگر کا خون اسلام کی بنیاد میں جذب ہو گیا تو پھر قیامت کے ان شہید ان وفا کی صفوں میں تمہیں کہیں نہ کہیں ضرور ملوں گا۔ اچھا اب اجازت دو، وقت بہت نازک ہے۔

یہ کہتے ہوئے جیسے ہی قدم باہر نکالنا چاہتے تھے کہ بیوی نے دامن تھام لیا۔ اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بمشکل تمام یہ چند جملے ادا کر سکی۔

میخانہ کوثر کی طرف بڑھنے والے کو کون روک سکتا ہے۔ زحمت نہ ہو تو رسول کونین کے قدم ناز کی امان میں مجھے بھی لیتے چلو۔ کنیز کو ان کی بارگاہ کی آخری صف میں بھی جگہ مل گئی تو میں اپنی خوش نصیبی پر تا ابد نازاں ہوں گی۔"

حضرت حنظلہ نے دو لفظوں میں جواب دیا۔ سرمدی اعزاز کے استحقاق کے لئے تمہاری یہی قربانی کیا کم ہے کہ تم نے بھرپور بشاشت کے ساتھ عیش و نشاط کے ان دلفریب لمحوں کو اسلام کی ضرورت پر نثار کر دیا ہے

یقین رکھو! گلشن جاوید کی طرف میں تنہا نہیں جا رہا ہوں۔ تمہارے ارمانوں کا کارواں بھی میرے ہمراہ ہے۔ اچھا اب اجازت دو خدا تمہارے صبر و شکیب کی عمر دراز کرے۔"

یہ کہتے ہوئے حضرت حنظلہ گھر سے باہر نکل پڑے۔ جب تک نظر آتے رہے عقیدت بھری نگاہ اٹھتے ہوئے قدموں کا بوسہ دیتی رہی۔

رات کے پچھلے پہر جاں نثاروں کا لشکر دعاؤں کے ہجوم میں معرکہ کارزار کی طرف روانہ ہو گیا۔ جان رحمت سرور کونین ﷺ ناقہ مبارک پر سوار تھے۔ پیچھے پیچھے پروانوں کی قطار چل رہی تھی۔ سرکار کے رخ زیبا کی تنویر سے مجاہدین کے سینوں میں فاتحانہ شوکتوں کا چراغ جل اٹھا تھا۔

میدان جنگ میں پہنچ کر سرفروشان اسلام کی صفیں آراستہ ہو گئیں۔ کفار کے لشکر نے بھی اپنا مورچہ سنبھال لیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت طبل جنگ بجتے ہی گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمنوں کی صفوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ کی تلوار بجلی کا شرارہ معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے بے دریغ حملوں سے لشکر باطل میں ہر طرف ایک شور قیامت برپا تھا۔ حضرت حنظلہ کی پیاسی روح چشمہ کوثر کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی، عالم جاوید سے اب چند ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا اور زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ان کے جگر میں آ کر پیوست ہو گیا۔ لہو کے اڑتے ہوئے فوارے سے سارا پیراہن رنگین ہو کے رہ گیا۔ جب تک رگوں میں خون تھا۔ کلمہ حق کی سربلندی کے لئے فولاد کی دیوار بن کر کھڑے رہے۔ جب رگوں کی آگ بجھ گئی تو گھائل ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور چند ہی لمحے بعد روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

دوپہر ڈھلتے ڈھلتے کفار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو کھلی ہوئی فتح نصیب ہوئی۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب زخمیوں کو اکٹھا کیا گیا اور شہیدوں کی لاشیں جمع کی گئیں تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کی گمشدگی پر سارے لشکر کو حیرت تھی۔ جب وہ کہیں نہیں ملے تو سرکار کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی گئی۔ حضور ﷺ نے چند لمحے توقف فرمانے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"حنظلہ کی لاش کو عالم بالا میں فرشتے اٹھا کر لے گئے ہیں وہاں انہیں غسل دیا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی لاش سامنے موجود تھی بال بھیگے ہوئے تھے خون آلود پیراہن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

مدینہ پہنچ کر جب گھر والوں نے ان کے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ رات کہ گھر چلتے وقت ان پر غسل جنابت فرض ہو چکا تھا۔ اضطراب شوق نے فرض اتارنے کی بھی انہیں مہلت نہیں دی۔ غسل جنابت کا وہ فریضہ عالم بالا میں فرشتوں کے ذریعہ اتارا گیا۔

اسی دن سے حضرت حنظلہ کا لقب بارگاہ رسالت سے "غسیل ملائکہ" قرار پایا زندہ باد! اسلام کے قابل رشک فرزند! زندہ باد!

شادی کی ترنگ سے میدان جنگ تک

حبش کی تپتی ہوئی خاک سے اڑ کر جن ذروں نے عرش کی بلندیوں پر اپنا آشیانہ بنایا تھا ان میں ایک حبش نژاد عبداللہ اسود رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔

غلامی کی زندگی نے ان کے دل کی خاکستر کو اس طرح روند ڈالا تھا کہ ایک بجھے ہوئے چراغ کی طرح ان کی زندگی کی ساری امنگوں نے دم توڑ دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ زلف جاناں کی جو خوشبو مدینے سے اڑ کر خطۂ زمین میں دور دور تک پھیل گئی تھی، ایک دن انہیں بھی محسوس ہوئی، کسی راہ گیر نے ان سے کہا۔

"تم نے کچھ سنا ہے؟ دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے لئے مدینہ میں ایک نئی پناہ گاہ کھلی ہے، رحمتوں کے پیکر میں آسمان سے کوئی عجیب و غریب انسان اترا ہے دلوں کے کتنے ہی ویرانے اس کے قدم کی آہٹ سے آباد ہو گئے ہیں۔ مظلوموں، زیر دستوں اور مسکینوں کے لیے اس کی شفقتوں کی گود ہمیشہ کھلی رہتی ہے اس کی پلکوں کے سائے میں ہر وقت کام کا دریا لہراتا رہتا ہے، اس کی شاداب نگاہیں جلتے ہوئے زخموں کے لئے تسکین کا مرہم ہیں۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم بجھی ہوئی خاکستر کے لئے زندگی کی بشارت ہے۔

جلدی کرو! امیدوں کے قافلے زمین کے کناروں سے سمٹے ہوئے آ رہے ہیں تم بھی ان کی اڑائی ہوئی گرد میں شامل ہو جاؤ۔ اگر خوبیٔ قسمت سے تم مدینے کے نخلستان میں پہنچ گئے تو تمہاری پامال زندگی جگمگا اٹھے گی۔"

یہ خبر سن کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں فرط مسرت سے چمک اٹھیں، انہوں نے عالم تحیر میں دریافت کیا۔

" کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ اپنی سرشت کا کوئی نیا انسان ہو تو البتہ ایسا ہو سکتا ہے، ورنہ آج کی بھری دنیا میں مظلوموں اور زیر دستوں کا کوئی حامی ہے۔ روئے زمین کے جو غم نصیب میٹھے بول کے لئے ترس گئے ہیں بھلا انہیں شفقتوں کی گود میسر آ سکتی ہے اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے تو بہت اچنبھے کی بات ہے۔"

راہگیر نے پر جوش لہجے میں جواب دیا۔ "اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو مدینہ اسی خطۂ زمین پر واقع ہے، تم وہاں جا کر تجربہ کر لو، میں کہہ رہا ہوں کہ وہ انسانی پیکر میں ضرور ہے، لیکن اس دنیا کا انسان نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے وجود کا سر رشتہ کسی اور عالم سے ملتا ہے۔"

اس گفتگو کے بعد عبداللہ کے سینے میں ایک ایسی آتش شوق بھڑک اٹھی جس نے ان کی ہستی کا صبر و یقین چھین لیا۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی، بیتاب آرزوؤں کی راتیں قیامت کی طرح دراز ہو گئیں، ویرانوں سے انس بڑھ گیا آبادیوں سے وحشت ہونے لگی۔ یکایت ایک دن انہیں پتہ چلا کہ ملک شام کا کوئی تجارتی قافلہ مدینہ کے نخلستان سے ہوتا ہوا مکہ جا رہا ہے، یہ خبر معلوم کر کے خوشی سے ان کا چہرہ کھل گیا۔ ان کی پیشانی سے بشاشت کا نور ٹپکنے لگا وہ اضطراب شوق کی بیخودی میں اٹھے اور قافلے کی گزرگاہ پر کھڑے ہو گئے کئی دن کے انتظار کے بعد ایک دن دور سے انہیں اڑتے ہوئے غبار کا طوفان نظر آیا قافلے کی علامت دیکھ کر ان کی روح پر فرحت و انبساط کے بادل چھا گئے تھوڑی دیر کے بعد قافلے میں شامل ہوتے ہی ان کے دل کی دنیا بدل گئی۔ غم کا سارا بوجھ اتر گیا۔ شب و روز چلتے چلتے بالآخر ایک دن وہ حجاز کی سرحد میں داخل ہو گئے، کچھ اور فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک منزل پر قافلہ کے لوگوں نے مدینے کے راستے کی نشاندہی کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

اب وہ اکیلے ہی مدینے کی طرف چل رہے تھے۔ جذب شوق کے علاوہ اب کوئی ان کا شریک سفر نہیں تھا۔ متواتر کئی دن کی مسافت طے کرنے کے بعد انہیں کھجوروں کے جھنڈ نظر آئے، ان کے دل نے بے ساختہ آواز دی، شاید یہی مدینے کا وہ نخلستان ہے جس کی گود میں مظلوموں کی پناہ گاہ ہے اور کچھ ہی فاصلہ طے کیا تو مدینے کی پہاڑیاں چمکنے لگیں چند قدم چلے کہ اب مدینے کی وہ آبادی نظر کے سامنے تھی۔ جہاں پہنچنے کے لئے دل میں جذبہ شوق کا تلاطم برپا تھا۔

ایک وارفتہ حال دیوانے کی طرح جیسے ہی وہ مدینے میں داخل ہوئے گلی کوچوں میں لوگوں سے اپنی منزل مقصود کا پتہ پوچھنا شروع کیا ان کی بیقراری دیکھ کر ایک صاحب انہیں مسجد نبوی کے دروازے تک پہنچا کر واپس ہو گئے، مسجد کے فرش پر کونین کے شہنشاہ مدینے کے مسکینوں کو اپنی آغوش رحمت میں لئے بیٹھے تھے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پیش آئی جمال و نور کی زیبائی خود آواز دے رہی تھی کہ آؤ! کعبہ مقصود یہاں ہے۔ جیسے ہی چہرہ انور پر نظر پڑی دل کا عالم زیر و زبر ہو گیا۔ جذبہ شوق کی بیخودی میں آگے بڑھے اور قدموں پر سر رکھ گیا۔ آنکھوں کی راہ سے قلب و روح کا سارا غبار دھل گیا۔ روئے زمین کی روندی ہوئی ایک مشت خاک اب اس قدم کے نیچے آ گئی تھی جو کائنات کی سب سے باعزت جگہ تھی۔

مدتوں کی ایک پیاسی روح چشمہ رحمت سے سیراب ہو چکنے کے بعد اسلام و ایمان کے سر رشتے سے ہمیشہ کے لئے منسلک ہو گئی۔

اکرام و آسائش کے باغ فردوس میں پہنچ کر بالکل پہلی مرتبہ وہ روحانی مسرتوں کی ایک نئی زندگی سے روشناس ہوئے۔ اب عبداللہ اسود رضی اللہ عنہ کسی رہ گزر کا سنگریزہ نہیں تھے، سینہ صدف میں پرورش پانے والے گوہر کی طرح محفوظ تھے۔ جدھر نکل جاتے ایسا لگتا کہ شفقت و اعزاز کی ہر آغوش انہی کے

لئے کھلی ہوئی ہے۔ کبھی جس کا چوکھٹ پر کھڑا اہنا باعث عار تھا آج اسے پلکوں پر جگہ مل گئی تھی۔ آسمان سے اترنے والے اس "نئے انسان" کی آواز میں کتنا حیرت انگیز اعجاز تھا، جس نے پلک جھپکتے ہزاروں برس کا مزاج بدل دیا تھا۔ مدینے میں انسانی زندگی کا جو نیا پیمانہ رائج تھا اسے دیکھ دیکھ کر حضرت عبداللہ حیران رہا کرتے تھے۔

بارگاہ رسالت ﷺ کی شفقتوں نے انہیں اس طرح سینے سے لگالیا کہ وہ اپنی پامال زندگی کا سارا غم بھول گئے، مسجد نبوی کا صحن ان کی ساری امیدوں کا آشیانہ بن گیا تھا، کونین کی نعمتوں کے مرکز میں ان کے لئے کس بات کی کمی تھی۔ ہر وقت عشق و عرفان کی سرمستی میں وہ نہال و مسرور رہا کرتے تھے۔

ایک دن شام کا خوشگوار موسم تھا۔ زلف معنبر کی خوشبو سے سارا مدینہ مہک اٹھا تھا جلوؤں کی بکھری ہوئی چاندنی میں در و دیوار چمک رہے تھے اسی عالم میں حضرت عبداللہ اسود رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ آج ان کی حاضری کا انداز بالکل نرالا تھا۔ منہ کھول کر شاید کچھ کہنا چاہتے تھے۔

سرکار ﷺ نے بھی انے کے مچلتے شوق کا عالم محسوس فرمالیا۔ ارشاد فرمایا۔ کہو کیا کہنا چاہتے تھے؟

یہ سننا تھا کہ اچانک صبر وضبط کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور روتے بھی کہاں؟ آخر اس سرکار کے سوا اس گیتی پر اشکوں کے گوہر کا شناسا بھی کون تھا۔

سرکار ﷺ نے اپنی آستین میں ان کا آنسو جذب کرتے ہوئے فرمایا۔ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر مت روؤ! رحمت و کرم کا آبگینہ بڑا نازک ہوتا ہے، میں تمہارا معروضہ شوق سننے کے لئے ویسے تیار ہوں اپنا مدعا بیان کرو۔

اپنے دلگیر جذبات پر قابو پانے کے بعد انہوں نے اپنی تمنا کا یوں اظہار کیا

"سرکار ﷺ کے قدموں کی پناہ میں آجانے کے بعد زندگی کی ساری آرزو پوری ہوگئی آخرت کا بھی غم نہیں ہے کہ اس کے لئے سرکار کے دامن کا سہارا بہت کافی ہے۔ اب زندگی کی رفاقت کے لئے عہد شباب کی صرف ایک تمنا باقی رہ گئی ہے اور وہ شادی۔ حضورا کئی جگہ نکاح کا پیغام بھیجا لیکن کہیں بھی قبول نہیں کیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک سیاہ فام حبشی جس کا نہ کوئی گھر ہے نہ در ہے، نہ کوئی کمائی ہے نہ دھمائی ہے ایسے خانہ بدوش شخص کو کون اپنی لڑکی دے گا؟

حضور ﷺ کی چوکھٹ سے لگے رہنے کے علاوہ میرے پاس ہنر ہی کیا ہے کہ میں زندگی کے اسباب فراہم کروں۔ ساری کونین تو اسی سنگ در پر سمٹ آئی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ سرکار کے دست کرم میں کیا نہیں ہے۔ قسمت کی یہ پیچ بھی کھل ہی جائے گی۔ بس اک نگاہ کرم کی دیر ہے۔

کچھ اس دردناک عجز و نیاز کے ساتھ انہوں نے اپنی سرگزشت غم بیان کی کہ رحمت مجسم کو پیار آگیا۔ تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اپنے دل کو آزردہ نہ کرو۔ تمہارے رشتہ نکاح کا میں خود ذمہ لیتا ہوں۔ جاؤ! بنو کلب کے قبیلے کے سردار کو میرا پیغام پہنچا دو کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح تمہارے ساتھ کردے۔"

یہ حکم سنتے ہی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا چہرہ فرط مسرت سے پھول کی طرح کھل گیا۔ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ حضور کے حکم پر اپنی جان دے رہے ہیں وہ اپنی لڑکی دینے سے کیونکر انکار کرسکیں گے۔ انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ عرب کی سب سے حسین و جمیل دوشیزہ بارگاہ رسالت سے ان کے عقد نکاح کے لئے نامزد کی گئی تھی۔

دوسرے دن وہ علی الصبح خوشی کے ترنگ میں اٹھے اور سیدھے بنو کلب کے قبیلے کی طرف روانہ ہوگئے۔ آج کامیابی کی نشاط میں ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ انہیں زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ خوشی کا یہ لمحہ میسر آیا تھا۔

قبیلے کے سردار کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کون دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ جواب دیا۔ میں رسول اللہ کا قاصد ہوں سردار قبیلہ کے نام ان کا ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔"

رسول اللہ ﷺ کا نام نامی سنتے ہی دلوں کی سرزمین ہل گئی۔ سارے گھر میں خوشی کا ایک تہلکہ مچ گیا۔ دوڑے ہوئے آئے اور یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔ "اے رہے نصیب! میرے آقا نے کیا پیغام بھیجا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا میری زندگی کی معراج ہوگی کہ آج سرکار کی چشم کرم میری طرف متوجہ ہوگئی۔"

قاصد کو اعزاز کی مسند پر بٹھایا اور خود گوش بر آواز بن کر کھڑے ہوئے۔ گھر کی مستورات اور فرخندہ فال صاحبزادی بھی دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئیں۔

انتہائی شوق انتظار کے عالم میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سرکار کا یہ پیغام سنایا۔

حضور انور ﷺ نے آپ کی صاحبزادی کے نام میرے لئے پیغام نکاح بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ آپ اسے قبول کرلیں۔"

یہ سن کر سردار قبیلہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک عجیب کشمکش کا عالم ان پر طاری ہوگیا۔ ایک آقائے کونین کا حکم تھا جو کسی طرح بھی ٹالا نہیں جاسکتا تھا

دوسری طرف اپنی شہرہ آفاق بیٹی کا مستقبل جسے نظر انداز کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس شش و پنج کے عالم میں وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

حضرت عبداللہ نے ان کی خاموشی سے یہ محسوس کیا کہ انہیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے، فوراً یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ اس لئے اب میں واپس جا رہا ہوں۔ سرکار کے سامنے آپ کی اس کیفیت کا اظہار کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر جیسے ہی وہ دروازے کے باہر نکلے، سردار قبیلہ کی صاحبزادی چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی اور ایک اضطراب انگیز کیفیت میں آواز دی۔

"رسول عربی ﷺ کے معزز قاصد واپس لوٹ آؤ! اللہ کے رسول کا بھیجا ہوا پیغام میرے نام ہے میرے باپ کے نہیں۔ آزردہ خاطر ہو کر نہ جاؤ، مجھے یہ رشتہ منظور ہے"

یہ سنتے ہی قاصد کے قدم رک گئے۔ وہ واپس پلٹ آیا۔ اس کے بعد صاحبزادی اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔

"ابا جان! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ دونوں جہان میں اس سے زیادہ معزز رشتہ اور کہاں مل سکتا ہے۔ آپ یہ نہیں خیال فرماتے کہ کل محشر کی سرزمین پر سارے جہاں کی لڑکیوں میں یہ فخر صرف آپ کی بیٹی کو حاصل ہو گا کہ اس کا رشتہ نکاح سرور کونین ﷺ نے طے فرمایا تھا۔ اصل اعزاز وہاں کا ہے۔ یہاں کی جھوٹی عزت و شہرت میں کیا رکھا ہے۔

ہمارے خاندان کے لئے رہتی دنیا تک برقرار رہنے والی یہ عزت کیا کم ہے کہ خدا کے حبیب کی نگاہ انتخاب ہمارے گھر پر پڑی ہے۔ غلاموں کی بھری آبادی میں لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ لیکن یہ تو ہماری ہی قسمت ہے کہ سرکار کی نوازش بے پایاں کے ہم مستحق ہوئے۔"

بیٹی کی یہ گفتگو سن کر باپ کے سوچنے کا انداز اس طرح یکلخت بدل گیا جیسے کوئی چونک کر کسی پر پیچ راستے سے واپس پلٹ آئے۔ فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے قاصد سے متوجہ ہوئے۔

"سرکار ﷺ سے کہہ دینا کہ فرمان عالی میرے سر آنکھوں پر ہے۔ وہ جب چاہیں میں عقد نکاح کی مہم سرانجام دینے کے لئے حاضر ہوں۔"

یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مسرتوں کے خمار میں جھومتے ہوئے وہ بارگاہ رسالت ﷺ کی طرف واپس لوٹے، خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہی یہ بشارت سنائی۔

"حضور ﷺ! قبیلے کے سردار نے رشتہ نکاح منظور کر لیا۔ اس کی بیٹی بھی سرکار کے حکم کی تعمیل میں سربکف ہے۔"

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا! تو پھر اب دیر کیا ہے، جاؤ نکاح کا انتظام کرو بازار سے ضروری سامان خرید لاؤ۔ سامان کی خریداری کے لئے سرکار رسالت نے انہیں چند درہم عنایت فرمائے اور بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں جس سے بھی ملاقات ہوئی اسے خوشی کی ترنگ میں یہ خبر سناتے ہوئے کہا۔

"سرکار ﷺ نے فلاں سردار کی بیٹی سے میرا رشتہ نکاح طے فرما دیا ہے۔ نکاح کی مجلس میں آپ ضرور تشریف لائیے گا۔"

بازار میں جیسے ہی انہوں نے قدم رکھا، ایک منادی کی آواز کان میں گونجی۔

"میدان جنگ سے اسلام نے اپنے جاں نثاروں کو آواز دی ہے۔ سرفروش مجاہدین کا لشکر تیار کھڑا ہے، کوثر کی شراب کے متوالو چلو۔ خون سے بھیگی ہوئی سرزمین پر جنت کے اترنے کے دن آ گئے، خوش بختیوں کے میدان میں جو بھی سبقت لے جانا چاہتا ہے آگے بڑھے اور بے نقاب جلووں کا تماشا دیکھے۔"

یہ آواز سن کر حضرت عبداللہ چونک گئے فیصلہ کرنے میں ایک لمحے سے زیادہ کی تاخیر نہیں ہوئی انہوں نے سوچا۔ مومن کی ساری خوشی تو اسلام ہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ دین کی عزت کا پرچم سلامت رہا تو زندگی میں مسرت و نشاط کی سینکڑوں شامیں آ سکتی ہیں اور خدانخواستہ اسلام ہی کا سورج گہن میں آ گیا تو شادی کے لمحات کو خون آلود ہونے سے کون بچا سکتا ہے۔

یہ سوچ کر فوراً انہوں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ اور جو پیسے وہ شادی کا سامان خریدنے کے لئے لائے تھے ان سے سامان جنگ خرید لیا۔ اور چپکے سے لشکر کے ساتھ ہو گئے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں سرکار ہمیں واپس نہ کر دیں انہوں نے اپنا سارا جسم کالے کمبل میں ڈھانپ لیا تھا تاکہ کوئی پہچان نہ سکے اور اسی ڈر سے، جب تک وہ میدان جنگ تک نہ پہنچ گئے لشکر کے بیچ میں نہیں آئے۔ کنارے کنارے چلتے رہے۔

اسلام کی زندگی کے لئے ذرا سرفروشی کا یہ اشتیاق تو ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس لئے چھپ رہے تھے کہ کوئی انہیں میدان جنگ کی طرف جانے سے نہ روک سکے۔ اور آج کا نوجوان اس لئے سر چھپانے کی جگہ تلاش کرتا ہے کہ کوئی اسے میدان جنگ کی طرف نہ کھینچ کر لے جائے۔

میدان میں پہنچ کر دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ جب خوب گھمسان کا رن چھڑ گیا تو حضور نے دور سے دیکھا کہ کالے کمبل میں لپٹا ہوا کوئی شخص بجلی کی طرح تلوار چلا رہا ہے۔ صرف اس کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ باقی سارا بدن چھپا ہوا تھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔

ہاتھ کی گردش کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ اسود ہیں۔ لیکن وہ یہاں کیسے؟ وہ تو مدینے میں نکاح کی تیاری کر رہے تھے۔ چند صحابہ نے بھی اس

کی تصدیق کی کہ یہ عبداللہ اسود ہی معلوم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی فتح مبین پر جب جنگ ختم ہوئی تو سرکار نے حکم دیا کہ شہیدوں اور زخمیوں کی لاشیں الگ الگ کی جائیں۔ چند شہدائے کرام کی لاشیں اکٹھی کی گئیں تو دیکھا گیا کہ عبداللہ اسود کی گردن سے خون کی ایک سرخ لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور پھول کی طرح چہرہ کھلا ہوا تھا۔

ان کی نعش جیسے ہی نظر کے سامنے آئی۔ سرکار مدینہ آبدیدہ ہوگئے اور ارشاد فرمایا "میں دیکھ رہا ہوں کہ عبداللہ اسود رضی اللہ عنہ کے لئے جنت کو دلہن کی طرح سنوارا گیا ہے۔ حوارانِ جناں انہیں اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے عام جاوید کا دولہا بنا رہی ہیں۔"

بیتاب آرزو

مدینے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر احد کے مقام پر آج حق و باطل کا زبردست معرکہ تھا۔ دنیائے کفر کے سارے سورما آہن و فولاد کے مہیب ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

ادھر سارے قبائل میں شور تھا کہ آج مدینے کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور صفحۂ ہستی سے اسلام کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔

ادھر مدینے میں جذبات کے ہیجان کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کو رات کاٹنی مشکل ہو گئی جونہی سویرا ہوا، چمکتی ہوئی تلواروں کی جھنکار سے کوچہ و بازار گونج اٹھے۔

ہر جوان سر بکف، ہر بچہ کفن بدوش، ہر عورت دست بدعا اور ہر بوڑھا شوق شہادت میں سرشار نظر آرہا تھا۔

رسول محترم ﷺ کے محبوب صحابی حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ، جو پاؤں سے لنگڑے تھے، وہ بھی معاذ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

لوگوں نے ہزار سمجھایا کہ تم معذور ہے، چلنا پھرنا مشکل ہے تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟

تمہارے چار بیٹے تو جا ہی رہے ہیں اب تمہارے ذمہ اسلام کا کون سا حق باقی رہ جاتا ہے۔

انہوں نے جذبات سے بیخود ہو کر جواب دیا۔

"اسلام کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے، اسلام کا حق یہ بھی ہے کہ کلمہ حق کی سربلندی کے لئے میری رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہو جائے اور میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔

میرے لئے کتنی بڑی محرومی کی بات ہے کہ میرے بیٹے تو جنت میں جائیں اور میں حسرت سے منہ تکتا رہوں۔"

اس بیتابی شوق میں گھر پہنچے تو بیوی نے دیکھتے ہی کہا۔

"جان بچا کر چھپنے والوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ احد کی طرف جاؤ آج وہی تمہاری منزل عیش ہے"

یہ طعنہ ایک تیز نشتر کی طرح جگر میں پیوست ہو گیا۔ زخم کی چوٹ سے آنکھوں میں آنسو آگئے تلوار اٹھائی نیزہ سنبھالا اور قبلے کی طرف رخ کر کے یہ رقت انگیز دعا مانگی۔

اللهم لا تعدني الى اهلي

اے اللہ! اب مجھے اپنے اہل و عیال میں واپس نہ لائیو!

اور شوق شہادت کے سرور میں گھر سے باہر نکلے۔ سیدھے بارگاہ رسالت میں حاضری دی، صلوٰۃ و سلام پیش کیا، بیٹھ گئے۔ چند لمحہ انتظار کے بعد جب سرکار متوجہ ہوئے تو عرض کیا۔

یارسول اللہ ﷺ سرفروش مجاہدین کا لشکر جنت کی طرف بڑھ رہا ہے مجھے بھی اجازت مرحمت فرمائیے، میں بھی شامل ہو جاؤں۔ "

سرکار نے ارشاد فرمایا۔

تم پر جہاد فرض نہیں ہے۔ تم معذور ہو۔ میدان کارزار میں جا کر کیا کرو گے "

ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ عرض کیا۔

"حضور ﷺ! بہت دنوں سے آرزو ہے کہ اپنے لنگڑے پاؤں سے جنت کی سرزمین پر چہل قدمی کروں۔ سنا ہے کہ میدان جنگ سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم کا ہے اس سے زیادہ قریب مسافت کی کوئی راہ مجھے نہیں مل سکتی۔

پاؤں تو ٹوٹ ہی چکا ہے، اجازت نہ ملی تو دل بھی ٹوٹ جائے گا حضور۔

مانتا ہوں کہ میدان کارزار میں جا کر کچھ نہیں کر سکوں گا لیکن اپنے مولیٰ کی خوشنودی کے لئے شہید تو ہو سکتا ہوں؟ ویسے میں معذور ضرور ہوں، لیکن گھائل ہو کر آپ کے قدموں میں تڑپنے کے لئے معذور نہیں ہوں آقا!

عالم قدس کا جمال اب ایک لمحہ کے لئے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ سر وبال دوش بن گیا ہے سرکار! میری درخواست قبول کر لی جائے لشکر آگے بڑھ رہا ہے۔ اب اجازت عطا فرما دیں"۔

بالآخر ان کے پرشوق اصرار پر حضور ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرما دی اجازت ملتے ہی وہ جھومتے ہوئے اٹھے اور مستانہ وار اداؤں کے ساتھ جست لگاتے، تڑپتے، اچھلتے لشکر سے جا ملے۔ اب ان کی آنکھوں میں یقین کی شمع جل رہی تھی اور نہایت بیتابی کے ساتھ اس ساعت ارجمند کا انتظار کر رہے تھے جب ابدی نیند کے لئے پلک جھپکے اور دوسرے ہی لمحہ آنکھ کھلے تو فردوس کا دلکش نظارہ سامنے ہو۔

احد کا میدان عاشقان اسلام کے قدموں کے نیچے بچھا جا رہا تھا۔ اور کہسار کی چوٹیاں جھک جھک کر بلند نیزوں کو سلام کر رہی تھیں، کوثر کی شراب وادی کے قریب ہی سے بہہ رہی تھی، جنت کا نگار خانہ پہاڑ کے دامن میں نصب کر دیا گیا۔ محرم آنکھوں پر غیب کے چہرے آج بے نقاب ہو گئے تھے۔ مخفی حقیقتیں اب حجابات کے پیچھے نہیں تھیں برملا نگاہوں کی زد پر تھیں۔

اسی عالم رنگ و نور میں مجاہدین کی صفیں آراستہ ہوئیں۔ ہیبت جلال سے دھرتی کا سینہ دہل گیا۔

وہ تماشہ بھی قابل دید نی تھا، جب لشکر کا والی، قطار کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر اپنے جاں نثاروں کی فلک پیما ہمتوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نقارہ جنگ بجا، مجاہدین آگے بڑھے۔ تلواریں چمکیں، بجلی گری، نیزے اٹھے، کمانیں جھکیں اور دونوں طرف سے گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

اسی عالم قیامت خیز میں حضرت عمر بن جموع کو دیکھا گیا کہ وہ بھی اپنے جذبہ ایمانی سے میدان میں بڑھے جا رہے ہیں۔ اور آواز لگاتے جاتے ہیں کہ قسم خدا کی میں جنت کا مشتاق ہوں۔ آؤ مجھے گھائل کرو، میں زخمی ہو کر تڑپنا چاہتا ہوں، دشمنان حق کے لہو سے میں اپنی تلوار کی پیاس بجھا چکا ہوں۔ اب میں خوب سیراب ہونا چاہتا ہوں۔ بس ایک جام کوثر کا انتظار ہے۔

اسی عالم شوق میں مچلتے، اکڑتے، سینہ تانے، رجز پڑھتے، آواز لگاتے، چلے جا رہے تھے کہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر آیا اور ان کے جگر میں پیوست ہو گیا۔

گھائل ہو کر گر پڑے، رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہو گیا ایک لمحہ کے لئے تڑپے اور خاموش ہو گئے۔

قریب جا کر دیکھا تو روح اس دنیا میں نہیں تھی فردوس کی سرزمین پر چہل قدمی کر رہی تھی۔

شہادت کا مشتاق کوثر کا جام خالی کر چکا تھا اور جنت کا شیدائی "دختران قدم" کے جھرمٹ میں مسکرا رہا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرو بن جموع کی اہلیہ شہادت کی خبر پا کر میدان احد میں آئیں۔

چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:

عمرو تمہیں سرمدی نعمتوں کی یہ سرخروئی مبارک ہے۔ حسینان فردوس کی انجمن میں مجھے بھول نہ جانا پیارے اسی کے لئے دروازے تک میں نے تمہیں رخصت کیا تھا۔

مجھے اپنی بیوگی کا غم نہیں، تمہاری شہادت کی خوشی ہے۔ خدا اس خوشی کو سلامت رکھے۔ یہ کہہ کر بھیگی پلکون کے سائے میں انہوں نے اپنے اونٹ کو بٹھایا۔ اور جنت البقیع میں دفنانے کی غرض سے شوہر کی لاش کو اس پر بار کیا۔ کونہی اونٹ کی مہار پکڑ کر مدینے کی طرف بڑھیں کہ اچانک اونٹ بیٹھ گیا۔ ہزار کوشش کی لیکن اونٹ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ دوڑی ہوئی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

اونٹ کو یہی حکم ہے وہ تقدیر الٰہی سے سرتابی نہیں کرے گا۔ اچھا بتاؤ کیا دم رخصت عمرو بن جموع گھر سے کچھ کہہ کر چلے گئے تھے۔۔

عرض کیا:

ہاں! قبلہ رو ہو کر یہ دعا مانگی تھی۔

اللھم لا تعدنی الی اھلی : یا اللہ مجھے اپنے اہل و عیال میں واپس نہ لائیو۔

ارشاد فرمایا۔

ان کی دعا قبول ہو گئی۔ اب ان کی لاش مدینے واپس نہیں جا سکتی۔ انہیں یہیں دفن کر دو۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جنت میں لنگڑاتے ہوئے چل رہے ہیں "

تیری منزل پہ پہنچا کوئی آسان نہ تھا سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے آج بھی احد کی وادی میں یہ آواز کبھی کبھی سنائی دیتی ہے۔ میدان جنگ سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم ہے۔ آخرت مسافروں پر اس سے زیادہ قریبی مسافت کی کوئی راہ آج تک نہیں کھلی۔ چند روزہ زندگی کے معاوضہ میں دائمی زندگی کا کاروبار یہیں سے ہوتا ہے۔

محفل حرم

سرور کائنات ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ خرید وفروخت کے وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ گھوڑا بیچ کر اعرابی مکر گیا۔ لوگوں نے ہزار سمجھایا کہ تیری نیت خراب ہوگئی ہے رسول کی زبان سے سچ کے سوا دوسری بات نہیں نکل سکتی۔ اس نے جواب دیا سچ ہے تو گواہ پیش کرو۔
لیکن صحابہ واقعہ کے وقت موجود نہ تھے اس لئے گواہی نہ دے سکے۔ اتنے میں کہیں سے حضرت خزیمہ آ گئے۔ انہوں نے اعرابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے اپنا گھوڑا سرکار کے ہاتھ بیچا ہے۔ اعرابی خاموش ہوگیا اور گھوڑا حوالے کرنا پڑا۔
سرور کائنات ﷺ حضرت خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا۔ "خزیمہ؟ تم واقعہ کے وقت موجود تھے ہی نہیں۔ تم نے شہادت کیسے دی؟
خزیمہ نے جواب دیا۔ یارسول اللہ ﷺ آپ کی زبان حق ترجمان سے سن کر جب آسمان کی خبر پر ہم شہادت دیتے ہیں تو زمین کی خبر پر ہمیں شہادت دینے میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟
یقین کا چشمہ حقیقی آپ کی زبان ہے۔ ہماری آنکھ نہیں۔
سرکار یہ جواب سن کے بے حد مسرور ہوئے اور انعام خسروانہ کے طور پر اس دن سے یہ قانون بن گیا کہ حضرت خزیمہ کی ایک گواہی دو گواہوں کے برابر ہے۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دربار خلافت کھلا ہوا تھا۔ مقدمات پیش ہو رہے تھے مظلوموں کی دادرسی کا سلسلہ جاری تھا کہ ناگہاں ایک خوبصورت نوجوان کو دو طاقتور آدمی پکڑے ہوئے لائے اور فریاد کی۔
امیر المومنین! اس ظالم سے ہمارا حق دلوایا جائے۔ یہ ہمارے بوڑھے باپ کا قاتل ہے۔ امیر المومنین نے خوبصورت نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ تم صفائی میں جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ سکتے ہے۔
نوجوان نے بیان دیا! میرا اونٹ ایک باغ میں چلا گیا۔ باغ کے بوڑھے مالک نے پتھر مار کر میرے اونٹ کی آنکھ پھوڑ دی۔ میں نے بھی طیش میں پتھر کھینچ کر اسے مارا۔ میرا ارادہ اس کے قتل کا نہیں تھا۔ لیکن میری شامت سے وہ مر گیا۔
امیر المومنین نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے فرمایا۔ چونکہ تم نے اقبال جرم کرلیا۔ اس لئے اسلام کے قانون تعزیرات کے مطابق تم سے قصاص لیا جائیگا۔ خون کا بدلہ خون!
نوجوان نے کہا۔ اسلام کے قانون اور عدالت کے سامنے میں اپنا سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ لیکن اتنی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میرا ایک نابالغ بھائی ہے۔ باپ نے مرتے وقت اس کے حصے کا سونا میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے اسے ایک ایسی جگہ دفن کردیا ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اگر میں سونا اس کے حوالے نہ کرسکا تو قیامت کے دن اپنے باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس لئے مجھے تین دن کی مہلت دی جائے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر واپس آجاؤں تو مجھ پر قصاص جاری کیا جائے۔
امیر المومنین نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا۔ عدالت کے سامنے اپنا ضامن پیش کرو۔
نوجوان نے حاضرین مجلس پر ایک اُمید بھری نگاہ ڈالی۔ ساری مجلس میں کوئی بھی اس کا شناسا نہ تھا۔ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک صحابی رسول حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور آواز دی۔ امیر المومنین! میں اس نوجوان کا ضامن ہوتا ہوں اسے تین دن کی مہلت پر رہا کردیا جائے۔
ایک جلیل القدر صحابی کی ضمانت پر نوجوان کو رہا کردیا گیا۔
آج تیسرا دن تھا۔ دربار خلافت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں مدعی بھی حاضر تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ لیکن نوجوان ابھی تک پلٹ کر نہ آیا تھا۔ جوں جوں انتظار کا لمحہ گزرتا جاتا تھا لوگوں کی تشویش بڑھتی جاتی تھی۔
مدعیوں نے کہا۔ ابوذر؟ ہمارا مجرم کہاں ہے؟ جواب دیا۔ تیسرے دن کا پورا حصہ جب تک نہ گزر جائے اس کا انتظار کرو۔ اگر وہ وقت مقررہ پر نہیں آیا تو قصاص کے لئے میری گردن حاضر ہے۔
حضرت ابوذر کے اس جواب پر صحابہ آبدیدہ ہوگئے اور ان کا اضطراب بڑھ گیا۔ صحابہ نے بڑی لجاجت کے ساتھ نوعمر مدعیوں سے کہا۔ تم خون بہا قبول کرلو۔ مدعیوں نے جواب دیا۔ ہم خون کا بدلہ خون چاہتے ہیں۔
امید وبیم کا یہی عالم تھا کہ سامنے اڑتا ہوا غبار نظر آیا۔ گرد ہٹی تو پسینے میں شرابور مجرم نوجوان کھڑا تھا۔ تماشائیوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ امیر المومنین نے نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

سزا تمہیں بعد میں دی جائے گی پہلے ایک بات سنو۔ تمہیں تین دن کی مہلت ملی۔ تمہارا پتہ نشان بھی کسی کو نہیں معلوم تھا۔ سزائے موت سے بچنے کے لئے تم فرار بھی ہو سکتے تھے۔

نوجوان مجرم نے بھیگی پلکوں کے سائے میں کھڑے ہو کر جواب دیا۔

امیر المومنین! میں فرار ہو کر کہاں جاتا؟ یہاں نہ سہی۔ وہاں سزا ملتی۔ لیکن قیامت تک اسلام کے دشمن یہ طعنہ دیتے کہ محمد ﷺ کے غلام عہد شکن ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ زمین پر میرے خون کا دھبہ چند دنوں کے بعد مٹ جائے گا۔ لیکن عہد شکنی کا دھبہ اسلام کے دامن پر ہمیشہ کے لئے نمایاں رہے گا۔

نوجوان کے اس بیان پر لوگوں کے دل بھر آئے۔ آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور اسلام کی اس رقت انگیز محبت پر صحابہ کرام کا پیمانہ درد لبریز ہو گیا۔

اب امیر المومنین حضرت ابوذر غفاری سے مخاطب تھے۔ "ابوذر" تم بغیر سوچے سمجھے ایک ایسے شخص کے ضامن بن گئے جس کے ساتھ نہ تمہاری کوئی شناسائی تھی نہ اس کا پتہ نشان سے تم واقف تھے۔ ایک راہگیر پردیسی کی سزائے موت کا بار تم نے اپنے سر لے کر کتنا المناک اقدام کیا تھا؟ اگر خدانخواستہ وہ نہ آتا تو آج ابوذر کے ماتم میں مدینے کا کیا حال ہوتا؟"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ "امیر المومنین!" ایک ابوذر نہیں! ایک ہزار ابوذر مدنی سرکار کی ادائے رحمت پر قربان ہیں۔ ایک غریب الوطن مجرم، تاجدار کونین کے غلاموں کے درمیان کھڑا اپناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور نگاہوں کا یاس مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے سوچا! وقت کا قافلہ گزر جائے گا نشان قدم باقی رہے گا۔ کہیں آنے والی دنیا یہ نہ کہہ دے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں میں اتنی بھی غمگساری کا جذبہ نہیں تھا کہ اپنے ہی ایک بھائی کو تین دن کے لئے پناہ دے دیتے۔

امیر المومنین! کیا یہ طعنہ کہ مدینے کی بھری آبادی میں ایک غریب الوطن مجرم کو کوئی ضامن نہ مل سکا۔ ہمیں مرجانے کے لئے کافی نہ تھا؟ ہم ضامن نہ ہوتے جب بھی آج ہماری موت کا دن تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جواب دے کر جونہی بیٹھے۔ دونوں مدعی کھڑے ہو گئے۔

امیر المومنین! تاریخ اسلام کی شاہراہ روشن کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔ ہم بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ آنے والا مورخ مدنی سرکار کے غلاموں کو یہ طعنہ دے کہ ان میں اتنا بھی جذبہ رحم نہیں تھا کہ واپس لوٹ کر آنے والے مجرم کو معاف کر دیتے۔

"امیر المومنین! گواہ رہئے! کہ ہم اپنے باپ کے خون کا دعویٰ واپس لیتے ہیں اور دل کی اتھاہ گہرائی سے اپنے ایک بھائی کو معاف کرتے ہیں۔"

مدعی ابھی بیان دے ہی رہے تھے کہ عدالت فاروقی، مبارکباد کے شور سے گونج اٹھی۔ ہر آنکھ خوشی پر نم تھی۔ ہر چہرہ شگفتہ تھا۔ ہر نظر مخمور تھی۔ اور ہر دل بادہ مسرت میں سرشار تھا۔

لیکن وقت کا کاروان یہ درد انگیز نظارہ دیکھ کر حیران تھا۔ حیرت میں دیکھتا چلا گیا۔ کیا وہ وقت پھر پلٹ نہیں آسکے گا۔

ردائے لالہ وگل پردہ مہ وانجم جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

آرزوؤں کا انتخاب

مدینے کی وہ رات جس کی صبح کو معرکہ بدر کے لئے روانگی تھی، عید کی شب سے کم نہیں تھی۔ آرزوؤں کی ترنگ میں روحیں اس طرح شرابور تھیں کہ ہر آنکھ سے کوثر کی شراب کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ رات کی تنہائی میں ایک جگہ بیٹھ کر دو سرے فروش نوجوان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شاید طلوع ہونے والی صبح تمنا کی کوشی میں ان کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ عالم شوق کی سرمستی میں گفتگو اتنی والہانہ ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی پلکوں کا دامن بھیگ جاتا تھا۔

جذبات کے تلاطم میں بیخود ہو کر ایک ساتھی نے دوسرے ساتھ سے کہا "طلوع سحر میں اب چند ہی گھڑیوں کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ محویت شوق کا یہ خاموش عالم شاید پھر نہ مل سکے اس لئے آؤ کل کے پیش آنے والے معرکہ جنگ کے لئے اپنے رب کے حضور میں اپنی سب سے محبوب آرزو کی دعا مانگی جائے۔"

یہ سنتے ہی فرط مسرت سے دوسرے ساتھ کا چہرہ کھل اٹھا۔ والہانہ جذبہ شوق میں اس پیشکش کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواب دیا، نہال آرزو کی شادابی کے لئے اس سے زیادہ کیف بار لمحہ اور کیا مل سکتا ہے میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو، تمہاری دعا پر میں آمین کہوں گا۔

اب دل کا عالم قابو سے باہر ہو چلا تھا روح کی گہرائی سے لے کر پلکوں کی چلمن تک، ساری ہستی ایک پرسوزی میں ڈوب گئی تھی۔ اٹھتے ہی دعا کے یہ الفاظ رات کی خاموش فضا میں بکھر گئے۔

خداوند! کل میدان جنگ میں دشمن کا سب سے بڑا سورما اور جنگ آزمودہ بہادر میرے مقابلے پر آئے میں اس پر شیر کی طرح ٹوٹ پڑوں، پہلی ہی ضرب میں اس کی تلوار کی دھار موڑ دوں، اس کے نیزے کے ٹکڑے اڑا دوں، اور اپنی نوک شمشیر اس کے سینے میں پیوست کر کے اسے زمین پر تڑپتا ہوا دیکھوں۔ ٹھیک اس وقت جبکہ وہ شدت کرب سے چیخ رہا ہو میں اس کے قریب جا کر آواز دوں کہ تیرے کفر کا غرور ٹوٹ گیا۔ جس غیبی قدرتوں کا تو نے مذاق اڑایا تھا۔ دیکھ آج اس نے بادلوں کی اوٹ سے اپنے جلال و جبروت کا لشکر اتار دیا ہے آج اس کے محبوب پیغمبر کی فیروز مندیوں کے ظہور کا دن ہے۔ پھر اس کا سر قلم کر کے ہمیشہ کے لئے ذلتوں کی خاک پر روندے جانے کے لئے پھینک دوں۔

اب دوسرے ساتھی نے اپنی دعا کا آغاز یوں کیا۔

الٰہ العالمین! میری آرزو یہ ہے کہ کل کے پیش آنے والے معرکہ جنگ میں میرا مقابلہ دشمن کے کسی جیوٹ اور دلیر سپاہی سے ہو وہ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میرے مقابلے پر آئے۔ شوق شہادت میں مدہوش ہو کر میں اس کی طرف بڑھوں۔ وہ میرے اوپر حملہ کرے۔ میں اس کے اوپر وار کروں، لڑتے لڑتے میں گھائل ہو جاؤں۔ میرا سارا جسم زخموں سے چور چور ہو جائے۔ اسلام کا عشق میری رگوں سے خون کی ایک ایک بوند کا خراج وصول کرے۔ یہاں تک کہ میں بیتاب ہو کر زمین پر گر پڑوں۔ دشمن میرے سینے پر سوار ہو کر میرا سر قلم کر لے، میری ناک کاٹ دے، میری آنکھیں نکال لے، میرے چہرے کی ہیبت بگاڑ دے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

اس کے بعد میں اس حال میں تیرے سامنے پیش کیا جاؤں کہ میری ناک کٹی ہوئی ہو، آنکھیں نکال لی گئی ہوں، کان جدا کر دیئے گئے ہوں، زخموں کے نشانات سے چہرے کی ہیبت بگاڑ دی گئی ہو۔ پھر سر سے پا تک خون میں نہائے ہوئے اپنے ایک مسکین بندے کو اس حال میں دیکھ کر تو دریافت کرے۔

یہ تو نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے، میری دی ہوئی آنکھیں کیا ہوئیں کان اور ناک کہاں پھینک آئے، تیرا خوبصورت چہرہ کیسے بگڑ گیا۔

پھر میں جواب عرض کروں۔

"رب العزت تیرے اور تیرے محبوب کی خوشنودی کے لئے یہ سب کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ صرف اس تمنا میں میرا یہ حال ہوا کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے حبیب کو میں راضی کر لوں۔"

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دونوں وارفتہ حالوں کی یہ پرسوز دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبول ہوگئیں۔ دوسرے دن میدان جنگ میں دونوں کے ساتھ وہی حالات پیش آئے جو اپنے رب کے حضور میں انہوں نے بطور دعا مانگی تھی۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ دشمن پر فتح پانے کی دعا تو سبھی مانگتے ہیں لیکن اپنی ہستی کو دشمن کے حوالے کر دینے کی دعا تو ایک دم نرالی ہے۔

ایسی آرزو اسی کے سینے میں مچل سکتی ہے جس نے شہیدوں کی زندگی کا عروج ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور جس کی نگاہ میں مدنی محبوب کا ایک جاں نواز تبسم ساری متاع زندگی پر حاوی ہو گیا ہے۔

دیوانہ عشق

تاجدار کشور ولایت حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کی مجلس وعظ کا ایک پر سوز واقعہ عشق الٰہی کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔

فرماتے ہیں کہ ایک دن بغداد کے سب سے وسیع میدان میں ان کا جلسہ وعظ منعقد ہوا۔ جونہی انہوں نے تقریر شروع کی ہر طرف آہوں کا دھواں اٹھنے لگا۔

خشیت الٰہی کی ہیبت سے کلیجے شق ہو گئے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو فرط اثر سے اشکبار نہ ہو۔ اثنائے وعظ میں احمد بن یزید نامی خلیفہ بغداد کا ایک مصاحب بڑے کروفر سے آیا اور ایک طرف مجلس میں بیٹھ گیا۔

اس وقت آپ یہ فرما رہے تھے کہ تمام مخلوقات میں انسان سے زیادہ ضعیف کوئی مخلوق نہیں ہے۔ لیکن باوجود اس ضعف کے وہ خدا کی نافرمانی کرنے میں سب سے زیادہ جری اور بہادر ہے۔

احمد ابن یزید کے دل پر آپ کے اس جملے کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہیں وہ گھائل ہو کے رہ گیا۔ دل کے قریب ایک سلگتی ہوئی آگ نے ریاست وامارت کی ساری آن کو آن واحد میں خاکستر کر کے رکھ دیا اب اس کے پہلو میں ایک مسکین درویش کا دل تھا۔ شاہانہ کروجر کی دنیا بدل چکی تھی۔

وعظ کی مجلس ختم ہونے کے بعد جب گھر پہنچا تو ایک نامعلوم ہیجان سے دل کی دنیا زیروزبر ہو رہی تھی، ساری رات بے چینیوں کے اضطراب میں کٹی۔
صبح ہوتے ہی وہ حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ چہرے کی افسردگی، آنکھوں کا خمار اور آواز کی بے خودی بتا رہی تھی کہ یہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔

بڑی مشکل سے اتنے الفاظ کہہ سکا۔

حضور! رات کا نشتر جگر سے پار ہو گیا ہے عشق الٰہی کی آگ میں سلگ رہا ہوں۔ خدا کے سوا ہر چیز سے دل کی انجمن کو خالی کر لیا ہے۔ اب مجھے وہ راستہ بتایئے جو بارگاہ یزدانی تک پہنچاتا ہے۔ میری کشتی بیچ منجدھار میں ہے اسے ساحل تک پہنچا دیجئے۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر تسکین کا ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ صبر وشکیب سے کام لو رحمت الٰہی اس راہ کے مسافروں کی خود دستگیری فرماتی ہے تم نے دریافت کیا ہے تو سن لو کہ خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔

عام راستہ تو یہ ہے کہ فرائض کی پابندی کرو۔ سجدہ عبادت کے کیف سے روح کو سرشار رکھو گناہوں سے بچو، شیطان کی پیروی سے اپنی زندگی کو محفوظ رکھو مشاغل دنیا سے تعلق رکھتے ہوئے سرکار مصطفی ﷺ کی غلامی کا حق ادا کرو۔ اور خاص راستہ یہ ہے کہ دنیا سے بے تعلق ہو جاؤ، یاد الٰہی میں اس طرح بیخود ہو جاؤ کہ خدا سے بھی سوائے خدا کے کسی دوسری چیز کی طلب نہ رکھو۔

حضرت سری سقطی کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اچانک حضرت احمد بن یزید کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ عشق الٰہی کے اضطراب میں بیخود مستانہ وار جیب ودامن کی دھجیاں اڑاتے صحرا کی طرف نکل گئے۔ کچھ دنوں کے بعد احمد بن یزید کی ماں روتی ہوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آبدیدہ ہو کر عرض کیا۔

حضور! میرا ایک ہی فرزند تھا جسے دیکھ کر میں اپنی آنکھوں کی تشنگی بجھاتی تھی۔ چند دنوں سے وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ ہمارے پڑوسیوں نے خبر دی ہے کہ ایک شب وہ آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہوا تھا اسی وقت سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ آپ کے چند جملوں نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ آہ! اب مجھے اپنی اولاد کا ماتم کرنا ہو گا۔

حضرت نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اے ضعیفہ! صبر وشکر سے کام لے۔ تیرا بیٹا ضائع نہیں ہوا ہے۔ وہ جب بھی میرے پاس آئے گا میں تجھے خبر کر دوں گا خدا کی طرف بڑھنے والوں پر ماتم کا انداز اختیار کرنا خدا کی وفادار کنیزوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

چند ہی دنوں کے بعد گرد آلود چہرے، پراگندہ بال اور ایک سرشار دیوانے کی سج دھج میں احمد بن یزید حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی حضرت نے جلال عشق کا تیور پہچان لیا۔ اٹھ کر سینے سے لگا لیا۔ خیر وعافیت دریافت کی اور بہت دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔

اسی درمیان میں اس کی ماں کو اطلاع بھجوائی کہ تمہارا بیٹا آ گیا ہے آ کر ملاقات کر لو۔ ماں کو جیسے ہی خبر ملی اپنی بہو اور پوتے کو ساتھ لئے روتی پیٹتی اپنے بیٹے کے پاس آئی اور اس کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

بیٹا؟ تو اپنی بوڑھی ماں اور بیوی کو چھوڑ کو کہاں چلا گیا تھا۔ تیرے فراق میں روتے روتے ہمارے آنچل بھیگ گئے۔ انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں چل

واپس چل اپنے گھر کو آباد کر۔ ہماری امیدوں کا چمن مرجھا گیا ہے پھر سے اسے شاداب کر۔

بیوی نے فرط غم سے منہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ میرے سرتاج! آخر ہم سے کیا بھول ہوئی کہ تم اس طرح روٹھ کر چلے گئے۔ جیتے جی اپنے بچے کو تم نے یتیم بنا دیا۔ تمہارے سوا ہمارے ارمانوں کا کون نگران ہے۔

ماں اور بیوی نے ہزار منت و سماجت کی لیکن دیوانہ عالم ہوش کی طرف پلٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ روح پر سرور عشق کا اتنا گہرا نشہ تھا کہ ہزار جھجھوڑنے کے بعد بھی عالم نہیں بدلا۔

ایک دیوانہ عشق کا کیف دیکھنے کے لئے سارا شہر امنڈ آیا تھا۔ دیوانہ ایک بار پھر بیخودی کی حالت میں اٹھا اور صحرا کی طرف رخ کیا۔ قدم اٹھانا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے بیوی نے دامن تھام لیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگی۔

ہماری آرزوؤں کا خون کر کے جانا ہی چاہتے ہو تو اکیلے مت جاؤ اپنے اس بچے کو بھی ہمراہ لے لو!

اس آواز پر حضرت احمد ابن یزید کے قدم رک گئے۔ انہوں نے اپنے ننھے منے بچے کے جسم سے قیمتی لباس اتار کر اپنا پھٹا ہوا کمبل اس کے جسم پر لپیٹ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں زنبیل دی اور دوسرا ہاتھ پکڑ کر جونہی اسے اپنے ہمراہ لے کر چلے بیوی اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ سارا مجمع اس رقت انگیز عالم کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ ماں کو اپنے لخت جگر کی جدائی برداشت نہ ہو سکی۔ بے تحاشہ دوڑ کر اس نے بچے کو باپ کے ہاتھ سے چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

حضرت احمد ابن یزید نے پلٹ کر ایک بار اپنے بچے کو دیکھا اور پلکوں کا آنسو سینے کی تپتی ہوئی خاکستر میں جذب ہو کر رہ گیا۔ فضا میں ایک دردناک نعرے کی آواز گونجی اور لوگوں کے دل ہل گئے۔ آنکھ کھلی تو حضرت احمد بن یزید نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

چاندنی رات تھی۔ حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر سلام کیا اور کہا کہ میں احمد بن یزید کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں انہوں نے عرض کیا ہے کہ میری رحلت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ایسے نازک مرحلے میں حضور تشریف آوری میری تسکین خاطر کا ذریعہ ہو گی۔

یہ خبر سن کر حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے۔ حاضرین مجلس سے کہا کہ خدا کا ایک مسکین بندہ جس کے نالہ شبینہ سے صحرائے عشق میں ایک شور برپا تھا۔ افسوس کہ آج اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اب رات کی تنہائیوں کا پرسوز فریادی اور ویرانوں کا عبادت گزار ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ چلو اس چراغ حرم کی بجھتی ہوئی لو کو آخری بار دیکھ کر آئیں۔ رحمت پروردگار کے نزول کی یہ بہت اہم گھڑی آ گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اچانک اٹھے اور اس اجنبی شخص کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ بغداد کے ایک مشہور قبرستان میں پہنچ کر وہ اجنبی شخص رک گیا۔ اور ایک نحیف و لاغر انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی ہے وہ عالم جاوید کا مسافر، جس نے دم رخصت آپ کو آواز دی ہے۔"

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے بالیں کے قریب بیٹھ کر آواز دی احمد بن یزید نے آنکھیں کھول دیں اور ہچکی لیتی ہوئی سانس میں کہا۔

میرے مرشد؟ گواہ رہنا کہ میں توحید الٰہی اور رسالت محمد کے اقرار پر اپنا دم توڑ رہا ہوں ایک بندہ سیاہ کار اپنے رب کے حضور اس حال میں جا رہا ہے کہ اس کا نامہ عمل گناہوں سے بوجھل ہے اسے زندگی کی طویل مہلت ملی لیکن اپنے پروردگار کی خوشنودی کا وہ کوئی سامان نہ کر سکا۔ یہ کہتے کہتے آواز حلق میں پھنس گئی۔ آنکھوں سے دو موتی ڈھلکے اور گریباں کی دھجی میں جذب ہو گئے۔ آنکھیں بند ہوتے ہی لبوں میں ایک جنبش پیدا ہوئی اور کلمہ شہادت کی مدہم سی آواز پر روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ سے مرگ عاشق کا یہ دردناک منظر نہیں دیکھا گیا۔ فرط غم سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔ تیری ادائے بے نیازی کے قربان! باغیوں کو حریر و دیبا کی مسند اور پھولوں کی سیج پر موت آتی ہے اور تیری مملکت کے وفا شعار مسکینوں کو ایک ٹوٹا ہوا بوریہ بھی میسر نہیں ہے۔

یہ کہہ کر تجہیز و تکفین کے ارادے سے شہر کی طرف جونہی پلٹے دیکھا کہ ہر طرف سے لوگوں کا ایک ہجوم چلا آ رہا ہے۔

اچنبھے سے دریافت کیا آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا۔ ابھی ابھی آسمان سے ایک غیبی آواز سنائی پڑتی ہے کہ جو لوگ خدا کے ایک ولی مقرب کے جنازے میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو وہ شونیز کے قبرستان میں جمع ہو جائیں۔ اس آواز کو سن کر سارا بغداد امنڈا ہوا چلا آ رہا ہے۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سن کر پھر آسمان کی طرف رخ کیا اور کہا "تیری شان بندہ نوازی کے قربان! زمین کی ننگی پیٹھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کو یہ اعزاز عمر بھر جو دشت غربت میں زندگی کی شام و سحر گزارتا رہا آج سارا بغداد اس کے قدموں میں تو نے جمع کر دیا۔ دنیائے فانی میں جس عاشق گمنام کی توقیر کا یہ حال ہے۔ عالم جاوید میں اس کی شوکتوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ "سچ کہا ہے تیری کتاب مجید نے کہ اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

کوچہ جاناں

عبداللہ عراق کا مشہور ڈاکو، خیز، غارت گر اور ستم پیشہ قاتل، آج ایک خوفناک مہم سے پلٹ کر اپنے گھر آیا تھا۔ کافی سے زیادہ رات گزر چکی تھی ساتھیوں نے رخصت ہوتے وقت دریافت کیا؟ سردار! دوسری مہم کی تیاری کب تک ہوگی؟

آج جانے کیا بات تھی کہ اس سوال پر عبداللہ کے چہرے سے خوشی کا کوئی نشان نہیں ظاہر ہوا، اس نہایت بے دلی سے جواب دیا ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تیاریوں کی اطلاع تمہیں وقت سے پہلے دی جائے گی۔ ساتھیوں کو رخصت کر کے جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تو ایک نہ معلوم کسک سے اس کا دل بوجھل تھا ہزار کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ وہ حیرانی کے عالم میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غفلتوں کی نیند بہت گہری تھی اس لئے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ لیکن اس مرتبہ دل کا بند دروازہ نیم باز ہو چکا تھا اور ہاتف غیب کی سرگوشیوں کے لئے گنجائش نکل آئی تھی۔

اچانک دل کے وزن سے کوئی بہت دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ظالم! ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھ! تیرے نامہ زندگی کا ایک ایک ورق سیاہ ہو چکا ہے۔ مظلوموں کی آہ، بے گناہوں کے خون اور معاصی کے بوجھ سے تیری مغرور گردن اب ٹوٹنا ہی چاہتی ہے۔ مرنے کے بعد جب تو ایک باغی مجرم کی طرح خدائے قہار کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تو دہشت وجلال سے تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا انجام کی رسوائی اور جہنم کے ہولناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اب بھی وقت ہے۔ اٹھ! اور اپنے خاکی جسم سے شیطان کا یہ پیراہن اتار کر پھینک دے۔ مغفرت وکرم کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ جیسے بھی ممکن ہو اپنے روٹھے ہوئے مولی کو راضی کر لے۔

ہاتف غیب کی یہ خاموش صدا نہایت تیز نشتر کی طرح عبداللہ کے جگر کے پار ہوگئی اور اسے تڑپتے ہوئے بسمل کی طرح گھائل کر گئی۔

اب دل کی اندرونی حس بیدار ہو چکی تھی اور عمر بھی کی کثافتوں کی غبار آنکھون کی راہ سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔ اسی عالم اضطراب میں عبداللہ اپنے بستر سے اٹھا اور رات کی تاریکی میں اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی جعفر کے گھر گیا۔ عبداللہ کی بے وقت آمد سے جعفر گھبرا اٹھا اس نے جلدی سے پوچھا کیا کسی فوری مہم کی تیاری ہے؟ ...... عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔

"ہاں! آج زندگی کی سب سے بڑی مہم ہے میرے دوست؟" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے سردار! ہچکیاں بھرتے ہوئے عبداللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے " جعفر! اس وقت میں ہولناک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوا ہوں اپنی سیاہ کار زندگی اور اس کے بھیانک انجام کے تصور سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدارا بتاؤ کہ ایک باغی مجرم کی طرح عمر کا جو حصہ میں گزارا ہے کیا اب کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟ کیا اس رحمت خاص کا کہیں سراغ لگ سکتا ہے جس کے تئیں نامہ عمل کی سیاہی دھونے کے لئے دیدہ شرمسار فقط ایک قطرہ کافی ہے۔

جعفر! میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں مجھے چراغ دکھاؤ۔ میں اپنے رب کی طرف پلٹنا چاہتا ہوں میری رہنمائی کرو میں گھائل ہو گیا ہوں میرے زخموں کی ٹیس کے لئے کوئی مرہم بتاؤ ....

اتنا کہتے کہتے عبداللہ کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ چپ ہو گیا ایک غمگسار چارہ گر کی زبان میں جعفر نے جواب دیا۔ دل کا یہ رقت انگیز انقلاب اور سوز وکرب کی یہ نئی منزل تمہیں مبارک ہو سردار! افسوس! کہ تمہاری طرح میں بھی اس کوچہ سے آشنا ہوں۔ البتہ اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ خدا کی تلاش میں نکلنے والے سب سے پہلے کسی مرشد کامل کی تلاش میں نکلتے ہیں! اسے پا لینے کے بعد خدایابی کی منزل بہت قریب ہو جاتی ہے کہتے ہیں کہ خدا تک باریابی کے لئے یہی ایک راہ اب تک کھلی ہوئی ہے باقی تمام راستے بند ہیں خدا کی طرف قدم بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارے لئے بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ کسی مرشد کامل کا دامن تلاش کرو۔

میں نے سنا ہے کہ مرشد کامل ہی اس راہ کے نشیب وفراز سے واقف ہوتا ہے مرشد کامل کے بغیر یہ راہ آج تک کسی نے بھی طے نہیں کی ہے عبداللہ!

جعفر کی اس بات پر عبداللہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اس کا سوکھا ہوا چہرا اس طرح کھل گیا۔ جیسے یاس کی تاریکیوں میں اسے امید کی کائی کرن نظر آ گئی ہو۔

ایک غم نصیب شکر گزار کی زبان میں اس نے جعفر کی ہمدردیوں کے جواب میں کہا۔

میرے دیرینہ ہمدم! تمہاری غمگسار رہنمائی کا شکریہ! تم نے میرے جلتے ہوئے زخموں پر جیسے تسکین کا مرہم رکھ دیا ہے اب اگر چہ میں مایوس نہیں ہوں لیکن میرے دوست! کسی مرشد کامل کی تلاش کا صحیح شعور بھی تو مشکل امر ہے اس مشکل کو بھی اب تم ہی آسان کرو تم ہی کسی مرشد کامل کا نشان بتاؤ میں اس کی گلی میں سر کے بل جاؤں گا۔ عبداللہ کے اس سوال پر جعفر ایک شریک غم کی طرح پھوٹ پڑا میرے محسن! تم شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ یاد رکھو! میرے خون جگر سے اگر تمہارے دل کی آگ پانی سے نہیں تجلیات کی خنکی سے بجھتی ہے۔

سردار! تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو کہ میرا اور تمہارا ماحول دونوں کا ایک ہی رہا ہے تمہاری ہی طرح میں بھی ان تمام چشموں سے گریزاں رہا ہوں جہاں خیال و عمل کی طہارت حاصل ہوتی ہے اس لئے تمہاری طرح مجھے بھی کسی مرشد کامل کا کوئی تجربہ نہیں ہے ویسے میرا اپنا خیال ہے کہ مرشد کامل کی تلاش بھی خدا کی تلاش کا نقطۂ آغاز ہے اس لئے اگر تم خدا کا نام لے کر اس مہم پر جو نکل پڑو تو مجھے یقین ہے کہ خدا تمہاری ضرور مدد کرے گا یہ راہ طے نہیں کی جاتی ہے سردار! کرائی جاتی ہے۔ جگر میں ٹیس اب بھی تھی لیکن زخموں کی جلن کم ہوگئی تھی یاس کی تاریکیوں میں آنے والا عبداللہ اب اکیلا نہیں تھا اس کے ہاتھوں میں امید کا چراغ بھی تھا۔ جعفر کی بات سن کی اضطراب شوق کے کو دفراموش عالم میں عبداللہ اٹھا اور سیدھا اپنے گھر لوٹ آیا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی رحمت یزدانی کے فرشتے آسمانوں کے دروازے کھول رہے تھے۔ ستاروں کی چاندنی میں اچانک ایک قافلہ نور زمین کی طرف اترتا ہوا نظر آیا شاید کسی فیروز بخت کی دعا آج شرف قبول سے سرفراز ہونے والی تھی۔

عبداللہ اپنی کوٹھری کے ایک تاریک گوشے میں چھپ کر رو رہا تھا۔ کبھی کبھی ہچکیوں کے درمیان رقت و کرب میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنائی دیتی تھی۔

اے مغفرت و کرم کے والی! ایک شرم سار مجرم کو اپنی رحمت کے وسیع دامن میں پناہ دے دے، اے تیرہ بختوں کی امید گاہ اپنی سیاہ کار زندگی سے تائب ہو کر آج میں تیری طرف پلٹ رہا ہوں تو اپنی اونچی بارگاہ سے ایک فریاد کی پکار سن لے، اے دل کے ٹوٹے ہوئے آبگینوں کو جوڑنے والے ہر طرف سے ٹوٹ کر اب تیری راہ میں قدم اٹھا رہا ہوں۔ بھیج دے کسی مرشد کامل کو۔ تیری دہلیز تک مجھے پہنچا دے! بے نیاز مولیٰ! میں تیری بارگاہ عظمت کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روؤں گا۔ مچل مچل کر تڑپوں گا اور زار زار فریاد کروں گا۔ یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ رات پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ جلدی جلدی اس نے دعا تمام کی چاروں طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور اللہ کا نام لے کر گھر سے نکل پڑا۔ حق کی تلاش میں اس کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا گلیوں اور پر پیچ راستوں سے ہوتا ہوا وہ ایک چوراہے پر جا کھڑا ہوا۔ نامعلوم طور پر دل کے یقین نے نشاندہی کی کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہی مرشد کامل کی ملاقات کی جگہ ہے انتظار میں کھڑے کھڑے کافی عرصہ بیت گیا۔ ستاروں کی آنکھیں ڈوبنے لگیں۔ امید و بیم کشمکش کا یہی عالم تھا کہ چند ہی لمحے کے بعد سے کچھ فاصلے پر حرکت کرتا ہوا ایک سایہ نظر آیا بے ساختہ دل نے آواز دی۔

"مرشد کامل آرہا ہے" پابوسی کے لئے شوق کی نگاہ جھکی۔ عقیدت نے قدم بڑھائے امیدوں نے خیر مقدم کیا اور قریب پہنچ کر اس نے عالم بے خودی میں پکارا۔"

مرشد کامل! میں تمہارا کب سے انتظار کر رہا ہوں آؤ میرے قریب آؤ! میرے کشور دل پر فرمانروائی کرو، مجھے مرید کر لو مجھے بے دام خرید لو۔ میں تمہارے ہاتھ پر اپنی متاع ہستی بیچ رہا ہوں مجھے اپنے کاکل و رخ کا غلام بنا لو میں اپنے نصیب دشمن آزاری کو تمہارے قدموں پر نثار کرتا ہوں۔ آنے والے نے حیرانی کے عالم میں جواب دیا۔ میرے بھائی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھ رہا ہوں تم جس کا انتظار کر رہے ہو وہ میں نہیں ہوں۔ میں اندھیری راتوں کا سیاح ہوں۔ مجھے اجازت دو تمہاری امدیوں کا مرکز کوئی اور ہوگا۔

عبداللہ نے دامن تھامتے ہوئے کہا میں کس کا انتظار کر رہا ہوں اور میری امیدوں کا مرکز کون ہو وہ جاننا تمہارا کام نہیں میرا کام ہے۔

خدا کے ایک بچھڑے ہوئے بندے کو خدا کے قریب کر دینا تمہاری ہستی کا سب سے اہم فریضہ ہے مرشد! دیر مت کرو مجھے جلد مرید کر لو تاکہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تمہاری رہنمائی میں میرے سفر کا دوسرا دور شروع ہو جائے۔"

آنے والے نے ذرا سنجیدہ ہو کر جواب دیا میرے بھائی! میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے میں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں میں کیا کہوں اور میرا پیشہ کیا ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو تم میرے منہ پر تھوک دو گے اس لئے بہتر ہے کہ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ جس مہم پر آج میں اپنے گھر سے نکلا ہوں اب اس کا وقت ختم ہو رہا ہے میرے ساتھ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

ہزار انکار کے باوجود اپنی ضد پر قائم تھا اور کسی طرح بھی اس دامن سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اب وہ بھی تنگ آچکا تھا اور ایک اجنبی دیوانے سے پیچھا چھڑانے کا کوئی حیلہ تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا........ تو! نہیں مانتے تو تمہیں مرید کر لیا۔ اب آج تم ہمارے ہاتھ بک گئے جس پر خطر راہ میں تم نے قدم رکھا ہے اسے سلامتی کے ساتھ طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے مرشد کی غیر مشروط اطاعت کرو میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں کھڑے رہو۔ جب تک میں واپس نہ آؤں یہیں کھڑے رہنا یقین رکھو واپسی کے بعد میں تمہیں وہ راستے طے کرا دوں گا جو بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچاتا ہے اچھا اب اجازت دو۔"

یہ کہتا ہوا وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس لوٹ گیا۔ جب تک وہ نظر آتا رہا۔ عبداللہ کی حسرت بھری نگاہیں اس کا قدم چومتی رہیں۔ صبح ہوگئی اور عبداللہ انتظار میں کھڑا رہا۔ دن چڑھے تک شہر کے ایک مشہور شخص کا گھنٹوں ایک جگہ کھڑا رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ ہر طرف سے آدمیوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگوں نے ہزار سمجھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلے لیکن سب کے لئے اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

میری ہستی کا فرمانروا، میرا مرشد کامل، مجھے حکم دے گیا ہے کہ جب تک پلٹ کر نہ آؤں تم یہیں کھڑے رہنا اب میں اس کی واپسی تک یہاں سے کہیں نہیں ٹل سکتا وہ وعدہ کر گیا ہے کہ مجھے بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچا دے گا۔

لوگوں نے اصرار کرتے ہوئے کہا، رات بھی ختم ہوگئی اب دن کا آخری حصہ گزر رہا ہے اسے واپس آنا ہوتا تو اب تک آ گیا ہوتا اب اس کا انتظار بے سود ہے اس نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا ہے، عبداللہ نے یقین کے تیور میں شرابور ہو کر جواب دیا، اپنی زبان کو آلودہ گناہ مت کرو مرشد کامل کبھی جھوٹ نہیں بولتا وہ ضرور واپس آئے گا۔ دم رخصت اس نے کسی وقت کا تعین نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس کی واپسی کی میعاد صبح محشر تک ہے۔ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ میں عمر کے آخری لمحے تک اس کا انتظار کروں گا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت میں تھی وقت کا قافلہ بھی رواں دواں تھا کتنی شام آئی اور گزر گئی کتنے سورج نکلے اور ڈوب گئے لیکن عبداللہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اب وہ علاقہ کا قابل نفرت جرائم پیشہ نہیں تھا۔ عقیدت کیش نگاہوں کا تماشا بن چکا تھا۔ ہزاروں شیدائی ہر وقت اسے اپنے جھرمٹ میں لئے رہتے تھے۔ مرشد کامل کا انتظار اب تنہا اسی کو نہیں تھا۔ دیوانوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے شریک حال ہوگئی تھی۔

چاندنی رات تھی پچھلا پہر تھا ساری آبادی پر خاموشی طاری تھی غنودگی کے عالم میں تھے لیکن عبداللہ بدستور کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں انتظار میں کھلی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے کسی آنے والی آہٹ محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو سامنے ایک سفید پوش بزرگ لمبی عبا پہنے ہاتھ میں عصا لئے کھڑے تھے، نگاہوں کا جلال پیشانی کی طلعت، اور چہرے سے برستا ہوا نور نشاندہی کر رہا تھا کہ انسانی پیکر میں کوئی آسمان کا فرشتہ اتر آیا ہے۔ عظمت خداداد کی دھمک سے عبداللہ کی آنکھیں جھک گئیں دل ایک نامعلوم ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ نووارد بزرگ نے پرشکوہ لہجے میں دریافت کیا یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آنکھیں نیچی کئے ہوئے عبداللہ نے جواب دیا! مرشد کے انتظار میں! نے پھر سوال کیا۔ کون مرشد کامل! عبداللہ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا وہی مرشد کامل جس کے ہاتھ پر میں مرید ہو چکا ہوں اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم یہیں میرا انتظار کرو میں واپس ہونے کے بعد تمہیں بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچا دوں گا۔

نووارد بزرگ نے فہمائش کے انداز میں ارشاد فرمایا میرے عزیز! وہ مرشد کامل نہیں ہے اندھیری راتوں کا سیاح ہے بارگاہ یزدانی کا راستہ اسے خود نہیں معلوم۔ وہ تمہاری رہنمائی کیا کرے گا۔ اب وہ پلٹ کر نہیں آئے گا بلاوجہ اس کے انتظار میں اپنی جان مت ہلا کرو۔ عبداللہ نے اصرار کرتے ہوئے جواب دیا۔ میرے دل کا یہ یقین کسی طرح متزلزل نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور واپس آئے گا اور اسے بارگاہ یزدانی کا راستہ قطعاً معلوم ہے۔
مرشد کامل کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

نووارد بزرگ نے تنبیہہ کے لہجے میں فرمایا۔ "ایک غلط بات پر اصرار مت کرو! تم سخت قسم کے فریب میں مبتلا ہو۔ اپنی نادانی سے ایک چور کو تم نے مرشد کامل سمجھ لیا ہے سوتے ہوئے انسانوں کی آنکھوں سے کاجل چرانے والا بھی اگر مرشد کامل ہو سکتا ہے تو شامت کی ماری ہوئی دنیا کو اب مرشد کامل کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ افسوس تمہاری ناسمجھی پر!

اب عبداللہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا مرشد کامل کے خلاف نشتر برداشت نہ ہو سکا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ہچکیوں پر قابو کے بعد اس نے درد و کرب کی آگ میں سلگتے ہوئے کہا مجھے سخت افسوس ہے کہ ایک طرف تو آپ کا سراپا دلوں پر ملکوتی اثر ڈال رہا ہے اور دوسری طرف آپ مرشد کامل کی خدمت کر رہے ہیں اتنا مقدس ہو کر آپ کا یہ انداز سمجھ میں نہیں آرہا ہے گستاخی نہ ہو تو کیا میں آپ کا نام نامی اسم گرامی معلوم کرنے کا اعزاز حاصل کر سکتا ہوں۔ نوواذد بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرا نام معلوم کر کے اگر تمہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو سن لو کہ مجھے "خضر" کہتے ہیں بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ راست پر لانا میرا منصب کا اہم ترین فریضہ ہے اسی رشتے میں نے تمہاری فہمائش کی ہے۔ نام سنتے ہی عبداللہ نے جھک کر قدموں کا بوسہ لیا عبا کا دامن آنکھوں سے لگایا اور فرط ادب سے کانپتے ہوئے کہا آج میں اپنی خوش نصیبی پر جس قدر بھی ناز کروں کم ہے آج بغیر زحمت التجا کے ان حیرت نصیب جلوؤں سے میری نگاہیں سیراب ہو رہی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنے کی بھی اجازت دی جائے کہ جس مرشد کامل کو چور کہا جا رہا ہے اس سے مرید ہونے کے بعد ہی مجھے یہ شرف حاصل ہو رہا ہے اس "چور" کی نسبت کا یہ اعزاز کیا میرے لئے قابل فخر نہیں ہے زہے نصیب! کہ آپ کی تشریف ارزانی سے مرشد کامل پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا؟

حضرت خضر نے کریمانہ انداز میں ارشاد فرمایا" پھر تم نے اسی غلطی کا اعادہ کیا میں مرشد کامل کو چور نہیں بنا رہا ہوں تم نے ایک چور کو مرشد کامل بنا لیا ہے۔ البتہ اب مشیت کا کچھ ایسا انداز معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری ضد پر "چور ہی کو مرشد کامل بنا دیا جائے طلب صادق کا یہ جنون اور جذب عشق کا یہ ولولہ شیطان کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا تو یہ بشارت سن لو کہ اسی جگہ مرشد کامل سے تمہاری ملاقات ہوگی اور اس کے چند لمحوں کے بعد تم بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ پر خلعت عرفان سے سرفراز کئے جاؤ گے! انتظار کرو! اس ساعت جاں فروز کا جب تمہارے دل کی سرزمین پر تجلیات الٰہی کا عرش بچھایا جائے گا خدائے قادر تمہارے حوصلہ جنوں انگیز کی حفاظت فرمائے یہ کہتے ہوئے حضرت خضر واپس پلٹے اور دو قدم چل کر نگاہوں سے غائب ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد سپیدہ سحر نمودار ہوا اور عبداللہ کے نصیبے کی رات کی تاریکی چھٹنے لگی آج عرصہ دراز کے بعد عبداللہ کو ذرا سی نیند آئی تھی۔ آنکھ لگتے ہی اس نے دیکھا کہ کارکنان قضا و قدر عرش الٰہی کے سائے میں کھڑے ہیں ناگہاں حجاب عظمت سے ایک آواز آئی اور فرشتے ہیبت جلال سے سجدہ ریز ہو گئے۔

اندھیری راتوں کا سیاح، یا عبداللہ کا مرشد کامل، جس کا نام یحییٰ تھا۔ آج بے حد مسرور تھا بغداد عروس البلاد کے متعلق بہت ساری روایتیں اس نے سنی تھیں۔ بہت دنوں سے اسے اشتیاق تھا کہ ایک بار چل کر اس دولت مند شہر میں قسمت آزمائی کی جائے۔ آج چند حوصلہ مند ساتھیوں کی مدد سے بغداد کی مہم کا پروگرام بے پا گیا تھا۔

مشورے کے مطابق صبح سویرے بغداد کے لئے روانگی تھی اس لئے رات ہی کو تمام ساتھی ایک جگہ جمع ہو گیا ور پھوٹتے ہی اندھیرا رات کے سیاحوں کا یہ دستہ بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیسے جیسے بغداد قریب آتا جارہا تھا نا معلوم طور پر یحییٰ کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی اپنی اس بے چینی کا اس نے ساتھیوں سے کئی بار ذکر بھی کیا لیکن انہوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کئی دن شب و روز چلنے کے بعد یہ معلوم کر کے سب کو خوشی ہوئی کہ اب بغداد صرف ایک منزل کی مسافت پر رہ گیا تھا۔ شام ہو چکی تھی ایک وادی کے نشیب سے گزرتے ہوئے جیسے وہ بلندی پر چڑھے سامنے بغداد کا حسین شہر جھلک رہا تھا۔ منزل مقصود پر نظر پڑتے ہی روح مسکرائی اور دل جھوم اٹھا تھوڑی ہی دیر کے بعد اب یہ دستہ بغداد کے شہر میں داخل ہو چکا تھا ایک وسیع شاہراہ سے گزرتے ہوئے ایک عالی شان عمارت نظر آئی دروازے پر سواریوں کا ہجوم گھوڑوں کی قطار اور اونٹوں کی بھیڑ دیکھ کر یحییٰ (عبداللہ کا مرشد کامل) چلتے چلتے رک گیا اس کا اندازہ غلط نہیں تھا کہ یہ شہر کے کسی بڑے رئیس کا گھر ہے پاس ہی کھڑے ہوئے ایک راہ گیر سے دریافت کیا۔

کیا یہ شہر کے بڑے رئیس کا گھر ہے؟ اس نے جواب دیا صرف شہر ہی نہیں بلکہ روئے زمیں کے سب سے بڑے رئیس کا گھر ہے، آج تک اس کے خزانے کی کوئی تھاہ نہیں پا سکا اس کے قدموں کے نیچے سونے اور جواہرات کے کان بچھے رہتے ہیں ہفت اقلیم کی بادشاہی اس کے گھر کی ایک معمولی کنیز ہے، ہواؤں، دریاؤں، صحراؤں، پہاڑوں پر ہر جگہ اس کی شوکت اقتدار کا پرچم گڑا ہوا ہے راہ گیر کی یہ بات سن کر اس کا دماغ ایک نا معلوم ہیبت سے مرعوب ہو گیا فرط حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا ہو سکے اس رئیس کا نام کیا ہے؟

"ایک نام ہو تو کوئی بتائے بھی بے شمار ہیں اس کے"

دستگیر، کونین، شیخ الثقلین، خواجہ کائنات، سلطان الاقطاب، مخدوم الوریٰ غوث الاعظم، امام اعظم، امام جیلان، محبوب سبحانی یہ اور اس طرح کے ناموں کا ایک زریں سلسلہ اس کی ذات سے منسوب ہے۔ راہ گیر نے جدلی میں جواب دیا اور ایک لمحہ رکے بغیر آگے بڑھ گیا یحییٰ نے فاتحانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا معلوم ہوتا ہے آج قسمت کا ستارہ عروج پر ہے اتنے بڑے دولت مند کے گھر کا غبار ہی ہاتھ آ گیا تو عمر بھی کے لئے کافی ہے آدھی رات تک غور و فکر کے بعد ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں یحییٰ نے نہایت ہوشیار کے ساتھ سب کے فرائض تقسیم کر دیئے آج جانے کیا بات تھی کہ غوث الوریٰ کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی سارا بغداد نیند کی خاموشی میں شرابور تھا کہیں کہیں سے رات کے پاسبانوں کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ یحییٰ دبے پاؤں خانقاہ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ ہمت کر کے اندر داخل ہوا اندھیرے میں دیر تک ادھر ادھر ٹٹولتا رہا لیکن کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی سخت حیران تھا کہ اتنے بڑے رئیس کا گھر اور بالکل خالی ناکامی کی حسرت کے ساتھ واپس ہوتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ اس گھر کا غبار ہی لیتے چلیں ممکن ہے اس میں سونے اور جواہرات کی راکھ چھپی ہو۔

چاروں طرف سے گرد و غبار جمع کر کے ایک چھوٹی سی گٹھڑی بنائی اور لے کر جونہی دروازے سے باہر قدم نکالا کہ اچانک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا دو چار پلک جھپکانے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے گھبرا کر بیٹھ گیا دل ڈوب رہا تھا آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے چکی تھی اتنے میں قریب ہی سے پاسبانوں کی آواز اکان میں آئی گھبرا کر پھر گھر کے اندر پلٹا اور ایک کونے کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا کونین کا دستگیر اور ثقلین کا غوث تہجد کی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ عارض تاباں سے نور کی کرن پھوٹ رہی تھی پیشانی کی موجوں میں کرن لہرا رہا تھا آنکھوں سے تجلیات کے چشمے ابل رہے تھے اور دل کی شمع فروزاں تعلیم ولایت کے نگار خانوں کو چمکا رہی تھی۔

سامنے رجال الغیب ہاتھ باندھے کھڑے ایک نقیب نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔

عالم پناہ! فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہو گیا ہے زبان حق ترجمان سے مغفرت و رحمت کی دعا دیتے ہیئے۔ سرکار غوث الوریٰ آگے بڑھ گئے۔ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر یحییٰ کانپ اٹھا بھاگنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کچھ سوچ کر وہیں بیٹھ گیا۔

آج میرے گھر کون مہمان ہے کشور دل کو تسخیر کر لینے والی ایک آواز کان میں آئی امید و بیم کی کشمکش میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک اقبالی مجرم کی طرح بہ مشکل تمام یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔

سرکار؟ میں ہوں ایک شامت نصیب! اندھیری راتوں کا سیاح دولت خداداد کا شہرہ سن کر یہاں آیا تھا لیکن مصیبت کے ہاتھوں گرفتار ہو کر رہ گیا اب زندگی کا سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ یہاں آ کر اپنی آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھا ہوں آہ! روئے زمین کے سب سے بڑے رئیس کے گھر کتنی امیدیں لے کر

آیا تھا اب کون جانے قسمت کا کیا انجام ہوگا اتنا کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

روؤمت! کرم کا آبگینہ بڑا نازک ہوتا ہے ذرا سی ٹھیس سے گھائل ہو جاتا ہے۔ لو! میرے دامن میں اپنی بھیگی پلکوں کا آنسو جذب کر لو یہ مایوس امیدوں کی پناہ گاہ ہے یہاں مجرم کو سزا نہیں دی جاتی، دل کی تطہیر کی جاتی ہے اپنی ناکامی کا افسوس دل سے نکال دو۔

میری چوکھٹ کا امیدوار آج تک خالی ہاتھ نہیں واپس لوٹا ہے صبر سے کام لو آنکھوں کی روشنی نفع کے ساتھ واپس ہوگی یہ فرماتے ہوئے سرکار غوث الوریٰ اس کے بالکل قریب آگئے۔ دوسرے ہی لمحے کرم کی نگاہ کارساز اٹھی اور اس کی بے نور آنکھوں کی راہ سے دل تک پہنچ گئی بس اب کیا تھا آن کی آن میں عرفان کے سارے لطائف کھل گئے اور اب پلک جھپکی تو وہ عالم ناسوت کی آخری سرحد پر کھڑا تھا اب ہر طرف تجلیات کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے فروزاں تھا۔ اب وہ اندھیری راتوں کا سیاح نہیں تھا۔ ولایت کی اقلیم کا تاجدار بن چکا تھا۔ غوث الوریٰ کی سرکار سے حکم صادر ہوا۔

ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہوگیا ہے آج سے اس جگہ پر تمہیں بحال کیا جاتا ہے فوراً وہاں پہنچ کر اپنے منصب کے فرائض سنبھالو۔ ایک اتھاہ جذبہ عقیدت کے ساتھ جھک کر اس نے سرکاری کی پائے گاہ کو بوسہ دیا اور الٹے پاؤں واپس لوٹا۔ دروازے تک پہنچ کر قدم باہر نکالنا ہی چاہتا تھا کہ رجال الغیب اب قدموں کے نیچے فرش زمین نہیں کائنات کا دل بچھا جا رہا تھا۔ جس راہ سے گزرتا گیا آنکھوں کے پیانے سے قادری میکدے کی شراب ٹپکتی گئی دن چڑھتے چڑھتے اس نے کئی روز کی مسافت طے کر لی تھی اب وہ ولایت کی قلمرو میں داخل ہو چکا تھا چند ہی قدم کے بعد شہر کی عمارتیں میں نظر آنے لگیں۔

آبادی کے ایک چوراہے پر ہزاروں آدمیوں کا میلا لگا ہوا تھا ایک اجنبی راہ گیر سمجھ کر لوگوں نے اس کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

"اژدہام کے باعث ادھر سے آمدورفت کا راستہ بند ہے آپ کسی اور طرف سے جایئے لوگوں نے حیرت آمیز لہجے میں جوب دیا۔ کئی ہفتے ہو گئے اس واقعے کو! سارا علاقہ ہل گیا ہے اور آپ کو خبر نہیں ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔"

کسی نے کہا میں اس علاقے کا باشندہ نہیں ہوں مجھے اصل واقعہ سے آگاہ کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے شہر کا ایک اچھا خاصا آدمی کئی ہفتہ سے دیوانہ ہوگیا ہے، اسی چوراہے پر دن رات کھڑا رہتا ہے "وہ کہتا ہے کہ "میں مرشد کامل" کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ وہ مجھ سے وعدہ کر گیا ہے کہ تم یہیں میرا انتظار کرو۔ میں واپس ہونے کے بعد بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک تمہیں پہنچادوں گا۔ ہزار اسے سمجھایا جاتا ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا اس کا انتظار بے سود ہے۔ لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ سب کو یہی جواب دیتا ہے کہ مرشد کامل جھوٹ نہیں بول سکتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔ دلوں کا میلان اس کی طرف اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب وہ اکیلا نہیں رہتا ہے اس کے اردگرد ہر وقت پروانوں کا ایک جمگھٹ لگا رہتا ہے۔

لوگوں کی باتیں سن کر دفعتاً اس کا حافظہ تازہ ہوگیا اور اچانک اس رات کا واقعہ نگاہوں کے سامنے پھر گیا اب غور سے دیکھا تو وہی چوراہا تھا جہاں ایک دیوانے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے مرید کیا تھا اور اپنی واپسی تک وہیں انتظار کرنے کا اسے حکم دیا تھا۔ یہ سارا واقعہ یاد آتے ہی وہ بے خود ہوگیا۔ جذبات تاب ضبط سے باہر ہو گئے وارفتگی شوق میں دامن پھاڑتا شور مچاتا مجمع کی طرف دوڑا اور ہجوم کو چیرتا پھاڑتا عبداللہ کے قریب پہنچ کر آواز دی! میں آگیا، میرے مرید! میں اپنا وعدہ پورا کرنے آگیا۔ جانی پہچانی آواز سن کر عبداللہ چونک پڑا جونہی چہرے پر نظر پڑی بے ساختہ چیخ پڑا۔

مرشد کامل آگیا! مرشد کامل آگیا! میں کہہ رہا تھا مرشد کامل جھوٹ نہیں بولتا وہ ضرور آئے گا۔ یہ کہتا ہوا بے خودی میں تڑپا اور مرشد کامل کے سینے سے لپٹ گیا۔ ایک بہت دنوں کی پیاسی روح چشمہ عرفاں سے سیراب ہو رہی تھی اور تجلیات کا ایک نیا عالم نگاہوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ سینے سے لپٹے ہوئے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مرشد کامل نے آواز دی۔

عبداللہ! آنکھیں کھولو! تم بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچ گئے۔ آنکھ کھولتے ہی عبداللہ سجدے میں گر پڑا ہاتف غیب نے آواز دی "آخر ایک بندہ گنہگار نے عشق کی آہ وزاری اور فریاد کی سوز و تپش سے اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر ہی لیا۔"

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی!

زبیدہ خاتون

دنیائے اسلام کا مایہ ناز فرمانروا خلیفہ ہارون رشید بغدادری جس کے رعب وجلال سے دنیا کے تین حصے ہمیشہ متاثر رہے، فارس، روم اور یورپ کے سلاطین جس کے چوکھٹ کے باجگذار کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔

زبیدہ خاتون اسی نیک نام بادشاہ پاک طینت، وفا سرشت اور فیاض بیوی تھی۔ ویسے کہنے کے لئے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ تھی۔ لیکن اس کے پہلو میں نہایت مسکین پر سوز اور دردمند دل تھا۔

اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں سے وہ بے پناہ عقیدت رکھتی تھی۔ مقدس مقامات کی زیارت اور مزارات طیبات کی حاضری اس کی زندگی کے محبوب ترین معاملات سے تھے۔ مکہ معظمہ میں "نہر زبیدہ" نام کا صاف وشیریں اس کے جذبہ عقیدت کی یادگار ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ بغداد میں ہر طرف سلطان العاشقین حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کے عشق وسرمستی اور جذب استغراق کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایک دیوانہ عشق کے پیچھے پیچھے کھنڈروں اور صحراؤں میں پروانوں کا ہجوم سیلاب کی طرح رواں دواں رہا کرتا تھا جہاں بیٹھ گئے دنیا بس گئی، اٹھے تو شہر اُجڑ گیا۔

نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تو اب ڈھونڈ ھیے ان کو چراغ رخ زیبا لے کر اور کہیں مل گئے تو عالم ایسا کہ ملنا نہ ملنا دونوں برابر، ہزاروں کے بیچ لیکن تنہا خیال یار کے سوا کوئی شریک جہاں نہیں دل کی دھڑکنوں سے قریب لیکن دور بہت دور سرحد امکان کے اس پار، قدم قدم پر عشق بے نیاز کا جلوہ، ادا ادا میں شان استغنا کا ظہور اسی عالم کیف ومستی کے ساتھ حضرت بہلول دانا کی ہزاروں بستیوں میں اتر گئے تھے۔

زبیدہ خاتون بھی ان کے کشف وکرامات اور جذب وعشق کے غلغلوں سے بے حد متاثر تھی۔

زیارت کا شوق دبی ہوئی چنگاری کی طرح ہمیشہ سلگتا رہتا تھا۔ ہزاروں موقع تلاش کرنے پر بھی دل کا یہ ارمان پورا نہ ہوسکا۔ تخت وتاج کی ملکہ سے کسی دیوانہ عشق کا رشتہ ہی کیا ہوسکتا ہے اپنے محبوب حقیقی کے لئے جس نے دونوں جہاں سے منہ پھیر لیا ہو وہ کسی اور کو کیوں دیکھے اور پھر جنون شوق کے ہاتھوں جسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہو اس کی بے التفاتیوں کا شکوہ ہی کیا ہے؟

البتہ طبیعت کبھی نشاط پر ہو۔ وحشت عشق کا طوفان بھی تھم گیا ہو۔ اور جہان خاکی کی طرف توجہ مبذول کرنے کی فرصت بھی مل گئی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اپنے کسی پروانہ کی طرف نگاہ اٹھ جائے اور اس کو نین کی فیروزمندیوں سے سرفراز کردیا جائے۔

ایک بار زبیدہ خاتون کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا اور وہ نہال ہوگئی۔

چار بجے شام کا وقت تھا دن بھر ماندہ سورج اپنے مستقر کی طرف تیزی سے لوٹ رہا تھا۔ ہوا کی خنکی اور فضا کی رعنائی خوشگوار ہوتی جارہی تھی یہی وقت تھا جبکہ زبیدہ خاتون تفریح کے لئے شاہی باغ میں جایا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز نے آکر اطلاع دی حضور! ملکہ معظمہ! سواری تیار ہے خواصین خیر مقدم کے لئے چشم براہ ہیں۔"

زبیدہ خاتون کنیزوں کے جھرمٹ میں اٹھی اور سواری میں آکر بیٹھ گئی۔

سواری محل کے دروازے سے نکل کر بغداد کی محفوظ شاہراہوں سے ہوتی ہوئی قریب ہی ایک شاداب صحرا کی طرف بڑھنے لگی تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک وادی کے نشیب سے گرتے ہوئے اچانک ایک کنیز کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔ ملکہ وہ دیکھئے! حضرت بہلول دانا جھاڑیوں کے درمیان کچھ چن رہے ہیں۔ زبیدہ چونک گئی۔ خوشی سے دل اچھلنے لگا۔ محافے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو بکھرے ہوئے بال پراگندہ پیراہن اور حیرت زدہ چہرے کے ساتھ ایک شخص پتھر کے ٹکڑوں کو جمع کرکے کچھ بنا رہا تھا۔ سواری روک دی گئی۔ اضطراب شوق کے عالم میں زبیدہ اتر پڑی اور لرزتے کانپتے جھجکتے ڈرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔

ہمت کرکے سامنے پہنچی اور مودب کھڑی ہوگئی۔ حضرت بہلول دانا پتھروں کے ٹکڑے جمع کرکے گھروندے بنانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انہوں نے آنیوالی کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

ایک گم گشتہ حال دیوانہ عشق کو نظارہ وجمال یار سے اتنی کہاں فرصت کہ نگاہ اٹھا کر کسی اور کو دیکھتا۔

بادشاہ وقت کی ملکہ جس کے سامنے کھڑی تھی وہ خود ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا اس ابرو کی شکن پر بادشاہوں کی تقدیر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی اس کی حکومت کا رقبہ جہان فانی سے لے کر عالم جاوید تک پھیلا ہوا تھا۔

زبیدہ امید وبیم کے عالم میں دیر تک سر جھکائے کھڑی رہی خود ہی ہمت کرکے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔

السلام علیکم!

یہ الفاظ شہنشاہ کونین، خاتم پیغمبراں کی شریعت قاہرہ کے تھے سنت رسول کے احترام میں دیوانہ اپنے عالم سے پلٹ آیا۔ حیرت کی شراب ناب سے مخمور آنکھیں اوپر اٹھیں اور دل کا کشور جیت لینے والی آواز میں جواب دیا۔

وعلیکم السلام!

لب و لہجہ کے جلال سے فضا لرز گئی۔ زبیدہ کا نرم ونازک دل کانپ گیا۔ کچھ وقفے کے بعد ہمت بندھی حوصلہ بڑھا اور امید ہوگئی کہ آج ساقی مائل بہ کرم ہے دوبارہ عرض کیا۔

"حضور کیا بنارہے ہیں۔"

کونین کے رازدار سے یہ سوال کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ ہزار غیر اہم ہونے کے باوجود بھی سلطنت کے رموز بتانے کے نہیں ہوتے۔ اقلیم باطن کا سلطان کیا کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے، اس کی شام وسحر کہاں بسر ہوتی ہے یہ سرتاسر کائنات عشق کے اسرار ہیں محرم راز کے سوا نہیں کوئی نہیں جان سکتا۔

زبیدہ خاتون کا سوال بھی اسی طرح تھا۔ وہ ایک دیوانہ عشق سے عالم حقیقت کا راز فاش کرانا چاہتی تھی۔ جس کا سلسلہ عالم امر سے ہے۔

اس مصلحت ناآشنا سوال پر حضرت بہلول دانا کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ پیشانی کی سطح خاموش پر شکن ابھر آئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر زبیدہ دہشت زدہ ہوگئی۔ لیکن سوال کے پیچھے اسے اپنے دل کے اخلاص وعقیدت کا یقین تھا اس لئے نتائج کی طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے۔

پھر اچانک ایسا چہرے کا تیور بدل گیا۔ پیشانی کی شکن مٹ گئے لالہ کے ورق پر شبنم کی نمی ابھی آئی کرم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور حضرت بہلول دانا نے حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹتے ہوئے فرمایا۔ کیا بنا رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے تو یقین کے کان سے سن لے کہ میں فرش گیتی پر جنت کا محل بنا رہا ہوں۔"

ایمان اور عقیدت کی سلامتی اور فیضان کی برتری بھی کیا چیز ہوتی ہے۔

عقل فتنہ پرواز جسے دن کی طرح روشن حقیقتوں سے انکار کرتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی یہاں پہنچ کر اس کی رہبری کا چراغ گل ہوجاتا ہے۔

عقل فریب کار کے مشورے پر دانشوروں کا قافلہ اپنی راہ بدل دیتا ہے۔ لیکن ہزار افسوس کے بعد دیوانہ جادہ حق سے کبھی نہیں ہٹتا عقیدت وعشق کی سرحد یقین جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں عقل درماندہ شام کا چراغ جلاتی ہے۔ بحث ودلیل سے بے نیاز اس نئے اقلیم میں داخلے کا پروانہ اسے آج تک نہیں مل سکا۔ زبیدہ خاتون کو یہ یقین کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ اینٹ اور پتھر کا یہ گھروندا یقیناً گیتی پر جنت کا محل ہے اپنی آنکھ کا دیکھا غلط ہوسکتا ہے لیکن ایک عارف عشق کی بات کبھی نہیں غلط ہوسکتی۔

اس یقین کے نتیجے میں پھر اس نے سوال کیا۔ حضور! جنت کا یہ محل میرے ہاتھ پر فروخت کریں گے؟

جواب ملا۔ "ضرور فروخت کروں گا۔"

ذرا ناز بندگی کا تماشا دیکھئے۔ جنت کس کی اور فروخت کون کر رہا ہے۔ سچ فرمایا ہے جان عاشقاں ﷺ نے کہ جو خدا کا ہوتا ہے خدا اس کا ہوتا ہے۔"

اب اس تشریح کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ جب خدا ہی اس کا ہوگیا تو اب کائنات میں باقی کیا رہ گیا۔ دشوار کونین کی تسخیر کا مرحلہ نہیں ہے۔ دراصل سب سے مشکل کام خدا کو راضی کرنا ہے۔ خدا کے محبوب مطلق ﷺ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ بادشاہ کے تئیں مقرب ومعزز ہوجانے کے بعد رعایا کی تسخیر کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس جواب پر زبیدہ کی روح جھوم اٹھی۔ اس پرامید لہجے میں پھر دریافت کیا۔ کتنی قیمت پر فروخت کریں گے "یہ جنت"

جواب دیا۔ "ایک درہم پر"

ذرا رحمت یزدانی کی یہ ادا تو دیکھئے۔

براہ راست خرید تو جنت کی قیمت پوری جان۔ اجنبی سے لینا چاہو تو ایک درہم۔

میدان جہاد کے شہیدوں کا حال یہ ہے کہ ایک جان دی۔ ایک جنت کے مستحق ہوگئے۔ لیکن جو ہر آن خنجر تسلیم ورجا سے شہید ہوکر مرتا اور جیتا ہے اور پھر شہید ہوتا ہے ہر شہادت پر ان کشتگان عشق کو جو جنتیں ملتی ہیں انہیں اختیار ہے یونہی دے دیں قیمت لگائیں بخشی ہوئی جنت کو جو چاہیں سو کریں۔ اپنی چیز اپنی مرضی۔

جواب سنتے ہی زبیدہ نے فوراً قیمت پیش کردی۔ قیمت ادا ہوجانے کے بعد حضرت بہلول دانا نے ایک لکڑی اٹھائی اور ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے فرمایا۔

"میں نے جنت کا یہ محل ایک درہم کے عوض میں زبیدہ خاتون کے ہاتھ بیچ دیا۔"

یہ سنتے ہی زبیدہ خاتون اس یقین کی خوشی میں سرشار ہوگئی۔ کہ اسے جیتے جی جنت مل گئی۔ زمین خدمت چوم کر جب وہ اپنی سواری کی طرف واپس لوٹ

رہی تھی تو اپنے نصیبے کی ارجمندی پر اس طرح نازاں تھی جیسے دنیا میں اب کوئی مدمقابل نہیں ہے۔

آج میکدہ عشق کے ایک بادہ نوش نے اس کی آفرینش کا سب سے نازک ترین مرحلہ طے کردیا تھا۔ مرنے کے بعد اپنا انجام وہ خود بیان کردینے کے قابل ہوگئی تھی۔ اسے نامعلوم طور پر یقین تھا کہ موت کی آخری ہچکی تک جنت کا استحقاق باقی رہے گا۔

فضا میں شام کی سیاہی پھیل گئی تھی۔ لیکن وہ فیروز بختی کے اجالے میں شاہی محل واپس ہوئی۔

غالباً رات کا پچھلا پہر تھا۔ سارے محل پر رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں کہیں سے پاسبانوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بغداد کا حسین و دلکش شہر دھلی ہوئی چاندنی میں نہا نہا کر اور نکھر گیا تھا۔ جابجا کشور ولایت کے سلاطین کی خوابگاہوں سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں زمین سے آسمان تک ساری فضا تجلیات کے انواس سے جگمگا رہی تھی۔

نماز تہجد اور مناجات نیم شبی سے فارغ ہو کر زبیدہ خاتون اپنے حرم سرا میں محو خواب تھی۔ دروازے کے باہر کنیزان خصوصی کا پہرا لگا ہوا تھا۔ اچانک قدموں کی آہٹ پر ایک کنیز چونک گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو بادشاہ وقت ہارون رشید دبے پاؤں چلے آرہے تھے۔

خلاف عادت تشریف آوری پر کنیزیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ ہارون رشید نے آگے بڑھ کر زبیدہ کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔

زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ رات کے سناٹے میں دروازے پر دستک زندگی کا غیر معمولی حادثہ تھا۔

گھبرائی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھولا۔

ہارون رشید کو دروازے پر دیکھ کر کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ سکتے کی حالت میں اس نے بادشاہ کا خیر مقدم کیا اور اندر لے آئی۔

طرح طرح کے اندیشوں سے جگر کا خون سوکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل سکے۔

"اتنی رات گئے قدم رنجہ فرمانے کی وجہ نصیب دشمناں کوئی تشویشناک حادثہ تو نہیں ہے خدارا جلدی فرمایئے دل ڈوب رہا ہے۔"

ہارون رشید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ کوئی تشویشناک بات نہیں ہے بلکہ ہر طرف مولائے کریم کا فضل شریک حال ہے۔ امور مملکت بھی قابل شکر ہیں۔ میری بے وقت کی آمد کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے اطمینان رکھو۔

یہ جواب سن کر زبیدہ کا اضطراب کچھ ہلکا ضرور ہوگیا۔ لیکن قدم رنجہ فرمانے کی وجہ اب تک صغیہ راز میں رہی۔ اس نے پھر دریافت کیا۔

"لیکن اتنی رات کو اچانک امیرالمومنین کی تشریف آوری بلاوجہ نہیں ہوسکتی۔

ہارون رشید نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ تمہارا اضطراب حق بجانب ہے تم اپنی گھبراہٹ پر قابو پالو تو میں وجہ بتاؤں۔ دراصل ایک خوش آئندہ واقعہ کی صرف تم سے تشریح کرانے آیا ہوں۔

ابھی ابھی نماز تہجد سے فارغ ہونے کے بعد ذرا دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی اتنے ہی وقفے میں میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ میں ایک نہایت حسین و دلکش چمن کی سیر کررہا ہوں۔ پھولوں کی رعنائی، بہاروں کی نکہت اور درختوں کی زیبائی دیکھ کر حیران ہوں ہموار زمیں شفاف آئینے کی طرح دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں ہر طرف نرم و نازک ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے خوش رنگ پرندوں کے نغمے جادو جگا رہے ہیں۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا سلسلہ حد نظر سے بھی آگے ہے۔

حیرانی کے عالم میں سیر کرتا ہوا کچھ اور آگے بڑھا تو رنگ و نور میں ڈوبے ہوئے اور اونچے اونچے محلوں کی قطار شروع ہوگئی۔ لعل و زمرد اور یاقوت و زبرجد ہوئے ایوان نگاہوں کو خیرہ کررہے تھے۔ میں عالم حیرت میں ڈوبا ہوا انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے قریب سے جھلملاتا ہوا نور کا ایک پیکر لطیف گزرا۔ اس کے نشان قدم سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ چہرے کی تابندگی سے گزرگاہوں میں اجالا پھیل رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی ہو نہ ہو یہ کوئی فرشتہ ہے۔

آگے بڑھ کر میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بہت تیزی سے وہ یہ کہتے ہوئے گزر گیا۔ "جنت الفردوس"

جواب سن کر میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا اپنے نصیبے کی ارجمندی پر ناز کرتا جونہی آگے بڑھا سامنے بلند قامت دروازے کی پیشانی پر نظر پڑی۔ اس پر خط سبز لکھا ہوا تھا "زبیدہ خاتون" یہ تحریر پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دروازے کے اندر داخل ہوا تو جس عمارت پر بھی نظر پڑی زبیدہ خاتون کا سرنامہ جھلک رہا تھا۔

دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ زبیدہ خاتون تو میری محبوب ملکہ کا نام ہے۔ ہوسکتا ہے کہیں آس پاس میرا نام کندہ ہو۔ اس آرزوئے شوق میں میلوں دور تک نکل گیا۔ لیکن ہر جگہ زبیدہ خاتون کا نام نظر آیا۔ خواب سے بیدار ہونے کے بعد تعبیر کے تجسس نے مجھے اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ میں صبح ہونے کا انتظار کرتا۔

زبیدہ خاتون سے مراد اگر تمہاری ہی ذات ہے تو یقیناً تم قابل رشک ہے۔ خلاف مصلحت نہ ہو تو اپنی زندگی کا وہ راز بتا دو۔ جس نے جیتے جی تمہارا نام باغ فردوس تک پہنچا دیا ہے۔

زبیدہ خاتون کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ اس نے نظر نیچی کئے ہوئے جواب دیا مجھے اپنے نامہ زندگی کا کوئی ایسا عمل یاد نہیں آرہا ہے جسے خدا کی اس عظیم الشان نعمت کا اجر قرار دوں۔

البتہ آج شام کو اچانک اپنے وقت کے مشہور مجذوب حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوگئی تھی۔ وہ ایک ویرانے میں اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنا رہے تھے کچھ دیر انہیں مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ان سے دریافت کیا۔ اے بہلول یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟ جواب دیا جنت کا محل۔ پھر پوچھا بیچئے گا؟ جواب دیا ضرور بیچوں گا۔ اس کے بعد میں نے ایک درہم ان کی منہ مانگی قیمت ادا کی۔ انہوں نے ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے کہا۔ جنت کا یہ محل میں نے زبیدہ خاتون کے ہاتھ پر بیچ دیا۔

ہارون رشید یہ سن کر بھڑک اٹھا اور جوش عقیدت میں بول اٹھا۔

یقیناً یہ انہیں کی زبان کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی بات کبھی رائیگاں نہیں کرتا۔ روئے زمین پر یہ مقدس ہستیاں خدا کی شان رحمت کا پرتو ہیں۔ ان کی پیشانی کی موجوں میں صفات حق کا عکس نظر آتا ہے۔ کارکنان قضا وقدر ان کی زبانوں پر کلام کرتے ہیں۔ خلافت الٰہی کے منصب نے انہیں کونین کا فرماں روا بنا دیا ہے۔ بلاوجہ امت محمدی ان کے پیچھے نہیں دوڑتی۔

یہ کہتے کہتے ہارون رشید کا لہجہ بدل گیا۔ آواز بھرا گئی اور اس نے گزارش والتجا کے انداز میں کہا۔ تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک دن مجھے ان کی سرکار میں لے چلو نصیبے کی کامرانی نے ساتھ دیا تو ہو سکتا ہے کہ میں بھی جیتے جی جنت کا حقدار بن جاؤں۔

زبیدہ نے پرتپاک انداز میں جواب دیا۔ ضرور چلئے جنت میں آپ کی رفاقت کا اعزاز حاصل کر کے میرے دل کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔"

صبح کا سہانا وقت تھا۔ رات ہی محل میں یہ خبر گرم تھی کہ بادشاہ ملکہ کے ہمراہ سیر وسیاحت کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ طلوع آفتاب سے پہلے پہلے دونوں اپنے مقدس سفر پر روانہ ہوگئے۔ حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی تلاش کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کامل جانا حسن اتفاق کا کرشمہ کہا جاسکتا ہے۔ سارا دن ویرانوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے لیکن کہیں ان کا سراغ نہیں لگ سکا۔ تھکے ماندے شام کو محل واپس لوٹ آئے۔ پھر اک دو روز کے وقفہ کے بعد ان کی تلاش میں نکلے اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ناکام واپس آئے۔

اس طرح لگا تار کئی دن کی ناکامیوں کے بعد ایک دن پہاڑ کے دامن میں حضرت بہلول دانا مل گئے۔ آج بھی ان کا وہی عالم تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور دونوں جہاں سے بے نیاز پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنانے میں منہمک تھے۔

زبیدہ خاتون نے دور سے اشارہ کیا۔ نظر پڑتے ہی ہارون رشید پر لرزہ طاری ہوگیا قدم اٹھانا مشکل تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے گئی۔

اللہ اللہ! ساری دنیا جس کے دربار کی جلالت شان سے لرزہ براندام رہا کرتی آج ایک بے سروسامان درویش کے سامنے خود اس پر لرزہ طاری تھا۔ ایک ہارون رشید ہی کیا۔ خاکدان گیتی کے کسی تاجدار کا یارا ہے کہ ہیبت حق کے آگے سر اٹھا سکے؟

زبیدہ خاتون نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ذرا بھی مت گھبرایئے۔ یہ جلالت عشق کی ہیبت ہے جس کی تپش سے کائنات کی نبض چل رہی ہے۔ اس کی سطوت کے سامنے پہاڑوں کی فلک نما چوٹیاں بھی سرنگوں ہیں آپ بغیر کسی اندیشے کے ایک نیاز مند سائل کی طرح ان کے آگے کھڑے ہو جایئے وہ اس وقت کسی اور عالم میں ہیں۔ سلام کی آواز سن کر آپ کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آپ ان سے دریافت کرنا کیا کر رہے ہیں وہ جواب میں جنت کا محل ضرور کہیں گے۔ پھر خرید وفروخت کی بات کیجئے۔ وہ اثبات میں جواب دیں گے پھر جو قیمت بتائیں ادا کر دیجئے۔ اسی طرح میرے ساتھ معاملہ ہوا تھا۔

لرزتے کانپتے ہارون رشید آگے بڑھے اور ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوگئے۔

عشق کی دولت اقبال کا یہ بھی عجیب وغریب منظر تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا فرماں روا آج ایک فقیر کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا عالم محسوس میں یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی تھی کہ عشق ہی کائنات کا اصل فرماں روا ہے۔ جاہ وحشمت کا چڑھتا ہوا سورج ہر جگہ سر اٹھا سکتا ہے۔ لیکن مستان عشق کی چوکھٹ پر پہنچ کر وہ سرنگوں ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہارون رشید نے نہایت ادب سے سلام عرض کیا۔

جواب ملا۔ وعلیکم السلام

پھر دریافت کیا۔ اسے فروخت کیجئے گا؟

جواب ملا۔ "ضرور"

قیمت دریافت کی، تو یہ سن کر پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

"تیری پوری سلطنت جنت کی قیمت ہے۔"

دیر تک سکتے کا عالم طاری رہا۔ کچھ وقفے کے بعد پھر عرض کیا۔

حضور ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ حضور کی کنیز زبیدہ خاتون کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تھی۔ آپ نے ایک درہم پر اس کے ہاتھ جنت فروخت کی

ہے۔ یک بیک قیمت کی سطح اتنی اونچی ہوگئی کہ وہم گمان سے باہر۔

حضرت بہلول دانا نے ایک پراسرار دانشور کے انداز میں جواب دیا۔

"زبیدہ خاتون پر اپنا قیاس مت کرو۔ وہ جنت دیکھ کر نہیں آئی تھی۔ اس نے صرف میری زبان پر ان دیکھی جنت کا یقین کر لیا۔ اینٹ اور پتھر " کے گھروندے کو جنت کا محل سمجھنے کے لئے اسے اپنے مشاہدے کا انکار کرنا پڑا۔ نظر کے فیصلے سے جنگ کرنا پڑی، عقل کی دریافت کو جھٹلانا پڑا اور جرات عشق کے یہ سارے مرحلے اس نے یک آن میں طے کر لئے۔

اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم جنت دیکھ کر آ رہے ہو۔ بہاروں کی وہ صبح خنداں اور جگمگاتے ہوئے مرحلوں کا وہ جمال اب تک تمہاری نظر کے سامنے ہے۔ اس لئے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔

یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لو کہ دراصل جنت کی قیمت درہم و دینار نہیں ہے دل کا ان دیکھا اور روح کا نادیدہ اعتماد ہے۔

عالم آخرت کی ساری فیروز بختی تو ایمان بالغیب ہی کی ہے۔ نہ دیکھو اور یقین کرو، نہ سنو اور ایمان لاؤ۔ یہی تو اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔

حرم کی دیواریں نہ بھی نظر آتی ہوں جب بھی اس کا احترام بجا لانا ہر مومن کا شیوہ دین ہے۔ کونین کے آقا سرکار مجتبیٰ ﷺ آج ماتھے کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر نہیں ہیں۔

لیکن اہل دل سے پوچھو کہ خطہ ارضی کے چپے چپے پر آج بھی ان کے قدم ناز کے لئے نگاہوں کا فرش بچھا رہتا ہے۔ "

سر جھکائے ہوئے ہارون رشید سنتا جا رہا تھا۔ اور چہرے کی رنگت، دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کا راز فاش کر رہی تھی اچانک آنسوؤں سے پلکیں بوجھل ہو گئیں دل کی آنکھوں کے پٹ کھل گئے۔ آخرت کا یقین سورج کی طرح چمکنے لگا۔ اور چند روزہ وجاہت و سلطنت کا سارا خمار اتر گیا۔ بے خودی کے عالم میں گھٹنے ٹیک دیئے اور لجاجت کے ساتھ عرض کیا۔

"حضور! سلطنت دے کر قیمت چکانے کے لئے تیار ہوں۔ جنت کا پروانہ عنایت فرما دیا جائے۔"

عجز و درماندگی کی اس التجا پر حضرت بہلول دانا کا دل مہر و شفقت کے گداز سے بھر گیا۔ آپ نے اسی عالم میں جواب مرحمت فرمایا۔

جذب و سرمستی کے کیف و دوام نے مجھے دونوں جہاں کی لذتوں سے بے نیاز کر دیا ہے، میں تیری سلطنت لے کر کیا کروں گا۔ دل تو بڑی چیز ہے سلطنت کیلئے تو میری ٹھوکروں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ جا اپنی سلطنت بھی لے اور جنت کا یہ پروانہ بھی رکھ لے۔

درویش کا مقصود دل کو حرص و ہوس کی زنجیروں سے آزاد کرنا تھا۔ ایک درہم اور پوری سلطنت دونوں کے درمیان اس کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے دل کے یقین اور عقیدت کے اخلاق کا ہے۔

ہارون رشید جب خلعت جاوید سے سرفراز ہو کر واپس ہوا تو زبیدہ خاتون نے دریافت کیا۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو جنت کے حصول پر مبارکباد دوں یا دل کے نئے عالم پر؟"

ہارون رشید نے جواب دیا۔

"والی کشور کی سرکار سے دل کو جو نیا عالم عطا ہوا ہے۔ دراصل عالم آخرت کے سارے اعزاز کی کلید یہی ہے۔"

بلخ کی شہزادی

شاداب وادی، حسین کہسار اور دلکشا مناظر کے لئے بلخ کا سارا شہر سارے جہاں میں عروس البلاد کے نام سے مشہور تھا۔ موسم گرما میں دور دراز خطوں سے سیاحوں کے قافلے رواں دواں چلے آتے تھے اور اچانک شہر کی رونق میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہی جشن بہاراں کے دن تھے کہ خراسان کی طرف سے سیاحوں کا ایک کارواں اترا۔ اس قافلہ میں ایک حسین وخوبرو نوجوان بھی تھا۔ گردش ایام کا ستایا ہوا چہرا ہزاروں دلکشی کے باوجود نہیں چھپتا تھا۔ شکستہ پیراہن بکھرے بال، اداس آنکھیں، اور پژمردہ صورت سے صاف آشکار تھا کہ وہ اپنے وقت کا آشفتہ حال مسکین ہے۔

بہار کا موسم گزر جانے کے بعد سیاحوں کے تمام قافلے اپنے اپنے مسکن کی طرف واپس لوٹ گئے۔ لیکن نوجوان، بلخ کی خوشگوار شام وسحر سے کچھ ایسا مانوس ہوا کہ یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ شاہی باغ کے قریب جھاڑیوں کے کنج میں اس نے ایک کٹیا بنالی اور وہیں رہنے سہنے لگا۔ دن بھر وہ شہر کا گشت کرتا اور سام سے پہلے اپنی کٹیا میں لوٹ آتا۔ ایک مدت سے اس کی زندگی کا یہی معمول تھا۔ باغ کے شاہی ملازمین بھی ایک فقیر سمجھ کر کبھی اس سے مزاحم نہیں ہوئے تھے۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں کہسار کی چوٹیوں پھر جھلملا رہی تھیں۔ فقیر شہر کے گشت سے واپس لوٹ چکا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل بے حد اداس تھا۔ طبیعت بہلانے کے خیال سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا باغ میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ آج سلطان بلخ کی شہزادی گل گشت کے لئے یہاں تشریف لائی ہیں۔

جونہی آواز کی طرف رخ پھیر کر دیکھا کہ ایک ہی جلوہ محشر طراز نے دل کا کام تمام کر دیا ایک شیشہ ٹوٹا، ایک بجلی چمکی، اور ایک بے نوا فقیر کا خرمن ہستی آن واحد میں جل کر راکھ ہو گیا۔ شہزادی کنیزوں کے جھرمٹ میں آگے بڑھی۔ تلواروں کا کاٹ فولادی ڈھالوں پر روکی جاسکتی ہے۔ لیکن چشم سحر طراز کا ایک ہی نیم کش پوری ہستی کو گھائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔

نظر کی چوٹ سے فقیر بالکل گھائل ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے دل تھامے ہوئے اٹھا۔ اور اپنی کٹیا میں آکر بیٹھ گیا۔

دل کا شکیب تو رخصت ہو ہی چکا تھا۔ آنکھوں کی نیند بھی اڑ گئی۔ غم کی تپش میں ساری رات کٹی ۔ آہستہ آہستہ عشق کی چنگاری دل کے قریب سلگتی رہی۔ شوق کا اضطراب بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک گھائل پنچھی کی طرح فقیر کی زندگی ایک دردناک آزار کا شکار ہو گئی۔ کبھی مکمل سکوت۔ کبھی بادصبا سے ہم کلامی۔ کبھی مناجات سحر گاہی۔ ویرانے سے انس تنہائی سے پیار، یک بیک زندگی کا عجیب حال ہو کے رہ گیا۔

اسی عالم کرب میں کئی مہینے بیت گئے۔ رفتہ رفتہ جوش جنوں کا بڑھتا ہوا طوفان تھمنے لگا۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد دل کی تپش ایک محسوس حالت پر آکر رک گئی۔

اب فقیر پر مدہوشی کا وہ عالم نہیں تھا۔ اب ایک حوصلہ مند مسافر کی طرح عشق نے ہاتھوں میں چراغ دے دیا تھا۔ اور آرزو کے شوق نے منزل کی طرف بڑھنے کی ہمت پیدا کر دی تھی۔

حسب معمول سلطان بلخ کا دربار لگا ہوا تھا۔ فریادوں کے مقدمات کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ اتنے میں ایک نقیب نے آکر اطلاع دی۔ جہاں پناہ ایک فقیر قلعہ معلی کے دروازے پر کھڑا ہے بارگاہ سلطانی پر باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ غالباً وہ کوئی فریاد لیکر حاضر ہوا ہے۔

حکم صادر ہوا کہ اسے باریاب کیا جائے چند ہی لمحے کے بعد خطاب شاہی فقیر کی طرف متوجہ ہوا۔

تمہاری کیا فریاد ہے؟

فقیر نے جواب دیا "ایک ایسی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں جسے مجمع عام میں نہیں پیش کر سکتا۔ تنہائی کا موقع عنایت فرمایا جائے۔"

دربار ختم ہونے کے بعد فقیر طلب کیا گیا۔ وزیر نے دریافت کیا۔ جہاں پناہ کے حضور میں تمہیں کیا کہنا ہے۔

"جہاں پناہ کی شہزادی کے ساتھ نکاح کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ فقیر نے نہایت جرات سے جواب دیا۔

ابھی فقیر کی زبان کا یہ جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ فرط غضب میں وزیر کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ بھرپور برہمی کے انداز میں کانپتے ہوئے کہا۔

حرم شاہی کے ساتھ فقیر کی نہایت توہین آمیز جسارت ہے۔ یہ لب کشائی کی جرات سے پہلے تمہیں اپنی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہئے تھا۔ اس ناقابل برداشت گستاخی کی تمہیں سزا ملنی چاہیے۔

سلطان نے وزیر کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔

" یہ مجرم نہیں ہے اسلام کا بخشا ہوا حق استعمال کر رہا ہے۔ پیغام نکاح کے لئے اسلام میں شاہ وگدا، امیر وغریب اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں

ہے۔اس کی درخواست کا جواب یا زیانوں کی دھمکی سے نہیں دیا جا سکتا۔اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا جواب حاصل کرنے کے لئے ایک ہفتہ بعد آئے۔"

یہ جواب سن کر پیشانی میں امید کی تابانی لئے ہوئے فقیر دربار شاہی سے واپس لوٹا۔

دل مبتلا کے لئے ایک ہفتہ کی مدت صبح قیامت کی طرح طویل ہوگئی۔بڑی مشکل سے انتظار کے یہ دن کٹے۔

اس درمیان میں بادشاہ نے وزیر کو اپنی منشاء سے آگاہ کر دیا تھا کہ صاف انکار کی بجائے حسن تدبیر سے فقیر کو ٹالا جائے۔یا پھر کوئی ایسی شرط رکھی جائے جس کو پورا کرنا قریب ناممکن ہو۔

جب ساتویں دن فقیر دربار میں حاضر ہوا تو وزیر نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا۔اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور مہر و شرافت کی زبان میں فقیر سے مخاطب ہوا "شہزادی کے لئے دنیا کے نامور اور عظیم المرتبت بادشاہوں کی طرف سے بے شمار پیغامات موصول ہوئے ہیں،تمہارا پیغام بھی انہیں میں شامل کر لیا گیا ہے۔البتہ تم اگر ایک شرط پوری کر دو تو یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا پیغام قبول کر لیا جائے گا۔

وزیر کا جواب سن کر اندھیرے میں ایک کرن پھوٹی اور فرط پوری کرنے کے لئے اپنی متاع زندگی تک داؤ پر لگا دوں گا!

وزیر نے کہا۔شہزادی کی انگوٹھی کے لئے سیاہ رنگ کا ہیرا چاہیے اس سے زیادہ اور کوئی شرط نہیں۔

فقیر نے جواب دیا"اس شرط کی تکمیل اگرچہ ناممکن کی حد تک مشکل ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے پورا کر دوں گا۔سنا ہے کہ وہ ہیرا سیاہ رنگ کے پہاڑوں کی برفیلی چوٹی میں پیدا ہوتا ہے۔

"خدا میری مدد کرے گا" رات بھیگ چکی تھی۔سارا شہر سناٹے کے عالم میں محو خواب تھا۔فقیر کی کٹیا سے کبھی کبھی سسکیوں کی آواز سنائی پڑتی تھی۔پیشانی زمین پر رکھے ہوئے اشک بار آنکھوں کے ساتھ وہ کہہ رہا تھا۔

اے دردمندوں کے چارہ ساز،سلگتا ہوا دل لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوا ہوں حسرت کی جلی ہوئی راکھ کو زندہ کر دے۔اے محبوب بندوں کی آخری امید گاہ،مشکلات کے اندھیرے میں قدم اٹھا رہا ہوں۔اپنی رحمت کے سہارے منزل مقصود تک پہنچا دے۔اپنے حبیب کی شاداب تجلیوں کے صدقے میرے رستے ہوئے زخموں اور بھیگی ہوئی پلکوں پر رحم فرما۔"

صبح ہوتے ہوتے اس کے آنسوؤں کا طوفان تھم گیا۔سجدے سے سر اٹھایا تو پیشانی سے افق پر یقین کا اجالا چمک رہا تھا۔شاید رحمت بندہ نواز کی کوئی غیر محسوس تجلی دل کے ویرانے میں اتر آئی تھی۔ایک اٹوٹ عزم کا تیور لئے ہوئے فقیر اٹھا اور کاندھے پر تیشہ رکھ کر آبادیوں سے باہر نکل آیا۔عالم وحشت میں شبانہ روز چلتا رہا۔اسے اپنی منزل خود نہیں معلوم تھی کہ دل کے غیبی سنگل پر قدم آگے بڑھ رہے تھے۔خدا کی وسیع کائنات میں صرف سیاہ رنگ کے ہیرے کا ایک چمکتا ہوا نگینہ مطلوب تھا۔

چلتے چلتے ایک دن کہسار کی وادی میں شام ہوگئی۔ہر طرف وحشت ناک تاریکی اور بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔جدھر نگاہ اٹھتی سر بفلک پہاڑوں کی دیواریں راستہ روکے کھڑی تھیں۔حیرانی کے عالم میں ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر بعد درندوں کی خوفناک آوازیں ہر طرف سے گونجنے لگیں۔زندگی خطروں میں گھر گئی۔جان کے لالے پڑ گئے۔لیکن خدا کی کارسازی پر اس کے دل کا مخفی اعتماد پہاڑ کی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔کرشمہ غیب کے ایک تماشائی کی طرح وہ ساری رات جاگتا رہا۔صبح کے وقت جونہی آنکھ لگی کسی نے شانہ پکڑ کر ہلایا۔آنکھ کھل گئی۔ایک بوڑھا آدمی سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

جس راستے سے تم یہاں پہنچے ہو اس کے دہانے پر کالے پہاڑ کی برفیلی چوٹی سے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کے گری ہے۔یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔تیشہ اٹھا اور کوٹ کر اپنے نکلنے کا راستہ بنا لو ورنہ آج شام تک یہ ساری وادی برف کے سیلاب میں ڈوب جائے گی۔

فقیر گھبرا کے اٹھا۔جیسے ہی وادی کے دہانے پر پہنچا دیکھا کہ برف کی بہت بڑی چٹان راستے میں حائل ہوگئی ہے۔سارا دن تیشہ چلاتا رہا۔دن بھر کی لگاتار محنت کے باوجود گزرنے کے لائق رستہ نہیں بن سکا۔سورج ڈوب رہا تھا۔فقیر نے پوری طاقت کے ساتھ تیشہ چلایا۔بھرپور وار سے چٹان کا بہت بڑا حصہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔جمی ہوئی چٹان کے اندر سیاہ رنگ کا ایک تابدار نگینہ دمک رہا تھا۔فقیر نے حیرت کے ساتھ اسے کھود کر نکالا۔ہتھیلی پر رکھتے ہی ایک کرن پھوٹی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

پردہ غیب کی کارسازی پر فقیر کا دل جھوم اٹھا۔نامعلوم طور پر اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ سیاہ رنگ کا ہیرا ہے جسے گوہر مقصد کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ایک حیرت انگیز خوشی کے عالم میں وہ بلخ کی طرف جست لگاتا ہوا چل پڑا۔کئی دن کے شبانہ روز سفر کے بعد شام کو وہ بلخ پہنچ گیا۔دوسرے روز شاہی دربار کے فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔

وزیر نے دیکھتے ہی ایک برہمی کے انداز میں کہا۔

"تم پھر آ گئے۔حالانکہ اس دن تم سے آخری بات کہہ دی تھی۔شریف لوگوں کا یہ شیوہ نہیں تھا۔"

"برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں شرط پوری کرنے آیا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے سیاہ رنگ کا چمکدار ہیرا بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بار دنیا کا ایک بے مثل ہیرا دیکھ کر سارے درباری دنگ رہ گئے۔ بادشاہ بھی مجسم تصویر حیرت بنا دیکھتا رہا۔

وعدے کے مطابق فقیر نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ شاید مقصود سے ہمکنار ہونے کی گھڑی قریب آگئی ہے۔ لیکن ہائے رے ناکامی قسمت! کہ پھر وزیر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس میں شک نہیں کہ تم نے طلب صادق کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن ایک آخری شرط اور رہ گئی ہے اسے پوری کر دو تو تمہاری درخواست قطعاً منظور کر لی جائے گی یقین کرو تمہارے جذبے صادق کی آخری آزمائش ہے۔ بالکل آخری۔

توقع کے خلاف وزیر کا یہ جواب سن کر فقیر کے تصورات کی دنیا بکھر گئی۔ یکایک دل کی ساری امنگوں کا خون ہو گیا۔ لیکن وہ عشق ہی کیا جس میں پیہم ناکامیوں کی چوٹ ہی نہ کھائی پڑے۔ ہمت ہارنا راہ الفت کے مسافر کا شیوہ نہیں۔

پھر اس نے ٹوٹی ہوئی امیدوں کو سمیٹا اور وزیر سے دریافت کیا۔

"اچھا اب وہ آخری شرط کیا ہے؟"

وزیر نے جوب دیا "شہزادی کے کان کے آویزوں کے لئے دو بڑے بڑے سفید موتی مطلوب ہیں۔ جو رنگت و تابش میں ساری دنیا کے لئے بے مثال ہوں۔"

فقیر آج دوسری بار گھائل ضرور ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مایوس نہ تھا۔ پھر آج کی رات پیشانیوں کی خلش اور مناجات کی گریہ وزاری میں کٹی۔ صبح ہوئی تو خدا کا نام لیکر اٹھا اور جنون عشق کی آخری مہم پر روانہ ہو گیا۔ لگاتار کئی دن کے چلنے کے بعد ایک سمندر کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ عشق کی فلک پیا ہمت بھی کیا قیامت ہوتی ہے۔ اپنے تائیں آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ سمندر کو خشک کر کے تہہ میں چمکنے والے موتیوں کا سراغ لگا لے گا۔

اس یقین کے جذبہ میں دونوں ہاتھوں سے اس نے سمندر کا پانی پھینکنا شروع کر دیا اسی عالم جنوں خیز میں کئی دن گزر گئے پلٹ کر دیکھا تو پہاڑوں کی طرح سر اٹھاتی ہوئی موجوں کا وہی عالم شباب تھا۔ لیکن قربان جایئے عقیدہ عشق کی حیرت گری کے کہ اتنی کھلی ہوئی ناکامی کے باوجود سمندر فتح پانے کا عزم ذرا برابر متزلزل نہیں ہوا تھا۔ کئی دن کی مسلسل محنت سے اس کے بازو شل ہو چکے تھے۔ سمندر کے بجائے جگر خون جلتے جلتے خشک ہو چلا تھا۔ اتنے عرصہ کے بعد آج پہلی دفعہ اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ نہ جانے چشم امید کی وہ کون سی ادا تھی کہ اچانک غیرت کا سمندر ابل پڑا۔ نظر جھکی تو موجوں کا ایک ریلا جگمگاتے ہوئے موتیوں کا ڈھیر کنارے ڈال کر واپس جا رہا تھا۔ فرط مسرت سے فقیر کی روشن پیشانی سجدہ شکر کے اضطراب میں بوجھل ہو گئی۔ آج اپنی کامیابی سے زیادہ شان رحمت کی چارہ گری پر وہ نازاں تھا۔ اب مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھنے کا اسے سراغ مل چکا تھا۔

سجدہ شکر کی لذتوں سے شادکام ہونے کے بعد موتیوں کا ڈھیر دامن میں رکھ لیا اور فتح مندی کے سرور میں جھومتا ہوا بلخ کی طرف چل پڑا۔

بلخ پہنچ کر سیدھا شاہی محل میں داخل ہوا۔ بھرے دربار میں بادشاہ کے پایہ تخت کے سامنے دامن کے سارے موتی بکھیر دیئے۔ تڑپتی ہوئی آنکھوں کی جگمگاہٹ سے دیکھنے والوں کی چکا چوند ہو گئی۔ حیرت سے سارے درباریوں پر سکتے کی عالم طاری تھا۔

اب وہ ساری شرطیں پوری کر چکا تھا اور نہایت بے تابی کے ساتھ مژدہ جانفزا کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ کہ وزیر نے پھر اس کے جذبہ شوق کے ساتھ مذاق کیا۔ پھر اس کی شاداب امیدوں کا خون بہایا۔

تم نے ساری شرطیں پوری کر دیں۔ لیکن ذرا غور کرو کہ ایک گمنام فقیر اور ایک معزز شہزادی کے درمیان منصب وحیثیت کا جو فرق ہے اسے کیونکر مٹایا جا سکتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنے جنون خیز مطالبہ سے دستبردار ہو جاؤ۔ شاہی خاندان کے اعزاز کو صدمہ پہنچا کر تم کبھی سرخرو نہیں ہو سکو گے۔

وزیر کا یہ جواب ایک تیز نشتر کی طرح فقیر کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ دل کا وہ آبگینہ جو مایوسیوں کی زد سے بچا بچا کر رکھا تھا۔ اچانک چھن سے ٹوٹ گیا۔ پہاڑوں اور سمندروں کا فاتح آج کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ کر شکست کھا چکا تھا کہ یک بیک شاہی محل میں شور برپا ہوا۔ بدحواسی کے عالم میں ایک کنیز نے آکر خبر دی کہ اچانک شہزادی بے ہوش ہو چکی ہے۔ نبض ٹھنڈی ہو رہی ہے اور آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

سارے محل میں کہرام مچا ہوا ہے۔ بادشاہ کے پہنچتے پہنچتے شہزادی کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔

اس حادثہ پر ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ سارا دربار سوگ میں ڈوب گیا۔ شدت غم سے بادشاہ پاگل ہو گیا۔ اس خبر سے سارے شہر میں ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ فقیر کے پہلو میں حسرتوں کی ایک لاش تو پہلے ہی موجود تھی۔ اب امیدوں کی آخری لاش بھی اسے اٹھانی پڑی۔

اس قیامت خیز واقعہ پر مملکت کا ہر شخص سوگوار و آبدیدہ تھا۔ لیکن حیرت تھی کہ فقیر کے چہرے سے اضطراب کی کوئی علامت نہیں ظاہر ہو رہی تھی۔

جب تک شہزادی کی تجہیز و تکفین کا سامان ہوتا رہا فقیر سے جھکائے ساکت و خاموش بیٹھا رہا۔ جب جنازہ شاہی محل سے روانہ ہوا تو ہمراہ چلنے والوں میں

یہ بھی شامل ہوگیا۔ شہر کے سب سے وسیع میدان میں لاکھوں کے ہجوم میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور شام ہوتے ہوئے شاہی قبرستان میں شہزادی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

افسوس کہ ناز وادا اور جمال وزیبائی کا ایک گل رعنا آج کئی من مٹی کے نیچے دبا دیا گیا یہ تنہا ایک شہزادی کی موت نہیں تھی۔ ساتھ ساتھ بے شمار امیدوں کی بھی موت ہوگئی۔

رات کی زلف سیاہ کمر سے نیچے ڈھل چکی تھی۔ سارا شہر سوگوار اداسیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تنہا ایک فقیر اپنی کٹیا میں جاگ رہا تھا۔ یک بیک سناٹے کی بھرپور خاموشی میں تیشہ لئے ہوئے اٹھا اور سیدھا شاہی محل کے قبرستان میں داخل ہوگیا تاج عشق نے اسے بے انتہا حوصلہ مند بنا دیا تھا۔

آستین چڑھاتے ہوئے آج وہ موت سے لڑنے آیا تھا۔ اپنے جنون پرور یقین کی سہارے آج اسے تقدیر کا فیصلہ بدلوانا تھا۔ سب سے پہلے گھٹنا ٹیک کر اس نے شہزادی کے مدفن کی خاک کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد جلد از جلد قبر کی مٹی ہٹائی۔ چونکہ قبر بالکل تازی تھی۔ اس لئے جلد ہی تختے تک پہنچ گیا۔ چند تختے کھولنے کے بعد جونہی کفن کا آنچل نظر آیا اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ بے اختیار قبر کے اندر اترا اور عشق کی بخشی ہوئی ہمتوں کے سہارے نعش کو باہر نکالا۔ کاندھے پر رکھا اور تیز تیز ویران جھاڑیوں سے گزرتا ہوا کٹیا میں پہنچ کر دم لیا۔ اور کاندھے سے نعش اتار کر نہایت حفاظت واحترام کے ساتھ ایک گوشے میں لٹا دیا۔

اب عشق کا فرشتہ ایک ٹھنڈی لاش کے اندر زندگی کی تپش واپس لانے کے لئے آسمان کی طرف مائل پرواز تھا۔

آنسوؤں میں نہائی ہوئی دعا جونہی عرش سے ٹکرائی اچانک کٹیا کے دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آنے والا اپنی وضع قطع سے کوئی طبیب حاذق معلوم ہو رہا تھا۔ سر پر دواؤں کا بوجھ لادے ہوئے اس کے ہمراہ ایک ملازم بھی تھا۔ کٹیا کے اندر داخل ہوتے ہی طبیب نے شہزادی کا کفن اٹھایا۔ نبض پر ہاتھ رکھا اور فقیر کو آواز دی۔

وقت کی قیمتی مہلت ضائع نہ کرو۔ زندگی کی واپسی کی توقع گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہے۔ شہزادی کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ سکتے کی حالت طاری ہے"

زنبیل سے دوا کی ایک شیشی نکال کر فقیر کو دیتے ہوئے کہا۔

"نہایت تیزی کے ساتھ شہزادی کے تلوؤں پر اس کی مالش کرو۔

اب فقیر کی پر امید پر نگاہوں کا عالم قابل دید تھا۔ ادھر اس نے دواؤں کی مالش شروع کی ادھر طبیب کی نگاہیں شہزادی کے چہرے پر جم گئیں۔

چند لمحے بعد اچانک شہزادی کے جسم میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ فقیر یہ کرشمہ حیرت دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگیا۔

طبیب نے پھر ایک سیال دوا کی شیشی اٹھائی اور شہزادی کی ناک میں اس کے چند قطرے ٹپکائے فوراً ہی ایک چھینک آئی اور شہزادی نے آنکھیں کھول دیں۔

اچانک ایک اجنبی ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر شہزادی حیران رہ گئی۔ کفن کے آنچل سے منہ ڈھانپتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت کہاں ہوں؟ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ جلد بتاؤ۔ دماغ پاگل ہو رہا ہے۔"

فقیر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

کسی بات کا اندیشہ نہ فرمایئے۔ آپ اس وقت ایک محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔ اور اس کے بعد تفصیل وار شروع سے آخر تک سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ بیان کرتا رہا اور شہزادی حیرت میں ڈوبی ہوئی سنتی رہی۔ سارا ماجرا سن لینے کے بعد شہزادی کو عشق صادق کی حمایت میں قدرت کی کارفرمائی کا یقین آگیا۔ الجھاتی ہوئی آواز میں بمشکل تمام یہ الفاظ منہ سے نکل سکے۔

"پردہ غیب کی چارہ گری جس خواب کی پشت پناہی کر رہی ہے اب اسے شرمندہ تعبیر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

طبیب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر کیا دیر ہے؟ میرے خیال میں ایک لمحہ کے لئے بھی ماحول کا غیر محرم رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا!

یہ کہتے ہوئے طبیب نے فقیر کو سامنے بٹھایا اور اپنے ساتھ ملازم کو شاہد بنا کر ایجاب وقبول کی رسم ادا کرا دی اور ایک فرشتہ غیب کی طرح دعا مانگتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

آج فقیر کی فاتحانہ مسرتوں کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ خوشی کے آنسوؤں سے آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اور بار بار زبان پر یہ الفاظ مچل رہے تھے۔

خداوند تیری شان بندہ نوازی کے قربان، یہیں میں شفایاب بھی ہوگیا۔ سچ فرمایا تیرے رسول محترم ﷺ نے کہ تیرے کرم پر بھروسہ کرنے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے۔

فقیر کی زندگی کا آج نیا دور شروع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ خوشحالی کے دن سنورنے لگے مستقبل کا چہرہ نکھرنے لگا۔ شریک غم ساتھی کی طرح شہزادی نے فقیر کے ساتھ اپنی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شاہی زندگی غربت وافلاس کے سانچے میں ڈھل گئی۔ کسی حال میں بھی پیشانی پر بل نہیں

آیا۔کئی سال گزر گئے۔لیکن شہزادی نے اپنے دوبارہ جی اٹھنے کے راز سے کسی کو باخبر نہیں ہونے دیا۔فقیر کی کٹیا سے شاہی محل کا فاصلہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ صرف فقیر کے لئے زندہ کی گئی ہے۔اس لئے زندگی کا دائرہ عام وسیع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خاندان کی لاڈلی بیٹی کے انتقال کے بعد شاہی محل پر ہمیشہ کے لئے غم چھا گیا۔دربار کی رونقیں سرد پڑ گئیں۔بیٹی کے غم میں بادشاہ کی زندگی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اداس ہوگئی۔اب وہ نہ چہل پہل تھی اور نہ وہ شاہانہ کروفر کا اہتمام تھا۔طبیعت سادگی کی طرف مائل ہوگئی۔دینی مشاغل سے دلچسپیاں بڑھنے لگیں۔مسجدوں کی تعمیر اور مدرسوں کا قیام،وعظ وتذکیر کی مجالس کا انعقاد بادشاہ کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ہفتہ کا ایک دن تعلیمی اور اداروں کا معائنہ کرنے کے لئے مخصوص تھا۔

آج ایک مکتب کی سالانہ تقریب تھی۔تمام بچے صاف ستھرے لباس میں بادشاہ کے خیر مقدم کے لئے کھڑے تھے۔جونہی بادشاہ کی سواری آئی تمام بچوں نے جھک کر سلام کیا۔ناگہاں بادشاہ کی نظر ایک چار سالہ بچے پر پڑی اور دل از خود اس کی طرف کھنچنے لگا،بار بار اسے دیکھنے کی خواہش مچلنے لگی۔

بالآخر اسے اپنے پاس بلا کر بٹھالیا اور معلم سے دریافت کیا۔

اتنا روشن ودلکش چہرہ ریاست میں پہلی بار نظر سے گزر رہا ہے۔یہ کسی ارجمند باپ کے چمن کا پھول ہے۔

معلم نے جواب دیا۔"مدرسہ میں داخل ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں اسے لیکر کبھی کبھی اس کا باپ بھی ہمراہ آتا ہے۔ویسے ظاہری وضع قطع سے غریب و مسکین آدمی نظر پڑتا ہے۔

بادشاہ حیران تھا کہ ایسا روشن،تابندہ بچہ کیونکر پیدا ہوگیا۔چلتے وقت معلم کو ہدایت کر گیا کہ اس کے باپ کو بچے کے ہمراہ دربار میں حاضر کیا جائے۔شام کو معلم نے بادشاہ کا حکم فقیر کو پہنچاتے ہوئے تاکید کی کہ اپنے بچے کو لیکر دربار میں فوراً حاضر ہو جائے۔

فقیر نے جب شہزادی سے اس کا تذکرہ کیا تو یکا یک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔رہ رہ کر اسے محسوس ہونے لگا کہ شاید مشیت الٰہی ایک سربستہ راز کو بے نقاب کر دینا چاہتی ہے۔

حاکم کا حکم تھا۔مجبوراً دوسرے دن بچے کو بنا سنوار کر باپ کے ہمراہ کر دیا۔پیدائشی حسن کی رونق ہی کیا کم تھی کہ اب ظاہری آرائش نے اسے نگارخانہ قدرت کا شاہکار بنا دیا بچے کو ہمراہ لیکر جب فقیر اپنا بھیس بدل کر دربار میں حاضر ہوا تو بیک وقت میں سینکڑوں نگاہیں بچے کی طرف گئیں۔چہرہ جمال کی تابندگی اور جلوہ خداداد کی دلکشی دیکھ کر ہر شخص دم بخود گیا۔

بادشاہ کے جذبہ شوق کا عجیب حال تھا۔تخت شاہی سے اٹھ کر بچے کو گود میں بٹھالیا۔نامعلوم طور پر دل کی کشش تیز ہوگئی۔رگوں کا خون جوش مارنے لگا۔

دربار کو منتظر چھوڑ کر آج پہلی بار بادشاہ حرم سرا میں داخل ہوا ملکہ دوڑی ہوئی خدمت میں حاضر ہوئی۔ہمراہ ایک مانوس شکل وصورت کا بچہ دیکھ کر ملکہ حیرت میں پڑ گئی۔بار بار اسے دیکھ رہی تھی۔بے ساختہ بول اٹھی۔

"ذرا غور سے دیکھئے اس کی پیشانی،ہونٹ ہو بہو مرحوم شہزادی کی طرح ہیں۔جیسے بھی ممکن ہو یہ بچہ مجھے دلایا جائے۔

بادشاہ نے جواب دیا۔"ویسے بھی میں نے معلوم کیا ہے یہ ایک فقیر کا بچہ ہے لیکن کوئی اپنے بچے کو بخوشی کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔اور کسی کی گود کا کھلونا جبراً چھین لینا انسانی مروت کے خلاف ہے۔

"ملکہ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔"میں ماتا کی ماری خود ہی گوارا نہیں کرتی کہ کسی کے دل کا ٹکڑا زبردستی اس سے علیحدہ کیا جائے۔لیکن ایسا کرنے میں کیا حرج ہے کہ اس کے والدین کو بھی رہائش کا انتظام کر دیا جائے۔ایک فقیر گھرانے کی معراج اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے؟"

بادشاہ نے ملکہ کو سراہتے ہوئے کہا"تمہاری یہ رائے قرین قیاس ہے۔"

محل سرائے سے واپس آنے کے بعد بادشاہ نے فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ملکہ تمہارے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے کیا تم اس کی اجازت دوگے؟"

فقیر نے جواب دیا"ملکہ کی خوشنودی کے خیال میں کسی طرح گوارہ بھی کرلوں تو اس کی ماں کبھی اسے برداشت نہیں کر سکے گی۔وہ غریب بے موت مرجائے گی۔جہاں پناہ"

بادشاہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔میں بچے کو ماں سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر محل کے ایک گوشے میں تم لوگوں کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے تو کیا حرج ہے۔بچہ بھی اپنی ماں سے علیحدہ نہیں ہوگا اور ملکہ بھی اپنا جی بہلاتی رہیں گی۔"

"فقیر نے کہا میں واضح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ صورت میری اہلیہ بھی پسند کر سکے گی یا نہیں۔کیونکہ مسکینوں کے لئے شاہی محل کبھی راس نہیں آتے۔"

بادشاہ نے بھی فیصلہ کن انداز میں کہا۔"تم اس کی فکر بھی نہ کرو۔ملکہ تمہاری اہلیہ کو جیسے بھی ہو راضی کرلیں گی۔"

محل کے عقبی دروازے کے اندر شاہی بیگمات کی مخصوص پالکی رکھی جاتی تھی۔شاید آج ملکہ کہیں جانے والی تھیں۔خواصوں کے جھرمٹ میں آکر ملکہ بیٹھ گئی اور شاہانہ کروفر کے ساتھ پالکی آگے بڑھی۔

راستے کے پیشوائی کرنے والا خواجہ سراؤں کا ایک دستہ آگے آگے چل رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ملکہ کسی فقیر کی کٹیا میں جا رہی ہے اس خبر کو جس نے بھی سنا اسے سخت اچنبھا ہوا۔

کچھ لوگوں نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ شہزادی کے انتقال کے بعد سے فقیروں اور مسکینوں کا رابطہ شاہی خاندان سے بہت قریب ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خدا رسیدہ درویش کی زیارت کو ملکہ جا رہی ہوں۔ آخر اللہ والوں کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ بادشاہوں کے پاس جائیں۔ وہ تو خود اقلیم ولایت کے تاجدار ہوتے ہیں۔ سو بادشاہوں کو غرض ہو تو ان کے قدموں کی خاک سے برکت حاصل کریں۔

پالکی شاہی باغ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ فقیر کی کٹیا تک جانیوالا راستہ نہایت پر پیچ تھا۔

ایک خواجہ سرانے آگے بڑھ کر فقیر کی کٹیا سے گھبرایا ہوا باہر نکلا۔ آج پہلی مرتبہ دروازے پر ایک پالکی دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔

خواجہ سرانے نے فقیر کو مطلع کیا کہ پالکی میں ملکہ تشریف لائی ہیں۔ وہ تمہاری اہلیہ سے ملنا چاہتی ہیں۔ تخلیہ کر دو۔

یہ خبر سن کر فقیر کا دل دھک سے ہو گیا۔ بدحواسی کے عالم میں شہزادی کو اطلاع دی۔ سالہا سال کا مخفی راز آج بے نقاب ہوا چاہتا ہے۔ اب چھپنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عقل ماؤف ہو گئی۔ خون سوکھ گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس عالم میں شہزادی دم بخود کھڑی تھی کہ کٹیا کے اندر ملکہ داخل ہوئیں۔ پہلی نظر پڑتے ہی آنکھ جھپک گئی۔

دوبارہ کھلی تو سکتے کا عالم طاری ہوا۔ تھوڑی دیر بعد منہ سے ایک چیخ نکلی! شہزادی۔ فوراً ہی دوسری چیخ بلند ہوئی۔

نظر کا مشاہدہ دل مان گیا تھا۔ لیکن دماغ انکار کر رہا تھا۔ دفنائی ہوئی بیٹی کیونکر زندہ ہو سکتی ہے۔ مرنے کے بعد آج تک کون واپس لوٹا ہے۔ ایک ناممکن بات کبھی واقع نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف نظر کا دھوکہ ہے۔ بیداری کا خواب ہے۔ یقیناً آنکھ کا کھلا فریب ہے۔

پھر ملکہ نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ پھر چیخیں بلند ہوئیں کیا واقعی شہزادی ہو۔ میری لخت جگر ہو۔ میری آنکھوں کی روشنی ہو۔ ہائے آج میری نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟

شہزادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ یقین کیجئے میں سچ مچ آپ کی شہزادی ہوں۔ میں آپ کی وہی بدنصیب بیٹی ہوں جسے مردہ سمجھ کر دفنا دیا گیا تھا۔ کرشمہ قدرت سے میں دوبارہ جی اٹھی ہوں۔ حیرت نہ کیجئے۔ عشق کی غیبی توانائی مجھے عالم برزخ سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میں صرف ایک سچے اللہ والے فقیر کے لئے زندہ کی گئی ہوں۔ شاہی محل کے لئے تاہنوز مردہ ہوں۔

مرتے وقت میرا یہ جملہ آپ کو یاد ہو گا۔ کہیں پاس ہی سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی ہے۔ "سن لیجیے کہ مجھے مدفن کی خاک سے اٹھا کر وہ ٹوٹا ہوا شیشہ پھر سے جوڑ دیا گیا ہے۔"

اس کے بعد شہزادی نے تفصیل کے ساتھ تمام سرگزشت سنائی۔ دل تو پہلے ہی مومن تھا۔ اب واقعہ کی صداقت کے آگے دماغ نے بھی سپر ڈالی دی۔

اب بات کٹیا سے باہر نکل چکی تھی۔ بجلی کی طرح شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ چار سال کی مری ہوئی شہزادی اچانک جی اٹھی ہے۔

بادشاہ نے سنا تو فرط میں پاگل ہو گیا۔ آگے پیچھے سارا شہر فقیر کی کٹیا کی طرف چل پڑا تھا۔ القصہ مختصر کہ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ فقیر اور شہزادی کا جلوس نکالا گیا۔ جذبہ شوق میں سارا علاقہ ہل گیا تھا۔

کثرت اژدھام سے راستوں میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ قلعہ معلی کے دروازے پر خیر مقدم کے لئے ارا کین مملکت ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سمندر کی بے تاب موجوں کی طرح بادشاہ کے جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ جونہی قلعہ معلی کے سامنے فقیر کی سواری پہنچی۔ تحسین و مرحبا کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر فقیر کو گلے سے لگا لیا۔ ساری دنیا خوشی کے عالم میں محو تھی۔ لیکن فقیر ایک رقت انگیز تصور میں ڈوبا ہوا تھا اسے بار بار یاد آ رہا تھا کہ فقیر کا خیر مقدم کرنے کے لئے اس وقت جہاں بادشاہ کھڑا ہے۔ اس جگہ ایک دن فقیر کھڑا تھا اور نہایت لجاجت کے ساتھ باریابی کی اجازت مانگ رہا تھا۔

نہایت اعزاز و توقیر کے ساتھ فقیر کو شاہی محل میں اتارا گیا۔ اب وہ فقیر نہیں تھا سلطنت کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بادشاہ کا ولی عہد تھا۔ بلخ کا فرمانروا تھا۔ لیکن نہیں وہ اب بھی فقیر تھا۔ ایسا فقیر جس کے آگے بادشاہوں کا جلال سرنگوں تھا۔ تخت و تاج کا سب سے بڑا اعزاز قدم کی ٹھوکر پر تھا۔

تاریخ ولایت میں فقیر کا نام حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ عنہ مشہور ہے۔

پاکدامن نوجوان

ایک مجاہد کی زندگی کا یہ رخ بھی کتنا عجیب وغریب ہے کہ ساری دنیا جینے کے اسباب فراہم کرتی ہے اور وہ موت کے لئے میدانوں میں سرگرداں رہتا ہے۔کئی سو برس کا عرصہ گزارا، ملک شام کی سرسبز وشاداب پہاڑی کے دامن میں اسی طرح تین نوجوان رہا کرتے تھے۔ یہ تینوں سگے بھائی تھے۔ جو تلواروں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔شباب کی امنگوں کے دن تھے، زندگی کی بہاروں کا موسم تھا لیکن دیوانہ کو کون سمجھائے کہ اس کا عالم ہی ساری دنیا سے نرالا ہے کوئی پھولوں کی انجمن میں سکون پاتا ہے۔ یہ ظالم کانٹوں پر چل کر خوش ہوتا ہے کسی کی رات نیند کی سرمستیوں میں بسر ہوتی ہے لیکن سائے تا دم سحر آنکھ پھوڑنے ہی میں مزا آتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے، کہ تینوں بھائیوں کے سینے میں بھی دل دیوانہ تھا، دیوانگی زلف لیلیٰ کی نہیں تھی۔ ملت کے اعزاز وسربلندی کی تھی۔شہادت وسرفروشی کی تھی۔رضائے مولیٰ اور خوشنودی حق کی تھی۔اس آرزو کی تھی کہ خون کا آخری قطرہ دے کر بھی اگر سرکار بطحا راضی ہوجائیں تو یہ سودا گراں نہیں ہے۔ ساری متاع ہستی لٹا کر بھی اگر نجات کا سرمدی پروانہ مل جائے تو یہ زندگی کی سب سے بڑی منفعت ہے۔

اسی جذبے میں یہ تینوں بھائی گھر سے نکلے۔ ہمراہ جینے کا سامان کم، موت کا سامان زیادہ ہاتھ میں تلوار سر پر کفن، بازو میں کمان، شانے میں ترکش اور دل میں شہادت کی امنگوں کا جذبہ ابل رہا تھا۔آرزوئے مقصود کی تلاش میں شب وروز چلتے رہے۔منزلوں پر منزلیں بدلتی رہیں لیکن شوق کے طوفان کا تلاطم ابھی کم نہیں ہوا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔اس کی آخری کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں سے رخصت ہورہی تھیں۔شفق کے دامن میں لالہ کی سرخی تیز ہوتی جارہی تھی۔دن بھر کے تھکے مسافر اپنی منزلوں کی طرف پلٹ رہے تھے۔شام کی سیاہی گیسوئے جاناں کی طرح ہرطرف پھیلتی جارہی تھی اور تینوں جانوں کا یہ مختصر سا قافلہ ایک پہاڑی کے دامن سے گزرتے ہوئے کسی ہموار زمین کی جستجو میں سرگرداں تھا۔اس لئے نہیں کہ لیٹ کر تھکن دور کرلی جائے۔ بلکہ اس لئے کہ مالک بے نیاز کے سامنے ماتھا ٹیک کر روح کی پیاس بجھائی جائے۔

کافی دیر کے بعد کچھ ہی بلندی پر ایک ہموار چٹان نظر آئی۔آسمان پر کمند ڈالنے والوں کے لئے وہاں تک پہنچنا کیا مشکل تھا۔نہایت تیزی کے ساتھ تینوں اس پر چڑھ گئے۔اب نماز کی تیاری شروع ہوگئی۔

چھوٹا بھائی جونہی اذان دینے کے لئے کھڑا ہوا کہ قریب سے ہی اللہ اکبر اللہ اکبر کی پرجلال آواز کان میں آئی۔ یہ سنتے ہی بڑا بھائی وارفتگی شوق کی بے خودی میں اچھل پڑا بے ساختہ منہ سے آواز نکلی۔ ہماری بیتاب آرزوؤں کا سراغ مل گیا اب ہماری محنت سفر وصول ہوجائے گی۔ منزل مقصود قریب آگئی ہے شاید؟ بڑے بھائی کی یہ کیفیت دیکھ کر چھوٹے بھائی نے اچنبھے سے دریافت کیا۔ بھائی جان! آپ کا مطلب ہم نہیں سمجھ سکے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ آوز کہاں سے آرہی ہے؟ بڑے بھائی نے مشفقانہ انداز میں جواب دیا۔میرے عزیز! یہ مجاہدین اسلام کا لشکر معلوم ہوتا ہے۔جس میں شریک ہونے کی تمنا ہمیں یہاں تک کھینچ لائی ہے۔کہسار کی وادیوں میں سوائے مجاہدین کے اور کون نماز کھڑے کرسکتا ہے؟ غالباً اسی پہاڑ کی جانب سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔وقت جارہا ہے آؤ! پہلے نماز پڑھ لیں اس کے بعد سراغ لگالیں گے چھوٹے بھائی نے نہایت پرشکوہ اور دردناک لہجہ میں اذان دی۔اس کے بعد جماعت سے نماز ادا کی گئی سنت ونوافل سے فارغ ہوکر تینوں بھائی پہاڑ کے کنارے کنارے لشکر کی تلاش میں نکلے۔

چاندنی رات تھی، اس لئے پہاڑی راستہ طے کرتے ہوئے انہیں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔کافی دیر تک چلنے کے بعد قریب ہی سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی تینوں بھائی چونک کر کھڑے ہوگئے اور ہتھیار سنبھال لئے۔نظر اٹھی تو سامنے دو عربی سوار آتے ہوئے دکھائی دئے۔قریب پہنچ کر دونوں نے بلند آواز سے کہا۔

"السلام علیکم" بھائیوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ع رحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا ہم دریافت کرسکتے ہیں آپ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں؟ اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ عربی سواروں نے نہایت لجاجت سے پوچھا۔

ہم لوگ ملک شام سے آرہے ہیں۔خدا کی راہ میں گھائل ہوکر جان دینے کی آرزو ہمیں یہاں تک کھینچ کر لائی ہے۔میدان کارزار کی طرف جانے والے قافلوں کی تلاش میں صحراؤں بیابانوں اور ویرانوں کی خاک چھانتے ہوئے کافی دن بیت گئے لیکن کہیں سراغ نہیں ملا۔ابھی مغرب کے وقت پہاڑ کی دوسری جانب سے اذان کی آواز سن کر دل نے گواہی دی ہو نہ ہو قریب ہی کہیں اسلامی لشکر کا پڑاؤ ہے اس جستجو میں جارہے تھے کہ آپ حضرات سے ملاقات ہوگئی۔

خوش آمدید کہتے ہوئے عربی سوار گھوڑے سے اتر پڑے اور اسلامی تہذیب کے مطابق معانقہ اور مصافحہ سے فارغ ہوکر انھوں نے کہا کہ اذان کی آواز سن کر ہم بھی اسی غرض سے نکلے تھے۔

آپ حضرات کی مجاہدانہ امنگوں سے ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ خدائے قدیر ہر مسلمان نوجوان کو اپنے دین کے لئے اسی طرح کی سرفروشی کا جذبہ عطا فرمائے۔ ایمان کی یہی تپش ملت اسلام کی نبض کو پر سوز اور متحرک رکھتی ہے۔ جس قوم میں آپ جیسے فلک پیا ہمت رکھنے والے مجاہد ہوں۔ اس کا پرچم سرنگوں نہیں ہوسکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ روم کی سرحد پر ایک بڑا ہی المناک معرکہ پیش آگیا ہے۔ مسیحی قوم کی ساری قوتیں چاروں طرف سے سمٹی آرہی ہیں۔ دین حق کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے عیسائی دنیا کے سارے سورما میدان میں اتر آئے ہیں۔ چالیس ہزار صف شکن بہادروں پر ہمارا لشکر اسی پہاڑ کے عقب میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اور آج ہی رات کو پچھلے پہر روم کی سرحد کی طرف کوچ کر جائے گا۔ عربی سواروں کی زبان سے یہ خبر سن کر تینوں بھائی فرط شوق میں جھوم اٹھے۔ میخانہ کوثر کی شراب آنکھوں سے ٹپکنے لگی۔ شہادت کی خوابیدہ امنگیں انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں۔ سواروں کی رہنمائی میں جونہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسلامی لشکر کے قریب پہنچے۔ بے ساختہ منہ سے نعرہ تکبیر کی آواز نکل پڑی۔ لشکر نے نعرے کا جواب پر جوش نعرے سے دیا۔

تین نئے مجاہدین کی آمد پر سارے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے ان کے قدموں کے نیچے دلوں کا فرش بچھا دیا۔ سپہ سالار نے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا دعائیں دیں اور دینی ولولوں کی تپش معلوم رکے مبارکباد کا ہدیہ پیش کیا۔ رات کے پچھلے پہر تہجد کی نماز سے فارغ ہوتے ہی کوچ کا اعلان ہوا اور دم کے دم میں کہسار کی وادیاں خالی ہوگئیں۔ دریاؤں پہاڑوں اور صحراؤں کو روندتا ہوا اسلامی لشکر امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگا۔ سطوت جلال کی ہیبت سے دھرتی کا سینہ دہل اٹھا۔ کائنات کی سب سے بڑی طاقت آج حرکت میں آگئی تھی۔ اسلام کی غیرت نے ایسی انگڑائی لی تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کا کلیجہ دھک سا ہوگیا۔ شبانہ روز چلتے چلتے روم کی سرحد کا فاصلہ جب چند میل رہ گیا تو حالات کا جائزہ لینے کے لئے سپہ سالار نے لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا۔ دشمن کی نقل و حرکت کا سراغ لگانے اور جنگی تیاریوں کی خبر حاصل کرنے کے لئے پچاس مجاہدین پر مشتمل جو دستہ تیار کیا گیا۔ اس میں تینوں بھائی بھی شامل تھے۔ کیونکہ انہیں پہلے سے روم کے متعلق واقفیت حاصل تھی۔

یہ چھوٹا سا دستہ پہاڑوں اور جنگلوں کے محفوظ مقامات سے گزرتا ہوا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک رومیوں کے ایک لشکر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوگئیں نیز حرکت میں آگئے اور مٹھی بھر مجاہدین کا یہ دستہ رومیوں کے ٹڈی دل لشکر پر ٹوٹ پڑا تینوں بھائی بجلی کی طرح کوندتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے قلب لشکر تک پہنچ کر وہ رومی سپہ سالار کا حلقہ توڑنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے کسی نے کمند پھینک کر انہیں گرفتار کرلیا لڑائی ختم ہونے کے بعد انہیں جنگی قیدیوں کی طرح پا بجولاں رومی اپنے ہمراہ لے گئے اس بہادر اقدام اور حوصلہ شکن مقابلہ سے اسلامی لشکر کی کچھ ایسی دھاک دشمن کے دل پر بیٹھ گئی کہ وہ جنگ کرنے سے دستبردار ہوگئے۔ بالآخر کئے ہفتے قیام کرنے کے بعد اسلامی لشکر کو حجاز کی طرف واپس لوٹ آنا پڑا۔

آج تین قیدیوں کے فیصلے کا دن تھا روم کا عیسائی بادشاہ جونہی دربار میں آ کر بیٹھا۔ جلاد نے تینوں کو لا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ تینوں بھائیوں کے چہرے پر خوف و دہشت کا مطلق کوئی اثر نہیں تھا۔ انجام کی فکر سے بے پرواہ وہ بھرے دربار میں مطمئن کھڑے تھے۔

بادشاہ نے گرجتے ہوئے کہا تم ہمارے ملک پر حملہ کرنے آئے تھے لیکن قبل اس کے کہ تمہارا خوفناک منصوبہ پورا ہوتا گرفتار کر لئے گئے۔ اب اس جرم کی سزا سوائے موت کے کچھ نہیں۔ لیکن تمہارے خوشنما چہروں اور حسین جوانیوں پر مجھے ترس آرہا ہے۔ ایک شرط مان لو تو تمہاری جان بخشی ہوسکتی ہے۔ جان بخشی ہی نہیں شاہی دربار کا بڑے سے بڑا اعزاز تمہیں حاصل ہوسکتا ہے۔

بڑے بھائی نے بھرپور شان بے نیازی سے دریافت کیا "وہ شرط کیا ہے؟"

"بادشاہ نے جواب دیا۔ "بہت معمولی شرط ہے صرف اپنا مذہب تبدیل کردو۔ اسلام کو چھوڑ کر دین عیسوی قبول کرلو اسلام کے غیور مجاہد نے پر جلال آواز میں بادشاہ کو مخاطب کیا۔

"افسوس تمہاری دانائی پر" شرط زندگی کی تم معمولی کہتے ہو۔

جس مذہب کے فروغ کے لئے ہم نے تلواروں کی نوک پر اپنا سر رکھ لیا ہے اسے چھوڑنے کی بات کس درجہ مضحکہ خیز ہے۔

تم نے ہمیں موت کی دھمکی دی ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ کافی محنتوں کے بعد ایک میدان ہاتھ آیا بھی تو شاہد مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہم گرفتار کر لئے گئے۔ منصب و اعزاز کی رشوت دے کر تم ہمارا ضمیر نہیں خرید سکتے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے تئیں قافلہ حیات کی منزل تخت سلطانی نہیں ہے اس کا سانچہ تو ہمارے قدموں کی ہر ٹھوکر پر بنتا بگڑتا ہے۔ ہماری قومی سرگرمیوں کا مرکز صرف اپنے محبوب کی خوشنودی ہے۔

نوجوان نے جذبات کے تلاطم میں شرابور ہوتے ہوئے کہا "اے خوشا نصیب!" کہ وہ ارجمند ساعت اب قریب آگئی ہے۔ عالم قدس کی طرف جانے والے مسافر تیار کھڑے ہیں اپنے جلادوں کو حکم دو کہ دیر نہ کریں۔ تلواروں کی چھاؤں سے جنت کا فاصلہ صرف ایک قدم ہے۔

ایک قیدی کے اس جرات آمیز بیان پر دربار میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ عیسائی بادشاہ غصے سے دانت پیسنے لگا۔

فرط غضب میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس نے کہا" گستاخ و دریدہ ذہن کی طرح زبان کھول کر تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے تو تیار ہو جاؤ! شاہی

دربار کی یہ توہین ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ فولادی زنجیروں میں بھی تمہارا حق پرستی کا غرور کم نہیں ہوا۔ تلواریں معزز بہادروں پر اٹھا کرتی ہیں تم جیسے گستاخوں کی موت کا سامان تلوار نہیں آگ ہے۔

غصہ میں کانپتے ہوئے اس نے جلادوں کو حکم دیا کہ دہکتی ہوئی آگ پر تیل سے بھرا ہوا کڑھاؤ چڑھا دو جب وہ ابلتے ہوئے چشمے کی طرح کھولنے لگے تو مجھے فوراً خبر کردو۔

بیڑیوں میں جکڑے ہوئے قیدی سامنے کھڑے تھے۔ جلادوں کا دستہ حکم کی تعمیل کے لئے الٹے پاؤں رخصت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد نقیب نے آکر آواز دی، جہاں پناہ! دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا چشمہ ابل رہا ہے۔ گستاخوں کے عبرتناک انجام کا تماشا دیکھنے کے لئے کرسیاں مقتل کے سامنے بچھا دی گئی ہیں۔

یہ اطلاع پا کر عیسائی بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ اٹھا۔ پیچھے پیچھے تلواروں کے سائے میں اسلام کے شہزادے بھی مقتل کی طرف رواں تھے۔ آگ دہک رہی تھی آنچ اور تیز کردی گئی تھی۔

قیامت خیز طغیانی کی طرح تیل کا چشمہ پھوٹ پھوٹ کر ابلنے لگا۔ کڑھاؤ کی طرح بنے ہوئے دو کھمبوں کے بیچ میں ایک موٹی رسی لٹک رہی تھی، اس میں گردن کی گولائی کے برابر ایک حلقہ بنا ہوا تھا۔

سب سے پہلے جلادوں نے بڑے بھائی کی گردن میں رسی کا پھندا ڈالا اور جیسے ہی اسے کھینچنا چاہا، دونوں بھائی چیخ اٹھے۔ پہلے ہمیں تیل میں ڈالا جائے۔ بڑے بھائی کا جلنا ہم سے دیکھا نہ جائے گا۔

بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ صبر وضبط سے کام لو۔ کھولتے ہوئے تیل کے قریب ہی چشمہ کوثر کا دھانہ ہے۔ ایک ہی غوطہ وہاں پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ لب کوثر پر تمہارا انتظار کروں گا۔ خبردار! گھبرانا مت! دہکتی آگ کے پیچھے ہی جنت ہے اچھا خدا حافظ!

بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی جلادوں نے رسی کھینچی۔ دین کا ایک سرفروش مجاہد اب اوپر اٹھ رہا تھا۔ تصور جاناں میں آنکھیں بند تھیں شاید مقصود سے ہمکنار ہونے کی خوشی چہرے کا بوسہ لے رہی تھی۔ فرشتگان رحمت عالم قدس کی گزرگاہوں پر ہر طرف کھڑے تھے۔

کڑاہ کے مقابل پہنچ جانے کے بعد جلاد نے رسی ڈھیلی کردی۔ شاخ طوبیٰ کا آشیاں نشیں اب نیچے اتر رہا ہے۔ آتش فشاں کی طرح کھولتے ہوئے تیل کا فاصلہ قریب سے قریب تر ہو گیا۔ اچانک فضا میں کلمہ شہادت کی آواز گونجی۔ آگ کی لہروں میں قدم رکھتے ہوئے ایک بار "یا محمد" کا نعرہ رسالت بلند ہوا۔ ایمان پر خاتمے کی علامت کی طرح یہ ایک وفادار مجاہد اور ایک سچے مومن کا آخری نعرہ تھا۔ چھوٹے بھائی اس ہولناک منظر کی تاب نہ لاسکے۔ فرط الم سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ بے خودی میں منہ سے ایک چیخ نکلی "بھائی ساقی کوثر کے حضور ہمیں نہ بھولنا" آنکھ کھلی تو منزل قدس کے مسافر عشق کے سمندر میں غوطہ لگا چکا تھا۔ فرشتے اس کی مقدس روح کو رحمت و نور کے جھرمٹ میں لئے عالم بالا کی طرف محو پرواز تھے۔ کملاتے ہوئے پھول کی طرح جلی ہوئے لاش تیل کی سطح پر تیر رہی تھی لیکن شاداں وفرحاں روح ساقی کوثر کے حضور میں خلعت شاہانہ سے سرفراز ہو چکی تھی۔

اب منجھلے بھائی کی باری تھی، رسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے جلاد نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا، تنہائی، غریب الوطنی اور بے کسی کی اداسیاں سوکھے ہوئے چہرے سے پھوٹ رہی تھیں۔ غم کی چوٹ سے پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے منجھلے بھائی کو الوداع کہا۔ یہ منظر جب تک دیکھ سکا دیکھتا رہا۔ جب نہ دیکھا گیا تو آنکھیں بند کرلیں، پھر کلمہ شہادت کی آواز گونجی، پھر "یا محمد" کا ایمان افروز نعرہ بلند ہوا اور چند ہی لمحوں کے بعد مدتوں کی پیاسی روح چشمہ کوثر کے ساحل پر جام رحمت سے سیراب ہو گئی۔

اٹھارہ برس کا ایک نوجوان مجاہد، حسن و جمال کا پیکر زیبا، روشن پیشانی، سرگیں آنکھیں، دمکتا چہرہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ نئی عمر میں دو بھائیوں کی تڑپتی لاشیں نظر سے گزر چکی تھیں۔ دل غم سے نڈھال اور شکستہ حال ہو چکا تھا۔ لیکن ایمان کی غیرت اسی طرح تازہ دم تھی۔ اسلام کے جذبہ وفا پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ جب اس عالم ہی سے منہ پھیر لیا تو اب اس زندگی کے ارمانوں کی کہاں گنجائش رہ گئی تھی۔ قاتل نے بڑھ کر پھندا ڈالا۔ آنکھیں بند ہو گئیں، دل خیال جاناں کی محویت میں ڈوب گیا۔ اوپر اٹھانے کے لئے رسی کھینچنا ہی چاہتا تھا کہ مملکت کے وزیر نے ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت لجاجت سے بادشاہ کو عرض کیا۔

جہاں پناہ! یہ کمسن نوجوان تنہا رہ گیا ہے۔ صورت شکل سے یہ چالاک معلوم نہیں ہوتا نہایت معصوم سا ہے آسانی کے ساتھ اسے مذہب اسلام سے منحرف کیا جاسکتا ہے۔ آپ اسے میرے حوالے کردیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ چالیس دن کے اندر عیسائی مذہب قبول کرنے کے لئے تیار کرلوں گا۔

بادشاہ نے اپنے وزیر کی درخواست منظور کرلی۔ اشارہ کرتے ہی جلاد نے نوجوان کے گلے سے پھندا اتار لیا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ منزل قدس کے مسافر کو آدھی راہ سے واپس لوٹ آنا پڑا۔

مقتل سے اٹھ کر وزیر نے اپنے محل کا رخ کیا۔ نوجوان بھی ہمراہ تھا لیکن زندگی سے گریزاں، کسی دوسری ارجمند موت کی راہ سوچ رہا تھا۔ وزیر نے محل میں داخل ہوتے ہی خواجہ سرا کو آواز دی۔

دیکھو! اس نوجوان کو سب سے آراستہ اور پرتکلف کمرے میں ٹھہرائو، زندگی کی ساری آسائشیں اس کے قریب جمع کر دو۔ تھوڑی دیر بعد کنیزوں کے جھرمٹ میں شہزادی آداب بجالانے کے لئے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وزیر نے بیٹی کو گلے لگالیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور پہلو میں بٹھایا، میری ذہین اور سعادت مند بیٹی۔ آج میں نے ایک نہایت سنگین اقدام کرلیا ہے۔ تمہاری ذہانت سے توقع ہے کہ میری زبان کا بھرم رکھ لیا جائے گا۔

شہزادی نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ بندگان عالی کا حکم سر آنکھوں پر، کنیز جان دے کر بھی اپنا فرض پورا کرے گی لیکن حکم کی صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ وزیر نے کہا کہ وہ تین جنگی قیدی جو عرب کی سرحد سے گرفتار ہوکر آئے تھے وہ تینوں آپس میں سگے بھائی تھے۔ ان میں سے دو آج موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے سب سے چھوٹا بھائی جو ایک نہایت خوبصورت اور بڑا ہی شکیل، دلکش نوجوان ہے، اسے میں نے تختہ دار سے یہ کہہ کر اتارلیا ہے کہ میں چالیس دن کے اندر اپنا مذہب تبدیل کرنے پر اسے راضی کرلوں گا۔

بادشاہ نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ میں اس نوجوان کے اپنے ہمراہ لے کر آیا ہوں اگر میں نے اپنا وعدہ کردیا تو روم پر میرے حسن تدبیر کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ شہزادی نے یقین کے انداز میں کہا۔ چالیس دین کی مہلت بہت طویل ہے اسے دام فریب میں لانا میرے چند لمحوں کی بات ہے۔ تعجب ہے ایک معمولی بات کے لئے آپ اس طرح فکر مند نظر آتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا ملک فتح کرنا ہے۔

رات ڈھل چکی تھی۔ سارا محل نیند کی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی عالم میں روم کی سب سے حسین اور زہرہ جمال دوشیزہ، عشوہ طراز اداؤں کی مجسم ساحرہ وزیر کی شہزادی اٹھی۔ زرنگار جوڑے زیب تن کئے، بال سنوارے، نظر کی تیغ پر پانی چڑھایا اور سامان قتل سے پوری طرح آراستہ ہوکر اس کمرے کا رخ کیا جہاں نوجوان قیام پذیر تھا۔ جونہی اندر داخل ہوئی۔ نوجوان زمین پر پیشانی رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پیشانی زمین پر لگی رہی وہ روتا رہا، رات ڈھلتی رہی۔ وہ روتا رہا، چشم التفات کی امید میں بیٹھے بیٹھے سحر ہوگئی اپنے خرام ناز سے قیامت اٹھانے والی شہزادی طرح طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود سجدے سے ایک نوجوان کی پیشانی نہیں اٹھا سکی۔

جلوہ حسن کا سارا غرور ٹوٹ گیا۔ ماتھے پہ شکن ڈالے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ اپنی خوابگاہ کی طرف لوٹ گئی۔

دوسرے دن پھر قیامت کی ادائیں اپنے جلو میں لئے ہوئے شہزادی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ رات بھر کھڑا رہا۔ اسی حالت میں صبح ہوگئی۔ حسن مغرور آج بھی خراب وخستہ حالت میں واپس لوٹا۔

تیسرے دن سرشام ہی اس نے نوجوان کے کمرے کا رخ کیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ خوشی میں مچل گئی آج نوجوان نماز کی حالت میں نہیں تھا۔ تین دن کے بعد اب حسن کو اپنا جادو جگانے کا موقعہ ملا تھا۔

ساحرانہ اداؤں کے ساتھ جونہی وہ آگے بڑھی نوجوان نے کھڑے ہوکر فوراً نماز کی نیت باندھ لی۔

آج بھی سارے ہتھیار دھرے کے دھرے رہ گئے اسی طرح ہفتوں گزر گئے۔ حسن بے نقاب مچل مچل کر رہ گیا لیکن نوجوان نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چالیس دن کی مدت قریب آچکی تھی۔ وزیر نے ایک دن بیٹی سے دریافت کیا۔ نوجوان کا کیا حال ہے؟ کافی دن گزر گئے ہیں، ابھی تک تم نے کوئی خوشخبری نہیں سنائی۔ بیٹی نے شکست خوردگی کے انداز میں جواب دیا وہ تو ہر وقت اپنے خدا کی عبادت میں محو رہتا ہے بات کرنا تو بڑی بات ہے اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بادشاہ سے مزید چالیس دن کی مہلت حاصل کر لیجئے۔ آخر وہ فرشتہ نہیں۔ ایک انسان اپنی فطرت سے کب تک جنگ کرتا رہے گا کبھی نہ کبھی وہ شکار ہوکر رہے گا۔

چالیس دن کی میعاد ختم ہوچکی ہے۔ اب دوسری میعاد چل رہی ہے۔ ہر آنے والی رات کو نوجوان کی بے نیازی محویت اور قلب ونظر کی طہارت کا وہی عالم تھا۔ حقیقت کی دلکشی کے آگے بناوٹ کی نمائش کب تک چل سکتی تھی۔ آخر ایک دن فریب کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک خدا ترس عابد وزاہد نوجوان کی زندگی کا تقدس شہزادی کے دل پر اثر انداز ہوکر رہا۔ ہر روز کی طرح رات کی بھرپور تنہائی میں آج بھی شہزادی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی لیکن آج دل کا عالم بدل چکا تھا۔ شوق میں ڈوبی ہوئی یہ پہلی آواز تھی جو شہزادی کے منہ سے نکلی۔

پاک دامن نوجوان! میں اس مذہب پر لعنت بھیجتی ہوں جو اپنی بیٹیوں کی عصمت بیچ کر اپنے لئے جگہ حاصل کرتا ہے۔ دل کے گہرے خلوص کے ساتھ ملتجی ہوں کہ مجھے اسلام کے اس پاک دین میں داخل کر لیجیے۔ جس نے فرشتوں کا تقدس عطا کیا ہے اور جو دنیا میں صرف اپنی صداقت وروحانیت کی کشش سے پھیلا ہے۔ مال وزر اور عفت وناموس کی رشوت دے کر پھیلنے والا مذہب دنیائے انسانیت کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ نوجوان نے نظر نیچی کیے ہوئے کلمہ شہادت کی تلقین کی۔ توحید ورسالت کا اقرار کرایا اور اسے حلقہ اسلام میں داخل کرلیا۔

مسلمان ہونے کے بعد شہزادی نے مشورہ دیا کہ ہمیں جلد سے جلد یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے ابھی ہمیں دین حق کی تبلیغ کے لئے زندہ رہنا ہے۔ عرب کی سرحد قریب ہے وہیں نکل چلیں۔ ورنہ میرا اسلام ظاہر ہونے کے بعد ہم لوگوں کی جان ہلاک کئے بغیر یہ ظالم دم نہیں لیں گے۔

نوجوان نے اس شرط پر چلنا منظور کرلیا کہ تمہیں اپنے پورے جسم کے ساتھ نقاب کے اندر رہنا ہوگا۔ اور میرے آگے نہیں پیچھے چلنا ہوگا۔

دوسرے دن جبکہ رات ڈھل چکی تھی سارا محل نیند کی آغوش میں شرابور تھا۔ دو تیز رفتار گھوڑے محل کے عقبی دروازے پر کھڑے تھے۔ تاریکی میں دو سائے

بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہلکی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

آبادی سے باہر نکل کر یہ آواز تیز ہوگئی۔ ہوا سے باتیں کرتے ہوئے گھوڑے سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ آگے کے دھانے تک پہنچے قریب ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ دونوں سنبھل کر کھڑے ہوگئے۔ تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں۔ شہزادی نے کہا معلوم ہوتا ہے دشمن ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ نوجوان نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آنے والے اگر بری نیت سے آ رہے ہیں تو میری تلوار ان کے راستے میں حائل ہوئے بغیر نہیں رہے گی اور اگر وہ صرف راہ گیر ہیں تو ہم سے کوئی چھیڑ نہیں کریں گے۔

دو پہاڑوں کے درے سے باہر نکلنے کے بعد نوجوان ایک عجیب وغریب تماشا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے ساختگی میں منہ سے چیخ نکل پڑی۔

بھائی جان! کئی روز گزر گئے آپ حضرات کو جام شہادت نوش کئے ہوئے، آپ یہاں کیسے؟ عالم برزخ میں رہنے والے کیا زندوں کی طرح ہماری دنیا میں پلٹ کر آ سکتے ہیں؟

بڑے بھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ شہیدوں کا حال عام مردوں سے بالکل مختلف ہے۔

وہ جہاں اور جس برزخ میں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مرحوم بھائی نے یہ خوشخبری سنائی کہ عالم بالا میں تمہاری طہارت اور پاکدامنی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ جانِ رحمت ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہارا عقد نکاح نو مسلمہ شہزادی سے کردیں۔ شہیدوں کی یہ پاک روحیں تمہاری بزم نکاح میں شرکت کی غرض سے حاضر ہوئی ہیں شہزادی وہیں کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ عالم غیب سے آنے والوں کا یہ قافلہ دیکھ کر اسے اسلام کی کائنات کے اقتدار کا یقین اور بڑھ گیا۔ جلدی جلدی بزم نکاح منعقد ہوئی۔ ارواح طیبات کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی رسم ادا کی گئی۔ خطبہ نکاح کے بعد تمام روحوں نے نئے جوڑے کو مبارکباد دی۔ بھائیوں نے دولہا اور دولہن پر جنت کے پھول نچھاور کئے اس کے بعد روحوں کا یہ سارا مجموع دم کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

اب محرم آنکھوں کے نظارہ کے لئے شہزادی نے چاندنی رات میں نقاب الٹ دیا۔ پہلی بار چہرے پر نوجوان کی نظر پڑی تو ایسا محسوس ہوا کہ جنت سے حسن ولطافت اور ملاحت وزیبائی کی کوئی حور اتر آئی ہے۔

"دل دیوانہ" دو حیرتوں کے نشانہ سے ابھی ہٹا نہیں تھا کہ فضاؤں میں یہ آواز گونجی۔

"جنت کی بارات، جنت کا دولہا اور جنت کی حور مبارک ہو۔"

چودھویں رات کی دوشیزہ

کہتے ہیں کہ عرب سوداگروں کا ایک قافلہ بادبانی جہاز پر سوار ہو کر سپین کے ساحل سے روانہ ہوا یہ لوگ قیمتی جواہرات کے بین الاقوامی تاجر تھے۔ جن کا کاروبار دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ تاجروں کے اس گروہ میں ایک نہایت خوبرو نوجوان تھا جو اپنے سارے قبیلے کی آنکھ کا تارا تھا اس کی پیشانی سے طہارت نفس اور کردار کے تقدس کا نور جھلکتا رہتا تھا اس کا باوقار و حسین چہرہ اتنا دلکش و دلربا تھا کہ ایک بار دیکھ لینے کے بعد ناممکن تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کی آرزو نہ پیدا ہو جدھر سے وہ گزرتا جاتا نگاہوں کے چراغ جلنے لگتے۔ بات کرتا تو موتی لٹاتا۔ مسکراتا تو پھول برستے، کتنے سینوں میں اس کی ایک نگہ التفات کی آرزو مچل مچل کر دفن ہو گئی لیکن غیرت حیا کے بوجھ سے اس کی پلکیں ہمیشہ جھکی رہیں۔ ایک صالح پاکدامن اور اسلام کے غیور نوجوان کی جتنی خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ تنہا سب کا آئینہ دار تھا اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں اس کی روح ایک نامعلوم کیف سرشار ہو جاتی تھی گریہ و مناجات کی لذتوں نے اسے سحر خیز بنا دیا تھا۔

بارگاہ رسالت ﷺ سے اسے بے پناہ عقیدت تھی۔ گنبد خضریٰ کے تصور میں پہروں اس کی پلکیں بھیگی رہتی تھیں۔ صلوٰۃ و سلام کی محفلوں میں اس کے سوز و گداز اور محویت شوق کا عالم بڑا ہی رقت انگیز تھا۔ مزارات اولیاء اور محبوبان حق کے ساتھ اس کے دل کا گہرا انس کسی تلقین کا نتیجہ نہیں تھا خود اس کے ضمیر کی آواز تھی۔

نعیم جہاز سمندر کی قیامت خیز لہروں سے ٹکراتا موجوں سے کھیلتا آگے بڑھتا جا رہا تھا آفتاب کی ٹکیہ پانی کی سطح پر چمک رہی تھی۔ چند ہی لمحے کے بعد سورج غروب ہو گیا فضا میں شام کی سیاہی بکھرنے لگی اور دیکھتے دیکھتے سمندر کی بے پایاں وسعتوں پر رات کا گھنا اندھیرا چھا گیا۔

آدھی رات گزرنے کے بعد اچانک فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی سارے اہل کشتی گھبرا کر جاگ پڑے دیکھا تو دہشت سے ناخداؤں کا برا حال ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کانپتے ہوئے اشارہ کیا۔

وہ دیکھو! سمندر کا ایک نہایت مہیب اور خوفناک درندہ!!

دیکھتے ہی سارے جہاز میں کہرام برپا ہو گیا کچھ ہی فاصلے پر آبی صحرا کا ایک خونخوار جانور، جس کے جسم کی ضخامت جہاز سے کئی گنا بڑی تھی۔ جبڑا پھیلائے انگاروں کی طرح سرخ آنکھوں سے تاک رہا تھا۔ ناخداؤں نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا کہ بحر ظلمات کی سرحدوں پر اس طرح کے عجیب الخلقت اور مہیب جانور رہا کرتے ہیں جن کی قوت جذب اتنی حیرت انگیز ہوتی ہے کہ بڑے بڑے جہازوں کو ایک سانس میں کھینچ لیا کرتے ہیں ان کی زد پر پہنچ کر آج تک کوئی نہیں بچ سکا ہے۔ ہمارا جہاز غلطی سے بھٹک کر ادھر آ گیا ہے اب چند ہی لمحے کے بعد ہم موت کے منہ پہنچ جائیں گے اپنی اپنی زندگی کو آخری سلام کر لو!

یہ خبر سن معلوم کر کے بے تحاشہ نالہ و فغاں کے شور سے سمندر کی فضا گونج اٹھی جیسے جیسے جہاز اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاری تیز ہوتی جاتی تھی۔ شدت خوف سے لوگوں کے حواس باختہ ہوتے جا رہے تھے۔ دماغ کے شعور کی توانائی موت کی ہیبت سے مغلوب ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ چند ہی لمحے کے بعد اس خوبرو نوجوان کے علاوہ سارے اہل کشتی بے ہوش ہو گئے۔

اب اکیلا نوجوان ایک خوفناک صورت حال کا مقابلہ کر رہا تھا اب جہاز اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ دہشت سے نوجوان کا کلیجہ بیٹھنے لگا اس کے پھیلے ہوئے منہ کا لقمہ بننے میں اب صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

نوجون نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا ہمتوں کا بکھرا ہوا شیرازہ یکجا کیا اور شدت اضطراب کے ہیجان میں یک بیک کھڑا ہو گیا اور آنکھ بند کر کے بھرپور طاقت سے اذان دینا شروع کر دیا دوسرے ہی لمحے میں سمندر کی تاریک فضا تکبیر و رسالت کی آواز سے بوجھل ہو گئی اچانک اپنی بند آنکھوں کے ساتھ نوجوان نے کسی سخت چیز سے جہاز ٹکرانے کا جھٹکا محسوس کیا پھیلے ہوئے جبڑے کی زد پر پہنچنے کے بعد جیسے ہی اسے ایک بدبودار جسم کی گرمی محسوس ہوئی۔ بیساختہ اس کے منہ سے یا محمد کا نعرہ بلند ہوا۔

خوف سے آنکھیں بند کئے نوجوان کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ اس خونخوار درندے کی مکمل گرفت میں ہے اپنی دانست میں زندگی کی آخری ہچکی لیتے ہوئے اس نے ایک بار کلمہ شہادت پڑھا اور سکتے کی حالت میں بیٹھ گیا۔

نوجوان کی آنکھیں بند تھیں اور دل کا حال سکرات کی کیفیت سے ہم آہنگ تھا اسی درمیان میں اچانک اسے محسوس ہوا کہ جہاز تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگتا جا رہا ہے درندے کے منہ سے نکلنے والی اب وہ بدبو محسوس نہیں ہو رہی تھی نوجوان نے ہمت سے کام لے کر آہستہ آہستہ اپنی پلکوں کو اوپر اٹھایا آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ جانور سامنے موجود نہیں ہے۔ سمندر کی فضا بھی بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اب بپھری ہوئی موجوں پر تاریکیوں کے غلاف کے بجائے چاندنی کی سنہری کرن پھیلی ہوئی ہے یہ منظر دیکھ کر نوجوان کو خدا اور رسول کی غیبی چارہ گری کا یقین ہو گیا دہان مرگ سے صحیح و سلامت نکل

میں وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سورج ڈوب گیا رات آئی اور گزر گئی لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا اس کے نبض کی تپش نہایت تیزی کے ساتھ نقطہ انجماد کی طرف اترتی آرہی تھی اب وہ صرف چند گھنٹے کا مہمان تھا۔

دھوپ تیز ہوگئی تھی اور ہر طرف صحرا میں سورج کا شفاف اجالا پھیل گیا تھا۔ جڑی بوٹی اور نباتات کے ماہرین کا ایک دستہ تحقیقاتی مہم پر صحرا کا گشت کر رہا تھا گھنی اور پر پیچ جھاڑیوں میں بھٹکتے ہوئے وہ ٹھیک اسی مقام پر آنکلا جہاں جنگلی سیب کا وہ درخت تھا درخت کے نیچے ایک انسان کی لاش دیکھ کر حیرت سے چیخ پڑا۔

دستے کا رئیس ایک نہایت تجربہ کار ذہین اور سن رسیدہ حکیم تھا لاش کے قریب پہنچ کر اس نے تھوڑی دیر تک چہرے کا نہایت گہری نظر سے جائزہ لیا نبض پر ہاتھ رکھا آنکھوں کی پلکیں اٹھائیں ناخنوں کا رنگ دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دی کہ اس کے جسم میں زندگی کی آخری رمق ابھی باقی ہے اب ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے موت کی ابدی نیند سلا دے گی۔

سر جھکائے ہوئے وہ علاج کی راہ سوچ ہی رہا تھا کہ زمین پر سیب کے چھلکے اور اس کے سوکھے ہوئے ٹکڑے نظر آئے پھر درخت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو شاخوں میں اسی طرح کے پھل لٹک رہے تھے فوراً سمجھ گیا کہ اس زہریلے پھل کا یہ کرشمہ ہے فوراً اپنی زنبیل سے زہر سوخت کر لینے والی ایک جڑی نکالی اور اسے ناک کے قریب رکھ دیا چند ہی لمحوں کے بعد نوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

حواس اب بھی اپنی جگہ پر واپس نہیں آئے تھے اور قوت گویائی بدستور ماؤف بھی حکیم نے پھر اپنی زنبیل سے سبز رنگ کی دو چار پتیاں نکالیں اور انہیں انگلیوں میں مسل کر ایک قطرہ حلق میں ٹپکایا قطرے کا حلق سے اترنا تھا کہ نوجوان کو بڑے زور کی چھینک آئی اور اس کے بعد متلی کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد دو چار قے ہوئی اور سارا زہریلا پھل پیٹ سے باہر آگیا اب اس کی تھوڑی طبیعت ہلکی ہوگئی تھی ہوش و حواس بھی پلٹ آئے تھے اس گھنے جنگل میں اپنے ارد گرد انسانوں کو دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ حکیم نے اشارے سے روک دیا اور کچھ وقفہ کے بعد زنبیل سے ایک خاص قسم کے شربت کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اسے پی جاؤ۔ شربت پی جانے کے بعد اس کے جسم میں بجلی کی طرح ایک تازگی دوڑ گئی۔ ضعف و نقاہت کا اثر بھی زائل ہو گیا اور تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھا۔

اب حکیم نے اس سے اس کا حال دریافت کیا اس نے شروع سے آخر تک سارا ماجرا بیان کر دیا حکیم اور اس کے ساتھیوں کو اس کی سرگزشت معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی۔ سب سے زیادہ تعجب اس امر پر ہوا کہ شیروں، زہریلے سانپوں اور خونخوار درندوں کے اس گھنے جنگل میں رات بھر وہ بیہوش پڑا رہا اور اسے کسی طرح کا گزند تک نہیں پہنچا۔ حکیم اپنی ذہانت اور تفتیش و علاج کی کامیابی پر بے حد مسرور تھا اس جنگلی پھل کے بارے میں بھی اسے ایک نیا تجربہ حاصل کر کے نہایت درجہ خوشی حاصل ہوئی تھی۔ حکیم کے ساتھیوں نے فوراً ایک خاص قسم کے پتے پر نوک قلم سے اس درخت اور اس کے پھل کی تصویر بنائی اور اس کے نیچے لکھ دیا، نشہ آور زہریلا پھل ہے۔

حکیم نے نوجوان کو بتلایا کہ سمندر کی آغوش میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے یہاں سے تین پہر کی مسافر پر مسندر کے کنارے ہمارا شہر آباد ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ کچھ دنوں کے لئے میری مہمانی قبول کرو۔ سپین کی طرف سے سوداگروں کے جہاز آتے رہتے ہیں ایک دو مہینے کے بعد واپس چلے جانا۔ نوجوان نے حکیم کی درخواست قبول کر لی اور اس کے ہمراہ چلنے پر راضی ہو گیا۔

آج ایک عرصے کے بعد انسانوں کی آبادی کے قریب پہنچ کر نوجوان بے حد مسرور تھا نا معلوم خوشی سے چہرہ پھول کی طرح کھلا جا رہا تھا۔ درختوں کے جھاڑ میں ایک خوبصورت عمارت کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے حکیم نے بتایا کہ وہی میرا غریب خانہ ہے باغ میں داخل ہوتے ہی حکیم نے اپنی اکلوتی بیٹی فارینا کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک زہرہ جمال، لالہ رخ سراپا قیامت دوشیزہ سامنے کھڑی تھی۔

حکیم نے کہا .... بیٹی! آج میں اپنے ہمراہ ایک معزز مہمان لے کر آیا ہوں اس کی زندگی کی سرگزشت نہایت ہی حیرت انگیز ہے کئی بار موت کی بھرپور گرفت سے اس نے نجات حاصل کی ہے اپنی قوت ارادی کا بے مثل انسان ہے یہ! یہ نوجوان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ قوت ارادہ کو ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

حکیم کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ ناتمام گفتگو کا سلسلہ پھر سے جوڑا میں تمہاری ذہانت و سلیقہ مندی سے امید رکھتا ہوں کہ اپنے معزز مہمان کی خاطر و مدارات میں کسی طرح کی فروگذاشت نہ ہونے پائے گی۔

فارینا نے پہلی مرتبہ مردانہ حسن کا ایک سحر جلال دیکھا تھا نوجوان پر نظر پڑتے ہی مبہوت ہو کے رہ گئی۔

آفتاب کی آخری کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں سے رخصت ہو رہی تھیں نوجوان نے حکیم سے کہا سورج ڈوبنے کے بعد پھر ہماری عبادت کا وقت شروع ہو جائے گا۔ زحمت نہ ہو تو آپ ہمیں کسی چشمے کا پتہ بتا دیجئے تاکہ ہم آزادی کے ساتھ اپنے طریقہ پر ہاتھ منہ دھو کر اپنے مالک کا فریضہ بندگی ادا کر لیں۔ حکیم نے جواب دیا چشمہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی باغ میں نہایت صاف و شفاف تالاب موجود ہے۔ وہیں پر سنگ مرمر کی

چٹان بھی ایک طرف بچھی ہوئی ہے نوجوان نے تالاب میں پہنچ کر وضو کیا اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ نماز مغرب ادا کی عشاء تک تسبیح و تلاوت میں مشغول رہا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مہمان خانے کی طرف واپس ہوا۔

فارینا کے لئے نوجوان کی ہر چیز نئی اور جاذب نظر تھی جب تک وہ نماز میں مصروف رہا وہ ایک گوشے میں چھپ کر ایک نہایت حیرت سے اس کی نشست و برخاست کا تماشہ دیکھتی رہی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر مہمان خانے میں اس کے آرام کا انتظام کر دیا گیا۔ دو پہر رات ڈھل جانے کے بعد نوجوان خاموشی کے ساتھ اپنے بستر سے اٹھا تالاب میں وضو کیا اور نماز تہجد کی روح پرور عبادت میں مصروف ہو گیا۔ تسبیح و درود اور گریہ و مناجات میں ساری رات کٹ گئی نماز و تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور عشاء کے بعد تک جاری رہا۔ نوجوان کے شب و روز کا یہی معمول تھا کئی دن ہو گئے اسے حکیم کے گھر مہمان ہوئے۔ لیکن وفور حیا سے کبھی اس کی نگاہ اوپر نہیں اٹھی کبھی اس نے فارینا سے مخاطب ہونے کا کوئی موقع نہیں آنے دیا۔

اب رفتہ رفتہ فارینا کا دل بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ آتش شوق میں سلگتے ہوئے وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔

ظالم! آدمی ہے یا پتھر کی چٹان؟ ہزاروں دیوانے میرے جلوہ حسن کی پرستش کے لئے تیار ہیں اور یہ ایک نظر دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ کیا میرے طلسم جمال کا سحر اب بے اثر ہو گیا؟ دلوں کے کشور میں میرے فتنہ شباب کی غارت گری کیا بلا وجہ مشہور ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے! میری عشوہ طرازیوں کی تلوار زنگ آلود نہیں ہوئی ہے میرے ترکش کا تیر آج بھی بے خطا ہے۔ میری حشر بر پا رعنائیوں میں کوئی تغیر واقع نہیں ہے۔ یہی شخص انسانوں کی پرسوز فطرت سے محروم نظر آتا ہے۔

پھر سوچتی ہے ....

"نہیں میرا خیال غلط ہے یہ کوئی بہت اونچے کردار کا آدمی ہے کسی نوجوان لڑکی پر نگاہ اٹھانا شریف انسانوں کا ہرگز شیوہ نہیں ہے۔ لیکن ہوش کے شیطان پر فتح پانے والے نوجوان آج کہاں ہیں؟ ہو سکتا ہے اس کا چہرہ مہرہ انسانوں جیسا ہو لیکن فطرت یقیناً فرشتوں کے تقدس میں ڈھلی ہوئی ہے۔"

چند ہی دنوں کی مدت میں نوجوان کی پارسائی، شرافت و نیک نامی اور زہد و عبادت کا چرچا سارے شہر میں پھیل گیا تھا، اس کے عارض تاباں، شباب رعنا اور درخشاں پیشانی کا سحر بڑے بڑے عشوہ ناز کا غرور توڑ چکا تھا اب حسن کی دنیا اس کی ایک نگہ التفات کے لئے سیماب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ لیکن خود اس کے دل کی لذتوں کا کیف ساری دنیا سے نرالا تھا اسے اسلام عزیز تھا۔ اسلام کی برتری اور نیک نامی عزیز تھی اور بس۔ اس کے قیام کو ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ لیکن جب بھی حکیم کے سامنے وہ چین جانے کی بات چھیڑتا تو ایسا لگتا کہ حکیم کے دل پر کوئی بجلی گر پڑی ہے۔ یکا یک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ماند پڑ جاتا حکیم اسے اپنے گھر کی رونق و برکت سمجھتا تھا۔ نوجوان بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن کا دل توڑ کر وہ چلا جائے۔

ایک دن وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جب مہمان خانے میں واپس ہوا تو سارے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا حکیم شدت اضطراب میں اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔ فارینا پچھاڑی کھا کھا کر زمین پر لوٹ رہی تھی۔ سب سے برا حال اس کی ماں کا تھا وہ صدمہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئی تھی۔ اچانک یہ کیفیت دیکھ کر نوجوان سکتے میں آ گیا۔ حیرت کے عالم میں حکیم کا ہاتھ پکڑ کر ایک کنارے لے گیا اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے نہایت تسلی آمیز لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

آخر اچانک کیا حادثہ پیش آ گیا ہے ازراہ کرم میری حیرت کا ازالہ کیجئے۔ یک بیک یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے مجھے فوراً بتائیے۔ کافی دیر تک نوجوان حیرانی کے عالم میں حکیم نے اپنے اضطراب کی شدت اور بے تحاشا گرنے کی کیفیت پر قابو پایا اور بلبلاتی ہوئی آواز میں رک رک کر ایک نہایت لرزہ خیز، حیرت افزا اور انسانیت سوز واقعہ کی اطلاع دی۔

ہمارا یہ شہر جو عین سمندر کے ساحل پر آباد ہے اب سے پہلے نو بار سمندر کے ہولناک تلاطم میں غرقاب ہو چکا ہے جب جب اس شہر پر تباہی آئی یہاں کے باشندے اپنی املاک و جائیداد چھوڑ کر پیچھے ہٹتے گئے اور اس یقین کی نشاندہی پر دوسری جگہ ایک نیا شہر آباد کیا کہ یہ مقام سمندری طوفان کی زد سے باہر ہے۔ لیکن ہائے افسوس! کہ چند سال کے بعد جب شہر کی آبادی شباب پر پہنچ گئی تو اچانک سمندر کی لہریں قیامت کی طرح سر اٹھائے ہوئے شہر پناہ کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں اور چند گھنٹے نہیں گزرنے پائے کہ سارا شہر سمندر کی بلا خیز موجوں کے نیچے صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا۔ دسویں بار جب جزیرے کی سب سے اونچی سطح پر یہ شہر آباد کیا گیا تو ایک جادوگر سے درخواست کی کہ وہ کوئی بھی ایسی تدبیر عمل میں لائے جس سے شہر کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ جادوگر نے کئی دن کی محنت و گور کے بعد راجہ کو بتایا کہ اس کی ایک ہی تدبیر ممکن ہے اگر اسے عمل میں لانیکا وعدہ کیجئے تو میں بتاؤں۔

راجہ نے دوسرے دن شہر کے تمام لوگوں کو جمع کر کے انہیں ساری تفصیل بتائی اور دریافت کیا کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں جادوگر سے وعدہ کر لوں۔ ہر طرف سے آواز آئی کہ شہر کے مستقبل کا تحفظ ہمارے ہر مافد سے بالاتر ہے۔ ضرور وعدہ کر لیا جائے۔

راجہ کے وعدے کر لینے کے بعد جادوگر نے بتایا کہ سمندر کے اندر چالیس قدم کے فاصلے پر جس طرح بھی ممکن ہو پانی میں ایک مندر بنایا جائے جس کی قد آدم کھڑکیاں پچھم کی طرف کھلتی ہوں اور اس کے دروازے کا رخ پورب کی طرف ہو۔ مندر کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد ہر چھ مہینے پر شہر کی ایک حسین دوشیزہ منتخب کر کے عین چودھویں رات میں مندر کے اندر مقفل کر دی جائے۔ صبح کے وقت اس کی مردہ لاش جس کی "دوشیزگی" زائل ہو چکی ہوگی مندر

سے نکال کر سمندر میں بہادی جائے چونکہ راجہ قوم کی طرف زبان ہار چکا تھا اس لئے دل پر جبر کر کے لوگوں نے جادوگر کی اس تجویز کو قبول کرلیا۔
حکیم نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس واقعہ کو بیس برس سے زائد ہوگئے اس وقت سے آج تک ہر چھ مہینے پر شہر کی ایک حسین دوشیزہ سمندری دیوکی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے راجدھانی میں دوشیزاؤں کے انتخاب کے لئے باضابطہ ایک محکمہ کھول دیا گیا ہے۔سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد محکمے کے دفتر میں شہر کی ہر خوبصورت لڑکی کا نام اندراج ریاست کے قانون کی رو سے نہایت ضروری ہے۔
دستور کے مطابق ہر چھ مہینے پر چاند کی 12 تاریخ کو قرعہ اندازی کے ذریعہ جان اور عصمت کی بھینٹ چڑھانے کے لئے شہر کی دوشیزاؤں میں سے کسی کا انتخاب عمل میں آتا ہے یہاں پہنچ کر اچانک حکیم کے جذبات میں رقت انگیز تلاطم کی کیفیت پیدا ہوگئی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔صبر وشکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔غم کی چوٹ ضبط نہ ہوسکی تو منہ سے چیخ نکل پڑی۔نوجوان نے غمگسار ہمدردیوں کے ساتھ پھر اسے تسلی دی کافی دیر کے بعد جب کچھ افاقہ ہوا تو حکیم سے یہ سوال کیا۔
تمہاری اس پوری داستان میں تمہارے اس سوال کا جواب کہیں نہیں ہے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے اچانک تمہارے یہاں صف ماتم کیوں بچھی ہوئی ہے۔
حکیم نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا وہی بات تو منہ سے نہیں نکل رہی ہے سوچتا ہوں کلیجہ پھٹ جاتا ہے تم جانتے ہو کہ میری جواں سال بیٹی فارینا مجھے کتنی لاڈلی ہے ہمارے چمنستان آرزو کی تنہا وہ ایک مہکتی ہوئی کلی ہے اس کے چہرے کی روشنی سے میرے گھر میں امیدوں کا چراغ جلتا ہے ہائے اب ہم اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکیں گے۔
نوجوان نے حیرت سے پوچھا خدا خیر کرے اچانک اسے کیا ہوگیا ہے۔بڑی مشکل سے ڈوبے ہوئے جذبات میں یہ الفاظ حکیم کے منہ سے نکل سکے کہ آج شام کو محکمے کا افسر یہ اطلاع دے گیا ہے کہ اس مرتبہ قرعہ اندازی میں فارینا کا نام نکل آیا ہے۔کل چودھویں رات کی چاندنی میں ریاست کی پالکی دروازے پر لگ جائے گی اسے دلہن کی طرح بنا سنوار کر تیار رکھا جائے۔
ہائے میری فارینا! یہ الفاظ فضا میں گونجے اور حکیم صدمے کی شدت سے بیتاب ہو کر بے ہوش ہوگیا۔نوجوان نے حکیم کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور کچھ پڑھ کر دم کیا اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں جب کچھ حالت سنبھل گئی تو نوجوان نے اسے اپنے قریب بٹھالیا اور دل کی اتھاہ ہمدردیوں کے ساتھ اس سے یوں مخاطب ہوا۔
میرے محسن تمہارا غم مجھ سے نہیں دیکھا جاتا میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہاری خوشی کا چمن اجڑ جائے یقین رکھو اپنی جان کی بازی لگا کر میں تمہاری مسرتوں کو واپس لانے کی کوشش کروں گا۔صرف میری ایک پیشکش قبول کرلو۔دو ہی چار جملوں میں حکیم کا چہرہ امید کی کرن سے چمک اٹھا۔حیرت ومسرت کی ملی جلی کیفیت میں نوجوان سے دریافت کیا۔
"میں تمہارے حکم کی تعمیل کس طرح کر سکتا ہوں؟"
نوجوان نے جواب میں کہا۔"تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ کل چاندنی رات میں جب پالکی دروازے پر لگ جائے تو اپنی فارینا کے عوض مجھے بٹھا دینا۔"
حکیم نے اپنی آواز کا تیور بدلتے ہوئے کہا۔
"ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا! فارینا کے جنازے پر آنسو بہا کر میں صبر کر سکتا ہوں لیکن اپنی غیرتوں کی لاش پر تابہ زیست مجھے ماتم کرنا ہوگا۔میں کبھی اسے برداشت نہیں کرسکوں گا کہ بیٹی کی زندگی پر اپنے معزز مہمان کو بھینٹ چڑھاؤں۔اپنے دامن پر ایک مقدس مسافر کے خون کا دھبہ میں ہرگز نہیں قبول کروں گا۔"
نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میرے غمگسار میزبان! میں تمہیں اندھے اعتقاد کی تاریکی سے باہر نکالنا چاہتا ہوں۔میرے ہاتھوں میں یقین کی جو تلوار ہے اس کی کاٹ سے تم ابھی واقف نہیں ہو۔اس تلوار سے چشم زدن میں بڑی بڑی باطل قوتوں کا سر میں نے قلم کر کے رکھ دیا ہے۔شاید ابھی تم میری باتوں کا اعتبار نہ کرسکو۔لیکن گرہ باندھ لو کہ صبح کے وقت مندر کا دروازہ کھلتے ہی تمہاری آنکھوں کی پٹی بھی کھل جائے گی پرسوں کا آفتاب تک طلوع نہیں ہوگا جب تک کہ اس جزیرے کی تاریخ کا ایک نیا دور نہ شروع ہوجائے۔"
حکیم نے استعجاب کے ساتھ دریافت کیا۔
"کیا واقعی تم اس مہیب اور خوفناک دیو پر غالب آجاؤ گے جس نے نو مرتبہ ہماری جیتی جاگتی دنیا کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے اور سینکڑوں عفت مآب دوشیزاؤں کا خون پی کر جس کی بہیمانہ قوتوں کا اندازہ ہمارے قیاس سے باہر ہوگیا ہے۔"
نوجوان نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"معزز حکیم! اطمینان رکھو! ایک دردناک مصیبت کے وقت میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میرا لفظ لفظ کی شہادتوں سے بوجھل ہے حق کی توانائی کا تماشا دیکھنے کے لئے کل رات کی سحر کا انتظار کرو۔

نوجوان کی گفتگو سے حکیم کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ رہی امیدوں کے نشے میں سرشار ہو کر اٹھا اور گھر کے صحن میں دو تڑپتی ہوئی جانوں کو یہ مژدہ جاں فزا سنایا۔

ایک خوشگوار امید کے سہارے حکیم اور اس کی بیوی کے غم کا طوفاں تھم گیا۔ لیکن فارینا کی رات انتہائی بے چینی میں گزری نوجوان کے لئے ایک نا معلوم اضطراب کی آگ رہ رہ کر اس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رات بھر وہ کروٹ بدلتی رہی کہ کسی طرح بھی نوجوان کو اپنے ارادے سے باز رکھا جائے۔ لیکن نوجوان کے آہنی عزم کے سامنے اب کسی کی زبان نہیں کھل سکتی تھی۔

آج چودھویں رات تھی لیکن شام ہی سے فضاؤں پر سوگوار اداسیوں کا سایہ مسلط ہو گیا تھا۔ شہر کے ہزاروں نوجوان فرینا کے غم میں تڑپ رہے تھے۔ ہر گلی میں ماتم و فغاں کا ایک شور برپا تھا۔ فارینا کی تنہا زندگی ہزاروں زندگیوں کی امید کا سر رشتہ تھی آج جزیرے کی آبادی کی ایک بے مثال و یکتا پری جمال حسینہ کے وجود سے خالی ہونے والی تھی۔

راجدھانی کی سلامتی کے لئے ایک عظیم قربانی کی تقریب میں شہر کے سارے معززین حکیم کے دروازے پر جمع ہو گئے تھے ہر شخص کی زبان پر حکیم اور اس کے گھر والوں کے لئے تحسین و آفرین اور صبر و تسلی کے کلمات جاری تھے۔

دستور کے مطابق ٹھیک ایک پہر شب گزر جانے کے بعد پھولوں میں بسی ہوئی راج دربار کی پالکی حکیم کے دروازے پر آکر لگ گئی۔ پالکی کی کھڑکیوں پر مخمل کے زرنگار پردے لٹک رہے تھے۔ پیچھے بھینٹ چڑھانے کی رسومات کا سامان لئے ہوئے نیم برہنہ پجاریوں کا ایک دستہ کھڑا تھا۔ کئی مہینہ کی مدت قیام میں آج پہلی مرتبہ نوجوان نے حکیم کے زنان خانے مین قدم رکھا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی وہ اندر کی خالی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا تھا۔ وہیں اس نے مغرب و عشاء کی نماز ادا کی۔ دستور کے مطابق غروب آفتاب کے بعد بھینٹ چڑھنے والی دوشیزہ کی کوٹھری میں کوئی نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ کسی کو چہرہ دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی ماں باپ بھی اسے کے قریب نہیں جا سکتے تھے۔ اب وہ بالکل پرایا مال ہو جاتی تھی۔

پالکی کے ہمراہ راج دربار سے بھینٹ چڑھائی جانے والی دلہن کے لئے مخصوص جوڑے بھی آئی تھے۔ مندر کے ایک پجاری نے جوڑے کا صندوق نوجوان کی کوٹھڑی کے دروازے پر رکھا اور یہ آواز دیتا ہوا چلا گیا۔ "جلوس کی روانگی کا وقت ہو گیا ہے اب جوڑے پہن کر فوراً تیار ہو جاؤ؟ نوجوان نے صندوق کھول کر جوڑا نکالا اور اپنے پہنے ہوئے کپڑوں پر اسے پہن لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مندر کے پجاری آئے اور دروازے پر کھڑے ہو گئے۔

مہنت نے کہا۔ "اب کوٹھڑی سے باہر نکل آؤ۔ پالکی دروازے پر لگ گئی ہے۔"

نوجوان اپنے جسم کو چادر میں لپیٹے، منہ چھپائے، کنواری لڑکیوں کی طرح شرماتے لجاتے، سسکیاں لیتے ہوئے باہر نکلا اور پھول کی طرح آہستہ آہستہ زمین پر قدم رکھتے ہوئے پالکی کے قریب پہنچا۔ مہنت نے آگے بڑھ کر پالکی کا پردہ اٹھایا اور نوجوان اس کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے ہی پالکی اٹھی حکیم کا پیمانہ ضبط ٹوٹ گیا۔ آج ایک پردیسی مہمان کے جذبہ اخلاص اور وفا کا آخری امتحان تھا۔ انجام کے اندیشے سے بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ صبر و تسلی دینے والے احباب پہلے ہی تیار کھڑے تھے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا۔

فارینا گھر میں موجود نہیں تھی۔ سر شام ہی اسے کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ حکیم کی بیوی بھی نوجوان کی فداکاری پر اپنا سر پیٹ رہی تھی۔

پالکی شہر کی شاہراہوں سے گزرتی ہوئی سمندر کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک پہر رات گزر جانے کے باوجود تمام راستوں پر تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ جذبہ عقیدت میں ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ تماشائیوں کا یہ ہجوم سمندر کے ساحل تک پالکی کے ہمراہ چلتا رہا۔ مندر تک لے جانے والے رستے کے سرے پر پہنچ کر پالکی زمین پر رکھ دی گئی اور ہجوم کو الٹے پاؤں رخصت کر دیا گیا۔ مہنت نے پالکی کا پردہ اٹھا کر آواز دی۔

"پالکی سے اتر آؤ۔ یہاں سے مندر تک پیدل چلنا ہوگا۔" سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے منہ چھپائے نوجوان باہر نکلا اور مہنت کے پیچھے پیچھے مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ مندر کی عمارت کے سامنے پہنچ کر مہنت نے دروازہ کھولا اور نوجوان کو اندر داخل کر کے باہر سے مقفل کر دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ منتر پڑھ کر رسومات ادا کئے اور اس کے بعد وہاں سے الٹے پاؤں رخصت ہو گیا۔

دروازہ مقفل ہو جانے کے بعد نوجوان نے زنانہ لباس اتار کر پھینک دیا۔ چاندنی رات میں کھلی کھڑکیوں سے سمندر کی خوفناک لہروں کا طوفان صاف دکھائی پڑتا تھا۔ رات کی تنہائی سناٹے کا عالم اور منٹ منٹ پر بلاخیز موجوں کے تصادم کی آواز دل دہلا دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن نوجوان پر حالات کی دہشت و ہیبت ناکی کا مطلق کوئی اثر نہیں تھا۔ حکیم کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ دیو کے آنے کا وقت رات ڈھل جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

ابھی رات کا صرف ایک پہر گزرا تھا نوجوان نے ہمت و خیال کی بکھری ہوئی طاقتوں کو سمیٹنے اور اعتماد و یقین کے معنوی ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کرنے کے لئے نماز کی نیت باندھ لی۔ حضور قلب اور نشاط بندگی کے ساتھ وہ رات ڈھلنے تک نماز میں مصروف رہا اب دل کی راہ اسے عرش الٰہی اور

گنبد خضریٰ کا فاصلہ اتنا قریب ہوگیا تھا کہ وہ کھلی آنکھوں سے کارساز کی قدرتوں کا تماشا دیکھ رہا تھا اب وہ اکیلا نہیں تھا اس کے جلو میں رحمتوں کے قافلے اتر آئے تھے۔ کفر و طغیان کے چڑھے ہوئے سمندر کا غرور توڑنے کے لئے اسکی آنکھوں میں غیرت حق کا جلال امنڈ رہا تھا اسکے خون کے قطرے قطرے میں یقین کی توانائی جاگ اٹھی تھی۔ جیسے ہی رات کی زلف سیاہ کمر سے نیچے ڈھلک کر آئی اچانک سمندر کی فضا ایک بھیانک ماحول میں تبدیل ہونے لگی نوجوان بھی ایمان و یقین کے بپھرے ہوئے تیور کے ساتھ اٹھا اور سمندر کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوگیا کچھ ہی لمحے کے بعد دور سمندر کی سطح پر پہاڑ کی طرح کوئی بھاری بھرکم سایہ اسے حرکت کرتا ہو نظر آیا جیسے جیسے وہ قریب ہوتا جا رہا تھا نوجوان کے یقین کی تلوار بے نیام ہوتی جا رہی تھی پلک جھپکتے ایک نہایت مہیب اور بھیانک دیو سامنے کھڑا تھا۔ آنکھوں سے چنگاری برس رہی تھی ماتھے پر سینگ کی طرح دو نکیلی برچھیاں کھڑی تھیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک دہشت و خوف کا ایک ہیبت ناک سراپا بڑے سے بڑے جیوٹ کو بھی لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن نوجوان کے دل پر اس ہولناک منظر کا قطعاً کوئی اثر نہیں تھا۔

نگاہیں دو چار ہوتے ہی نوجوان نے باآواز بلند آیت الکرسی شریف کی تلاوت شروع کی قرآن کی جلالت شان سے سمندر کا کلیجہ دہل گیا اور توحید الٰہی کی سطوت جلال سے فضا بوجھل ہوگئی۔ اب نوجوان کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی ایک صف شکن مجاہد کی طرح ہاتھوں میں قہر الٰہی کی تلوار لئے ہوئے وہ دیو کو ہلاک کر دینے پر تل گیا تھا۔ ایمانی جلال کے تیور میں ڈوبے ہوئے ایک ہی نعرہ تکبیر نے عفریت کا کلیجہ شق کر دیا۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک چنگاری اڑی اور سمندر کی فضا دھوئیں سے بھر گئی ایک مرد مومن کی روحانی توانائیوں نے سمندر کے خوفناک دیو کا کام تمام کر دیا تھا جو عفریت سالہا سال سے انسانی آبادیوں کا خون چوس رہا تھا آج ایمان کی مخفی طاقتوں کے آگے اس کی خدائی کا سارا طلسم ٹوٹ کے رہ گیا۔

فضا صاف ہوئی جوان نے دیکھا کہ بہت دور ایک سیاہ دھبہ سمندر میں تحلیل ہو رہا تھا۔ بے ساختہ نوجوان کی پیشانی سجدہ شکر کے لئے جھک گئی اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ قرآن کے وعدوں پر اس کے یقین کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی اس کی دانست مین ایک بندہ مومن کا یہ سب سے قیمتی سرمایہ تھا جو محفوظ رہا حجاز کی سرزمین پر کائنات کی راجدھانی میں اس نے سر شام ہی ایک پیغام بھیجا تھا اپنے آقا کی چارہ گری پر وہ فخر و ناز سے مچل مچل اٹھتا تھا کہ اس کی فریاد رائیگاں نہیں ہوئی مدینے کے آسمان سے عین اس وقت رحمتوں کا قافلہ ترہوتا جا رہا تھا۔ سرور و کیف کی ایک رقت انگیز کیفیت میں صبح تک اس کی آنکھوں کا سیلاب نہیں پیشانی میں سجدے مچلتے رہے اور ایمان و یقین کے چراغوں کی لو تیز ہوتی رہی۔

ذہن کی خاموش سطح پر بار بار یہ تصور ابھر رہا تھا کہ نکھرے ہوئے ایمان میں کائنات کی کیسی کیسی طاقتیں جذب ہوگئی ہیں دل کا یقین اگر سلامت ہے اور روح کا رشتہ غیبی حقیقتوں سے مربوط ہے تو تنہا ایک مرد مومن ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ معنوی قوتوں پر ایمان لانے کے لئے اب اسے کسی دلیل کی حاجت نہیں تھی۔ کھلی آنکھوں سے اس نے آسمانوں کے دروازے کھلتے ہوئے دیکھے تھے اور گنبد خضریٰ میں فریادوں کے باریاب ہونے کی آواز اس نے ماتھے کے کانوں سے خود سنی تھی۔ اب وہ اپنے ماتھے کی آنکھ سے حقیقتوں کا تماشائی تھا۔ وہ انہیں تصورات کی لذتوں میں گم تھا کہ ملاحوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اب سحر ہو چکی تھی نماز فجر کے لئے اٹھ کھڑے ہوا۔

شہر والوں کے لئے اس طرح کی چودھویں راتیں اجنبی تھیں سینکڑوں بار گزر چکی تھی شہر کی تاریخ میں نوجوان دوشیزاؤں کی لاشوں کا انبار لگ چکا تھا۔ اب اس طرح کی راتوں میں سوائے گھر والوں کے کسی کے یہاں بھی کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہو کیا جاتا تھا۔ آج بھی ساری رات حکیم کے گھر پر ایک کہرام برپا کسی کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی سب سے زیادہ بے چین فارینا تھی اسے رہ رہ کر نوجوان کا خیال ستا رہا تھا رات ڈھل جانے کے بعد اس کا اضطراب ناقابل برداشت ہوگیا تھا کیونکہ سمندری دیو کے آنے کا یہی وقت تھا وہ بار بار سوچتی تھی کہ نوجوان پر کیا گزری ہوگی۔ صبح کا اجالا جب ہر طرف پھیل گیا اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تو راجہ کے کارندے حکیم کے گھر پر آموجود ہوئے کیونکہ دستور یہ تھا کہ لڑکی کا باپ ہی صبح کے وقت مندر کا دروازہ کھولتا تھا اور وہی اس کی بے جان لاش کو مندر کے باہر پجاریوں کے حوالہ کرتا تھا تا کہ وہ اس کی آخری رسومات ادا کریں سوائے حکیم کے باپ کو راجہ کے کارندے ایک جلوس کے ساتھ مندر کی طرف لے کر چلے۔ مندر کی حدود سے باہر ہزاروں تماشائیوں کا ہجوم شہر کی سب سے حسین دوشیزہ کی لاش دیکھنے کے لئے ٹھٹ باندھے کھڑا تھا۔

مندر کے دروازے تک پہنچ کر پجاری رک گئے۔ حکیم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مندر کا قفل کھولا۔ اب دروازہ کھولتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں نوجوان کا کیا انجام ہے۔ ہمت کر کے جونہی دروازہ کھولا تو یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ نوجوان سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پجاری ایک غیر متوقع صورت دیکھ کر دہشت و حیرت سے چیخ پڑے بجلی کی طرح یہ خبر تماشائیوں تک پہنچ گئی۔ سارے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا راجہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ اپنے مصاحبین کے ساتھ دوڑا ہوا مندر کے دروازے پر پہنچا۔ ابھی تک نوجوان مندر کے اندر ہی کھڑا تھا۔ راجہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور رعب و دہشت سے آنکھیں بند کر لیں۔ نوجوان نے باہر نکل کر راجہ کو تسلی دی کہ دہشت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں وہی نوجوان ہوں جو کئی مہینے سے حکیم کے مکان پر مقیم ہوں۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ برسہا برس سے ایک سمندری دیو آپ کے شہر کو غارت کر رہا ہے اور اس کے قہر و ظلم سے بچنے کے لئے آپ کی حکومت ہر چار مہینے پر شہر کی ایک نوجوان دوشیزہ کو اس کی بھینٹ چڑھاتی ہے تو میں اس لرزہ خیز واقعہ سے تڑپ اٹھا۔

میرے پاس ایک ایسی طاقت ہے کہ اس کے ذریعہ میں بڑے سے بڑے دیو پر فتح پاسکتا ہوں اس لئے میں نے اپنے معزز میزبان سے درخواست کی کہ وہ فارینا کے بدلے مجھے دلہن بنا کر پالکی میں سوار کردے تا کہ میں سمندری دیو کے قہر وستم سے اس شہر کی کنواری لڑکیوں کو نجات دلا سکوں۔ کافی اصرار کے بعد حکیم اس سنگین اقدام کے لئے تیار ہوا اور گذشتہ شب فارینہ کے بجائے مجھے اس مندر میں مقفل کر دیا گیا۔ یہاں تک پہنچ کر وہ خاموش ہوا ہی تھا کہ راجہ نے مضطربانہ انداز میں سوال کیا۔ گذشتہ سب میں دیو کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

نوجوان نے نہایت شان استغنا کے ساتھ جواب دیا۔

"وہی ماجرا پیش آیا جس کی توقع تھی رات ڈھل جانے کے بعد وہ اپنے معمول کے مطابق آیا اور مندر کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں ایمان ویقین کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا وہ جیسے سامنے آیا میں نے اپنا عمل شروع کیا اور چند ہی منٹ میں اس کی قوتوں کا سارا طلسم ٹوٹ کے رہ گیا جلال حق کی ایک چنگاری نے اس کے دھوئیں اڑا دیئے۔ راجہ نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ اس کی ہیبت ناک شکل کا سامنا کرتے ہوئے کیا تم پر خوف نہیں طاری ہوا۔

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا ایک بندہ مومن کو سوائے خدا کے کسی سے خوف نہیں ہوتا۔ اب سارا شہر اس نوجوان کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ فارینا بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی نوجوان کی فتح و کامرانی سے اس کی زندگی میں امیدوں کی ایک نئی سحر طلوع ہو گئی تھی وہ نہایت بے چینی کے ساتھ اس موقع کا انتظار کر رہی تھی جبکہ نوجوان کے اخلاص وہمدردی کا شکریہ ادا کرے۔

راجہ نوجوان کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے جیسے ہی مندر سے باہر نکلا۔ تماشائیوں کے ہجوم نے نوجوان کو فرط عقیدت سے سر پر اٹھالیا۔ راجہ محل تک ساری رہ گزر پر مشتاقان دید دورویہ کھڑے تھے نوجوان جن جن راستوں سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس واقعہ سے لوگوں کے دلوں میں نوجوان کی عظمت و برتری کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔

راجہ نے نوجوان کے اعزاز میں شہر کے سارے معززین کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ سمندر دیو کے قہر وستم سے نجات کے سلسلے میں یہ شہر کا پہلا اجتماع تھا۔ جو نوجوان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے راجہ نے کھڑے ہو کر ان لفظوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

معزز شہریو! آج صدیوں کے بعد وہ دن میسر آیا کہ ہم نے ایک بہت بڑے خوفناک دشمن پر فتح پائی ہے اور اس عظیم الشان فتح کا سہرا اس نوجوان کے سر ہے جو چند مہینوں سے ہمارے شہر میں مقیم ہے۔ جس دیو کو ہم موت وحیات کا مالک سمجھے ہوئے تھے آج نوجوان نے اس کے فریب کا طلسم توڑ دیا ہے۔ نوجوان نے جس طاقت کے بل پر اس موذی دشمن کا قلع قمع کیا ہے دراصل اسی طاقت کے آگے ہمیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے۔ وہی دین سچا اور غالب ہے جس کے فیضان نے نوجوان کو ایک عجیب وغریب ہستی کا مالک بنا دیا ہے۔ کیوں نہ اس نعمت کے شکرانے میں ہم سب کے سب اسی دین کو قبول کرلیں۔

شہر کے ایک ذی اثر شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔

"اس احسان کے بدلے میں نوجوان کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن جہاں تک نوجوان کے دین قبول کرنے کا سوال ہے اس سلسلے میں میری حقیر رائے یہ ہے کہ ابھی عجلت سے کام نہ لیا جائے۔ بھینٹ چڑھانے کی اب جو تاریخ آرہی ہے اس میں ایک بار اور آزمائش کرلی جائے۔ اگر سمندری دیو نہیں آیا تو ہم نوجوان کی روحانی طاقت اور اس کے دین کی برتری بے چون وچرا تسلیم کرلیں گے۔"

راجہ کے ساتھ سارے مجمع نے اس رائے کی تاکید کی۔ اسی ضمن میں ایک دانشور نے کھڑے ہو کر اس رائے میں اتنا اور اضافہ کر دیا جائے کہ اس بار دستور کے مطابق شہر کی نوجوان دوشیزہ بھی مندر اندر مقفل کی جائے تا کہ نوجوان کی روحانی توانائی کا پورے طور پر امتحان ہو جائے۔

نوجوان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ہمارا مقدس دین کسی بھی اجنبی مرد اور عورت کو تنہائی میں جمع ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اس میں اتنی ترمیم ضروری کر دی جائے کہ نوجوان دوشیزہ مندر کے اندر مقفل رہے گی اور میں باہر پہرا دوں گا۔ لوگوں نے بیک زبان کہا کہ یہ صورت تو اور بھی ہمارے لئے اطمینان بخش ہے۔

آج پھر وہی چودھویں رات تھی۔ پھر بھینٹ چڑھانے کے لئے شہر کی ایک دوشیزہ منتخب کی گئی اور دستور کے مطابق ایک پہر رات ڈھل جانے کے بعد اسے مندر میں مقفل کر دیا گیا۔ آج کی رات اس لحاظ سے نہایت اہم رات تھی کہ اس کی صبح کو کئی ہزار انسانوں پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا تھا آج بھی نوجوان کا سینہ گریہ ومناجات کے سوز وگداز سے معمور ہو گیا تھا۔ آج نوجوان کی صرف روحانی توانائی کا نہیں اس کے پیارے دین کا بھی امتحان تھا۔ آدھی رات ڈھل جانے کے بعد پھر وہی درد وکرب میں ڈوبی ہوئی فریادیں، پھر وہی آیات الٰہی کی حق افروز تلاوتیں شروع ہو گئیں آج نوجوان پر ایسی رقت انگیز کیفیت طاری تھی کہ بار بار رحمت خداوندی اس کا منہ چوم رہی تھی رات ڈھلتی رہی اور نوجوان کی اشکبار آنکھوں کا تلاطم دم بدم بڑھتا رہا۔ آدھے سے زیادہ حصہ رات کا گزر چکا تھا لیکن دیو کی آمد کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اسی عالم شوق میں ستارے ڈوبنے لگے اور سمت مشرق سے سحر کی سپیدی نمودار ہوئی۔ جیسے ہی ملاحوں کی آواز کان میں گونجی نوجوان عالم بیخودی سے چونک اٹھا دیکھا تو سمندر کی شفاف موجوں پر

سحر کا اجالا چمک رہا تھا۔ اذان دے کر نماز فجر ادا کی اور پروردگار عالم کے حضور میں سجدہ شکر کے لئے گر پڑا آج اس نے اپنے دین کا سر اونچا کر دیا تھا۔

آج سارا شہر انتظار کی بے چینیوں میں رات بھر جاگتا رہا جیسے سورج کی ٹکیہ چمکی، ہزاروں پروانوں کا ہجوم مندر کی طرف دوڑ پڑا۔

راجہ بھی اپنے عملے کے ساتھ مندر کے لئے روانہ ہوا۔ سمندر کے ساحل پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر نوجوان پر پڑی جو ہاتھ پھیلائے دعا مانگ رہا تھا نوجوان کو سلامت دیکھ کر راجہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی راجہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مصاحبین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ نوجوان دوشیزہ کا حال دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ نہایت بیتابی کے عالم میں راجہ نے حکم دیا کہ پچھلے دستور کو بالائے طاق رکھ کر آج مندر کا دروازہ کوئی بھی کھولے۔

کئی ہزار تماشائیوں کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے ہوئے مندر کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں جونہی دروازہ کھلا شہر کی دوشیزہ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی منظر دیکھ کر سارا مجمع فرط مسرت میں بے قابو ہوگیا۔ نوجوان کو اپنی آنکھوں میں بٹھا لینے کے لئے پروانوں کا اضطراب نا قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے راجہ نے عقیدت وشوق کے امنڈتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی اور نوجوان کی پابوسی کے لئے مجمع سے چند لمحے کی مہلت طلب کی جب مجمع کچھ سکون پذیر ہوا تو راجہ نے لڑکی سے رات کی سرگزشت دریافت کی۔

لڑکی نے جواب دیا۔ رات کی عجیب وغریب سرگزشت سننا چاہتے ہیں تو اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ شہر کے سارے مرد وعورت، بچے اور بوڑھے کسی میدان میں جمع کیجیے، راجہ نے لڑکی کی اس شرط کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد نوجوان اور لڑکی کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے مندر سے روانہ ہوا۔

راجہ کے کارندے ہر طرف اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ شہر کے تمام لوگ فلاں میدان میں جمع ہو جائیں۔ ہزاروں ہزار افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آن کی آن میں مقرر کردہ میدان میں اکٹھا ہوگیا۔ عین شدت انتظار کے عالم میں راجہ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ مندر میں رات گزارنے والی لڑکی رات کی سرگزشت سنانا چاہتی ہے۔ آپ حضرات غور سے سنیں۔ لڑکی نے نہایت دلیری کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔

"میرے بزرگو! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس خوشنما منظر کی تصویر کھینچ سکوں جو رات میری نگاہ سے گزر چکے ہیں۔ میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آسمان سے روشن چراغوں کی قطار اتری اور نوجوان کے سینے میں جذب ہوگئی۔ کئی بار فضاؤں میں نور کے بادل منڈلائے ہوئے دیکھے اور نوجوان پر برس کر چلے گئے۔ یہ نوجوان اس دنیا کا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔ رات ڈھل جانے کے بعد دیو کے خطرے میں میرا خون سوکھتا جا رہا تھا۔"

لیکن نوجوان کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات کی برکت سے دور دور تک اس موذی دیو کی کہیں پرچھائیں بھی نظر نہیں آئی۔ بلا شبہ وہ کلام دل کی گہرائی میں اتار لینے کے قابل ہے یہ اعلان کرنے کے لئے میری روح بے چین ہے کہ میں نے نوجوان کا وہ دین قبول کر لیا ہے۔ جس کی برکتوں کی پہلی بارش سمندر کے ساحل پر ہوئی ہے لڑکی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ راجہ نے جذبات کے تلاطم میں شرابور ہو کر اعلان کیا۔

"میں اس نوجوان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے ہمیں اور ہماری ساری رعایا کو اپنے سچے دین میں داخل کر لے۔"

آج کلمہ توحید کی سربلندی کا دن تھا اسلام کی فتح کے اعتراف میں گردنیں خود بخود جھکی جاری تھیں۔ نوجوان نصرت الٰہی کی بارش میں اس درجہ شرابور تھا کہ بمشکل تمام اس نے کئی ہزار انسانوں سے کلمہ توحید ورسالت کا اقرار لیا۔ دولت ایمان سے ساری آبادی کو مالا مال کر چکنے کے بعد اس نے راجہ کے ہاتھ سے اسی میدان میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھوائی۔

وہ نظارہ چشم فلک کے لئے بڑا ہی کیف آور تھا جبکہ اسی میدان میں نماز کے لئے پہلی بار ہزاروں فرزندان توحید کی قطار کھڑی تھی اور نوجوان کی اقتدا میں بیک وقت سارا شہر خدائے قدوس کے آگے سجدہ ریز تھا۔

شام کو جب نوجوان حکیم کے گھر گیا تو فارینا نیچی نگاہ کئے سامنے آئی اور نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ نوجوان نے فارینا کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی بیٹیوں کو کسی نامحرم کے سامنے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جہاں تک دیو کے چنگل سے تمہاری نجات کا سوال ہے اس کے لئے میں شکریہ کا طلبگار نہیں ہوں وہ میرے ایمان واسلام کا ایک خاموش فرض تھا جسے میں نے انجام دیا اس کے پیچھے انسانی ہمدردی کا اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ اس کے بعد چند مہینے اس جزیرے میں قیام کر کے نوجوان نے بہت سارے افراد کو قرآن کی تعلیم دی اور انہیں دین کی تفصیلات سے آگاہ کیا وہ دن اس شہر والوں کے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ جس دن چین کا ایک تجارتی جہاز ساحل پر لنگر انداز ہوا اور سارے شہر نے برستی ہوئی آنکھوں سے نوجوان کو رخصت

لمحۂ آتشیں

کہتے ہیں کہ ایک دن شہنشاہ ہندوستان حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے دیوان عام میں جلوہ گستر تھے کہ نقیب نے آکر اطلاع دی۔
جہاں پناہ! ایک فریادی محل کے دروازے پر کھڑا ہے۔ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ حکم ہوا باریاب کرو۔
چند لمحے بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دربار میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دور دور سے آئے ہوئے فریادیوں کے مقدمات کی سماعت سے فارغ ہو چکنے کے بعد اب شہنشاہ اس اجنبی شخص کی طرف مخاطب ہوئے۔
"دربار شاہی میں کیا فریاد لائے ہو!
جہاں پناہ! میں ایک بہروپیا ہوں۔ صرف اس تمنا سے گجرات سے حاضر ہوا ہوں کہ شہنشاہ ہند کے دربار سے اپنے فن کا کوئی اعزاز حاصل کروں اس دربار میں اہل کمال کی قدر دانی کا بڑا شہرا سنا ہے۔
اورنگ زیب نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا۔ تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ لیکن کمال کی قدر دانی ہمیشہ سے شاہی درباروں کا شیوہ رہا ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں کہ اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ ایک بہروپیا کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے وجود کو اصلیت کے سانچے میں اس طرح ڈھالے کہ نقل کا پہچاننا مشکل ہو جائے۔ تم نے اگر مجھے دھوکا دے دیا تو میں یقین کرلوں گا کہ تم اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے ہو۔ اسی دن ایک قدر دان کی طرح میں تمہارے کمال فن کی داد دوں گا۔
شہنشاہ کا یہ جواب سن کر خوشی خوشی بہروپیا دربار سے رخصت ہوا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر کئی دن سوچتا رہا کہ کونسا روپ اختیار کیا جائے کہ بادشاہ کو بھرپور دھوکا دیا جا سکے۔
ایک مہم سے واپس ہوتے ہوئے شہنشاہ راستے میں بیمار پڑ گئے۔ دہلی کی راجدھانی میں ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف عبادت خانوں اور درگاہوں میں دعائے صحت مانگی جانے لگی۔ شاہی بیگمات نے نفلی روزوں کی منت مان لی۔ گلی گلی میں محتاجوں اور مسکینوں کو خیرات لٹائی گئی۔
علاج کے لئے ملک کے کونے کونے سے ماہر طبیبوں کا تانتا بندھ گیا۔ چند ہی دنوں میں شہنشاہ وبصحت ہونے لگے۔ غسل صحت کے دن ساری راجدھانی خوشی کے شادیانوں میں ڈوب گئی۔ بیماری سے صحت یابی کے بعد آج پہلی مرتبہ شہنشاہ دربار عام میں تشریف لانے والے تھے۔ مشتاقان دید سے دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے ہوئے ہر شخص بادشاہ کی آمد کا منتظر تھا کہ اتنے میں نقیبوں نے آواز دی۔ سارا دربار سروقد کھڑا ہو گیا۔ مبارکباد اور ایام اقبال کی دعاؤں کی گونج میں شہنشاہ تخت آبنوس پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسی درمیان میں ایک چوبدار نے آکر خبر دی۔
"جہاں پناہ کی علالت مزاج کی خبر ایران تک پہنچ گئی ہے۔ علاج کے لئے شاہ ایران نے اپنا خصوصی طبیب دربار عالی میں حاضر کیا ہے۔ وہ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔
شہنشاہ نے اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے باریاب ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ سارے درباری ایران کے شاہی طبیب کو دیکھنے کے لئے متوجہ ہو گئے۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد حکمائے یونان کی دستار و عبا میں ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا۔ اس کی پیشانی سے حکمت و دانائی کی ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کے پیچھے غلاموں کی ایک لمبی قطار ایران کے جذبہ ہمدردی کی ستائش سے گونج اٹھا۔
شہنشاہ تھوڑی دیر تک نظر جمائے ہوئے آنے والے کو دیکھتے رہے۔ ایران کا طبیب جیسے ہی پابوسی کے لئے آگے بڑھا۔ شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھیں پہچان لیا"۔
یہ جواب سنتے ہی مارے شرم کے بہروپیا پانی پانی ہو گیا۔ اسے اپنے فن کی ناکامی پر اتنا قلق ہوا کہ الٹے پاؤں وہ دربار سے واپس لوٹ گیا۔ ایک عرصہ دراز تک وہ اپنی شکست کے غم سے نڈھال رہا۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو جوڑ کر کھڑا کیا۔
آج رمضان المبارک کی 29 تاریخ تھی۔ غروب آفتاب کے بعد دور افق مغرب پر ہلال عید کے تمنائیوں کی نگاہیں جم گئیں۔ چند ہی لمحے بعد شور اٹھا۔ عید کا چاند نظر آ گیا۔
قلعہ معلیٰ سے توپیں سر ہوئیں اور سارا شہر مسرت و نشاط کی بارشوں میں نہا گیا۔ ہر طرف عید کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ عزت و وقار کی کھلی ہوئی فضا عید کی حقیقی خوشی ہر گھر سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ رات گئے تک علماء مشائخ کی بارگاہوں سے شکر خداوندی کی تہنیتیں بلند ہوتی رہیں اور عاشقان الٰہی تسبیح و تہلیل کے انوار میں نہاتے رہے۔
آج ساری رات کے لئے قلعہ معلیٰ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مملکت کے سارے مساکین امڈتے ہوئے سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ اعلان عام تھا

کہ عید کے دن شاہراہوں پر کوئی بھوکا، ننگا اور مفلوک الحال نظر نہ آئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے اہل حوائج کی حاجتیں پوری کر دی جائیں۔

راجدھانی میں جشن مسرت کا یہ سماں ساری رات قائم رہا۔ صبح ہوئی تو ایک نئی فصل بہار کی مسکراہٹیں ہر طرف بکھر گئیں تھیں۔ ساری فضا رنگ و نور میں شرابور تھی، نورس کلیوں، شگفتہ پھولوں اور مہکتے ہوئے غنچوں کے رنگ برنگ جلوؤں سے سارا شہر گلستان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسلامی اقتدار کا لہراتا ہوا پرچم آج آسمان کی رفعتوں کو آواز دے رہا تھا۔ یہی عالم جاں نواز تھا کہ قلعہ معلٰی سے نماز عید کے لئے پہلی توپ سر دہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہراہوں پر فرزند توحید کی قطاریں لہراتی ہوئی موجود کی طرح امنڈنے لگیں۔

دوسری توپ کے سرد ہوتے ہی قلعہ معلٰی سے شاہی جلوس جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج امیر کشور ہند کی پیشانی پر عجز و نیاز بندگی کی خاک چمک رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر لوگوں کے قلوب ہل گئے۔ کتنی آنکھیں خشیت الٰہی کے تاثر سے آبدیدہ ہو گئیں۔ انہی رقت انگیز جذبات عبودیت کے سائے میں عید کی دوگانہ نماز ختم ہوئی۔

خطبہ و معانقہ سے فارغ ہو کر مسرتوں کے پھول بکھیرتے ہوئے فرزندان اسلام کا یہ امنڈتا ہوا ہجوم اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گیا۔

قلعہ معلٰی کی ایک پرانی رسم تھی کہ نماز عید کے بعد والیان ریاست اور روسائے مملکت کی طرف سے شہنشاہ کے حضور میں نذر گزاری جاتی تھی۔ اب اس کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ قیمتی تحائف اور بیش بہا جواہرات کے تھال لئے ہوئے نوابوں راجاؤں اور جاگیرداروں کی منڈیاں قلعہ معلٰی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ صدر دروازہ سے لے کر دیوان عام تک محل کا سارا حصہ دلہن بنا ہوا تھا۔

نقیبوں کی صداؤں کی گونج میں شہنشاہ دیوان عام میں تشریف لائے۔ تخت آبنوس پر جلوہ گستر ہوتے ہی سلامی اور عید کی مبارکباد کا شور بلند ہوا۔

والیاں ریاست اور روسائے مملکت اپنی اپنی کرسیوں پر ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باری باری ایک ایک کر کے سب نے شہنشاہ کے حضور اپنی اپنی نذر پیش کی اخیر میں ترکستان کا ایک جوہری اٹھا اور اس نے شہنشاہ کے حضور میں ایک چھوٹا سا صندوق پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس میں بدخشاں کا وہ لعل شب چراغ ہے جو ایک ہزار سال تک مریخ کی خنک چاندنی پر پرورش پاتا رہا۔ تب جا کر آج اسے پائیگاہ عالی تک پہنچنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ کوکبہ اقبال کی تابندگی سلامت رہے۔ بزم فلک کا یہ پروردہ نگینہ اس وقت روئے زمین پر ایسا ہی منفرد اور لاشریک ہے۔ جیسے جہاں پناہ کی سطوت شاہانہ!

شبہائے تار کی روشنی دیدہ عقل کا چراغ، چمنستان آرزو کا لالہ بہت سارے ناموں سے ترکسان کے جواہریوں نے موسوم کیا ہے۔

فرمانروائے ہند کے حضور میں یہ تحفہ نایاب پیش کرتے ہوئے آج میرے مسرت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

یہ کہتے ہوئے صندوق کو پائیگاہ شاہی میں رکھ کر جیسے ہی واپس لوٹنا چاہا تھا کہ شہنشاہ عالم اورنگ زیب نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا۔ اس بار بھی ہم نے تمہیں پہچان لیا۔

یہ الفاظ تیر کی طرح اس کے دل میں ترازو ہو گئے۔ عالم اضطراب میں بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو سنبھال سکا۔ اس بار کی چوٹ اتنی گہری تھی کہ بہت دنوں تک اس کے دل کا زخم رستا رہا۔ ہزار شکست و ریخت کے بعد بھی اس بار اس نے اپنا حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کے فن کی غیرت جاگ اٹھی اور آخری بار وہ اپنی قسمت آزمانے کے لئے کھڑا ہوا۔

کچھ ہی عرصہ بعد دکن کئے علاقے سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہاں بہت سے راجاؤں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اور وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

مقتضائے وقت کے مطابق آتش بغاوت فرد کرنے اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے بذات خود دکن کی مہم پر روانگی کا ارادہ فرمالیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد ایک معین تاریخ پر شہنشاہ کی روانگی طے پا گئی۔

آج صبح سویرے حضرت اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ ایک لشکر جرار اپنے جلوس میں لئے روانہ ہو گئے۔ جن جن گزرگاہوں پر سے شہنشاہ اورنگ زیب گزرتے تھے۔ سارے علاقے میں دھوم مچ جاتی تھی۔ سفر کا روٹ آبادیوں سے شہروں سے ہٹ کر زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلوں کو عبور کرتے ہوئے بنایا گیا تھا۔

صبح و شام موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ مہم نہایت سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ باغیوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے آپس میں متحد ہوتے جا رہے تھے۔ اس طرح دکن میں ایک باغیانہ قوت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے اس سفر میں ہر دوسرے تیسرے پڑاؤ پر نئی کمک فوج میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔

حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ طبعاً بزرگان دین اور اولیائے مقربین کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اس لئے دستور یہ تھا کہ راستے میں جہاں جہاں بھی کسی بزرگ کا مزار ملتا قافلہ روک کر مزار پر حاضری دیتے۔ فاتحہ پڑھ کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے اور روانہ ہو جاتے۔

دوران سفر ایک پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے ایک جگہ سے گزرے تو دیکھا کہ کئی ہزار انسانوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ خیموں اور پھونس کے جھونپڑوں کی

ایک بستی بس گئی ہے۔ کہسار کے ویرانوں میں آدمیوں کا یہ میلہ دیکھ کر شہنشاہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی پہاڑ کی کھوہ میں ایک خدار سیدہ بزرگ ہیں جن کی زیارت اور حصول فیض و برکت کے لئے مہینوں سے یہاں میلا لگا ہوا ہے۔ سینکڑوں بندگان خدا یہاں سے فیضیاب ہو کر واپس لوٹے ہیں۔

لوگوں نے بتایا کہ ان کی عجیب شان ہے۔ نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں۔ سدا آنکھیں بند کئے ہوئے۔ یاد الٰہی میں محو رہتے ہیں۔ ان کے قریب پہنچ کر دل کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ان کے نور چہرے پر نظر ڈالنے کی تاب بڑی مشکل سے کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔

یہ حالات سن کر اورنگ زیب کے دل میں بھی ان کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میر لشکر کو حکم دیا کہ یہاں پڑاؤ ڈال دیا جائے۔ دم کے دم میں پہاڑ کا طویل و عریض دامن ایک شہر میں تبدیل ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی اس لئے طے پایا کہ صبح کے اجالے میں درویش کی زیارت کے لئے شہنشاہ تشریف لے جائیں گے۔

صبح ہوتے ہی پہاڑ کی کھوہ تک ساری گزرگاہ کو سپاہیوں نے ہموار کر دیا۔ خدار سیدہ بزرگ کی زیارت کی نیت سے شہنشاہ نے غسل کیا۔ نئے کپڑے زیب تن فرمائے دو رکعت نماز نفل ادا کی اور برہنہ پا چل کھڑے ہوئے۔ عقیدت کا اہتمام شوق دیکھ کر لوگوں نے بادشاہ کی نیک طینی اور درویش نوازی کا اعتراف کر لیا۔ غار کے دھانے پر پہنچ کر شہنشاہ رک گئے۔ خادم نے بتایا کہ ابھی حضرت عالم استغراق میں ہیں۔ تھوڑی دیر توقف کیا جائے۔ شہنشاہ مجسمہ عقیدت بنے ہوئے انتظار شوق میں کھڑے رہے۔ کچھ وقفے کے بعد خادم نے آکر اطلاع دی کہ اب اندر تشریف لے چلئے۔ اندر کے حصہ میں چونکہ رات کی طرح اندھیرا تھا۔ اس لئے جگہ جگہ کافوری مشعل روشن کر دی گئی تھی۔ تاکہ شہنشاہ کو وہاں پہنچنے میں زحمت نہ ہو۔

خدار سیدہ بزرگ کے قریب پہنچ کر بادشاہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ فرش زمین پر ادب سے دو زانو بیٹھ گئے۔ دیر تک ان کے روحانی فیوض و برکات کے امیدوار بن کر خاموش بیٹھے رہے۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بادشاہ نے اپنی مہم کی کامیابی کے لئے دعا کی درخواست کی۔ لیکن درویش نے بادشاہ کی عرضداشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ بدستور اپنے عالم محویت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے استغنا کی یہ شان دیکھ کر بادشاہ اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

کافی دیر گزر چکی تھی۔ اسی لئے بادشاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ خادم باہر نکل چکا تھا اب مکمل تنہائی کا عالم تھا۔ بادشاہ نے دم رخصت درویش کی خدمت میں اشرفیوں کا ایک توڑا بطور نذرانہ پیش کیا اور اٹھتے ہوئے جیسے ہی وہ دست بوسی کے لئے جھکا! بہروپیا نے دونوں ہاتھوں سے بادشاہ کے قدم تھام لئے۔

بس ہو گیا جہاں پناہ! میرے فن کا یہ آخری سٹیج تھا۔ میں درویش نہیں ہوں وہی بہروپیا ہوں۔ جسے دو بار آپ نے شکست دی ہے۔ اتنی بڑی گستاخی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی کہ آپ میرے ہاتھ کا بوسہ لیں۔

یہ جواب سن کر بادشاہ پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ عالم تحیر میں دیر تک وہ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد حیرت کا طلسم ٹوٹا تو ارشاد فرمایا۔

"آج میں نے تسلیم کر لیا کہ تم اپنے فن میں کمال ہو۔ اب اس خوشی میں کہ تم نے میرے اوپر فتح حاصل کر لی ہے اشرفیوں کی یہ تھیلی قبول کر لو۔ تمہارے فن کا صحیح حق اس وقت ادا کروں گا۔ جبکہ قلعہ معلی دہلی میں تم مجھ سے ملاقات کرو گے دکن کی مہم سے فارغ ہو کر جب میں دارالخلافہ لوٹوں گا تو تمہارا نہایت شدت سے انتظار کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے جیسے ہی بادشاہ نے قدم آگے بڑھایا۔ بہروپیا نے دامن تھام لیا۔

جہاں پناہ! اشرفیوں کی یہ تھیلی لے کر اب میں کیا کروں گا۔ اب تو دل کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ آج تک حقیقت کے جس چہرے پر بے شمار پردے پڑے ہوئے تھے۔ اب بھی کھلی آنکھوں سے اسے بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ فقیر و درویش کی نقل میں جب ہی تاثر ہے کہ کشور ہند کے شہنشاہ کی معزز پیشانی میرے آگے جھک گئی تو اصل کی طرف اگر میں رخ کر لوں گا تو کسی اور اعزاز کی ہمیں ضرورت کیا ہے؟

یہ کہتے ہوئے ایک چیخ ماری اور جیب و گریباں کی دھجیاں اڑاتا ہوا چشم زدن میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ بادشاہ پر پھر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس رقت انگیز واقعہ کے تاثر سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ غار کی تنہائی میں دیر تک سوچتے رہے۔

خدا کی شان بھی کیسی بندہ نواز بے نیاز ہے۔ کوئی عمر بھر جھک مارتا ہے تو دروازہ نہیں کھلتا اور کسی کے لئے ایک ہی لمحہ آتشیں زندگی بھی کی غفلتوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

پھر بادشاہ کی توجہ تصویر کے دوسرے رخ کی طرف مبذول ہوئی۔

آہ! خدا شناسی اور فقیر درویشی کے نقالوں نے دنیا میں کیسے کیسے لوٹا ہو گا۔ کون جانتا ہے؟ اس راہ کا فریب خوردہ ایک میں ہی نہیں تھا۔ میری طرح لاکھوں افراد شیطان کے مکر کا شکار ہوتے ہوں گے۔

صد حیف! کہ اس راہ کے فریب سے بچنا کتنا مشکل ہے؟ تسبیح و مصلی، تقدیس و تہلیل اور ریاضت و عبادت کے چمکدار سکون پر کون نہیں ریجھ جائے گا؟

پروردگار! تو ہی اپنے محبوب ﷺ کی بھولی بھالی امت کو وقت کے فریب کاروں سے بچانا۔